# ضیاء محی الدین

زین

# ضیاء محی الدین

# ضیاء محی الدین

زین

پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، لاہور
۲۰ ایل ڈی اے ٹاؤن ہاؤسز، نیو مسلم ٹاؤن لاہور

بار ____ اوّل

تعداد ____ ایک ہزار

اشاعت ____ جنوری سنہ ۱۹۸۹ء

ناشرین ____ محمد اسلم، سلامت بیگم

طبع

سچا، سیدھا اور سادہ

کہی ان کہی باتوں کا مجموعہ

ضیاء محی الدین

بین الاقوامی شہرت کے حامل پاکستانی اداکار

ضیاء محی الدین

کی زندگی اور فن پر

ایک آفاق گستا کتاب!

اُس شخص کے نام

جس نے مجھ ناچیز کو اس کتاب لکھنے پر اکسایا

# حرفِ اوّل

لندن ۹ ستمبر

سوال۔ یہ کیا شوشہ اُٹھایا؟

ہم کہاں کے دانا تھے...! کتابیں ان رنگوں کے بارے میں
لکھی اور سوچی جاتی ہیں جو اپنے عہد میں، اپنے پیشے میں یکتا
ہیں یا پھر جن کی سوچ میں اس قدر اُپج اور تیکھا پن
ہے، وہ مسلمہ رنگوں کو ٹھکرا دیں۔ میں نے جو کچھ اب تک
کیا اس میں ایک کوتاہی یہ رہی کہ ہمیشہ "مذاق" اچھے
مذاق کو اپنے سامنے رکھا۔ کوتاہی اس لیے کہتا ہوں
کہ یہ چیز اپنے دور زمانے سے آگے بڑھ جانے میں مانع ہوتی
ہے۔ چھلانگیں لگانے میں کتنے شوروں کے اوپر سے ڈھلکنا
پھدکنا پڑتا ہے اور زندگی کی دُم کا جائزہ رکھنا پڑتا ہے۔ اس قدر
آگہی کا وقت نہیں ہوتا کہ کس کس کو روندنا پڑے گا ورنہ
پُرجوش تمنا نہیں ہوتی (یہ غالب کی وہ تمنا ہے جس کے دوسرے
قدم کی خبر اُسے نہیں)۔ میں نے کبھی کبھی یہ ضرور سوچا کہ
آورش کی راہ میں حسیات کو دخل نہیں ہونا چاہیے لیکن

اب کرنے میں 'بد مذاقی' کا تصور آڑے آتا رہا۔ اگلے وقتوں کے
لوگوں کی زبان میں اسے شرافت کہا جاتا تھا۔

اگلے وقتوں کے لوگوں کا ذکر آیا تو یہ کہتا چلوں کہ میری زندگی
میں غیر شعوری طور پر ان لوگوں کا بہت اثر ہے۔ وطنِ عزیز میں تو
غیر مذہب زدہ اور مذہب پرست سمجھا جاتا ہوں۔

میری اٹھان ایک ایسے ماحول میں ہوئی جس میں حافظ محمود
شیرانی، ڈاکٹر اقبال (اورینٹل کالج والے، داور رہبر کے والد)
خضر تمیمی اور خود میرے اپنے والد دھیمے سروں میں گفتگو کرتے تھے
ان میں ریا رام صاحب (لاہور شہر کی باغ و بہار شخصیت، موسیقی
کے رسیا اور مربی) بھی تھے اور اُستاد [illegible]
لڑکپن میں مجھے ان لوگوں کی نشستیں انتہائی بیزار کن لگتی تھیں لیکن
عجیب بات یہ ہے کہ میں نے سب سے زیادہ اثر انہی محفلوں سے لیا۔ ان
کے آداب کے بارے میں آج سوچتا ہوں تو جی چاہتا ہے ہم لوگوں کو بتاؤں
کہ یہ لوگ شائستگی کی باتیں نہیں کرتے تھے خود شائستگی
تھے۔

اب نہ وہ ادوار باقی نہ زمانہ۔ اس کا دین کوئی مانتا نہیں اور دنیا
کو دوسرے بہت سے جھمیلوں سے فرصت نہیں، شاید اور

پر اس دنیا کو جسے پاکستان کہتے ہیں۔ برسوں میں اپنے والد پہ کتاب لکھنے کا منصوبہ باندھتا رہا۔ آخر یہی خیال آیا کہ خود چھپوانے کے بعد وہاں جیسی معتقدوں میں بانٹنے سے زیادہ اس کتاب کی مانگ نہ ہوگی۔ پھر اس میں ذاتی سستی اور فرصت کی کمی کو بھی دخل تھا کیونکہ دریا میں ڈالنے کو آج تک کون کس کو روک سکا ہے!

میری طرف سے آپکو اجازت ہے۔ مگر اس میں "جنون" سنوارنے کی راہ" نکلتی نظر نہیں آتی۔

خدا کرے تم لوگ جلد سے جلد لاہور جا کر آباد ہو۔ آپ کے ذہن کو جس عافیت کی تلاش ہے وہ مجھے کراچی کے شہر میں نظر نہیں آتی۔

آپ کے محبت نامہ سے ناہید بیگم کی زندگی میں بہت قرار آتا ہے۔
جوجو اور راجو کو بہت پیار

آپکا
[illegible]

# حرفِ دُعا

ضیاءمحی الدین کے بارے میں سوچ کر، اُن سے مل کر، ایک ایسی ٹھنڈک کا احساس جاگتا ہے جو شاید میں ایک مثال سے واضح کر سکوں۔

میرے اباجی، اب خبر نہیں کہ ہم انہیں اباجی پکارتے تھے۔ یا ابو جی کیونکہ انہیں ہم سے جدا ہوئے تیرہ برس ہو گئے ہیں اور آپ جانتے ہیں ہم تو دوسرے دن تمام بھول جانے کے عادی ہیں۔ یہ تو تیرہ برس کا مسئلہ ہے۔ تو۔ اباجی یعنی میرے اباجی ٹیلرنگ کا کام کرتے تھے۔ اور ان کا یہ اڈہ یعنی ٹیلرنگ کی دکان مال روڈ پر ہوا کرتی تھی۔ اس کے دو دروازے تھے۔ صدر دروازہ مال روڈ کی طرف کافی ہاؤس کے پہلو میں کھلتا تھا۔ جب کہ ایک دروازہ پشت کی طرف ایک تنگ و تاریک گلی میں کھلتا تھا۔ جسے دیکھ کر منٹو کا موتری یاد آتا تھا۔ اس دروازے کے ساتھ دائیں جانب کوئی دو انچ چوڑا لوہے کا پائپ بلڈنگ کے اوپر لگی ہوئی ٹینکی میں جاتا تھا۔ جب کہ موٹر اسی بلڈنگ کے تہہ خانے میں ہوا کرتی تھی۔ یہ موٹر یا تو علی الصبح چلتی تھی۔ پھر دوسرے وقت شام ۵ بجے کے قریب چلائی جاتی تھی۔ تو جب یہ موٹر چلتی اور یہ زمین کی تہہ سے پانی اوپر ٹینکی میں پھینکتی تو سارا پائپ ٹھنڈا ہو جایا کرتا تھا۔ اور میں اس کے ساتھ اپنا گال لگا دیتا تھا۔ جیسے ایک نامعلوم سی ٹھنڈک چھو کر گزرتی رہتی تھی۔۔۔۔ اس پائپ کی ٹھنڈک کا سوچ کر آج بھی سارے بدن میں ٹھنڈک سی محسوس ہوتی ہے لیکن یہ ٹھنڈک صرف جسم تک محدود ہے۔ ضیاءمحی الدین کے متعلق سوچتا ہوں یا ملتا ہوں تو یہ ٹھنڈک روح تک سرایت کر جاتی ہے۔ سو یہ محرک ہے اس عظیم شخصیت کے بارے میں اس چھوٹی سی کتاب لکھنے کا۔

کتاب پڑھنے کے بعد آپ کے ذہن میں بہت سے سوالات اٹھیں گے ۔ میرا خیال ہے کہ ایسا ہونا چاہیئے کیونکہ بقول اطالوی ڈرامہ نگار "انسان خوشی میں خاموش رہتا ہے اور دکھ میں سوال اٹھاتا ہے ۔ مگر سوال اٹھتے رہنے چاہئیں کہ اس سے انسانی ارتقاء کا عمل جاری رہتا ہے "

—— زین

مُحتسب کی خیر!

طاہر سلیم گورا کا

احسان مند ہوں کہ جس کی بے پناہ

محبت اور کاوش کی طفیل

یہ کتاب

آپ کے ہاتھوں میں ہے!

کون ایسا غنی ہے جس سے کوئی
نقدِ شمس و قمر کی بات کرے
جس کو شوق نبرد ہو ہم سے
جائے تسخیرِ کائنات کرے

(اقتباس دست تہ سنگ)

# ترتیب

صبح کے آغاز کا رنگ

# ضیاء محیُ الدّین

"وہ آیا اس نے دیکھا اور فتح کرلیا"
سیزر کے متعلق شیکسپیر کے کہے ہوئے یہ الفاظ مجھے تو کچھ ایسا احساس دلاتے ہیں کہ شاید ضیاء محی الدین ہی کے لئے ہیں ۔ کسے خبر تھی کہ پروفیسر خادم محی الدین کے گھر میں پیدا ہونے والا یہ بچہ فن کی دنیا کی بھی ضیاء ہوگا اور شو بزنس کی دنیا میں ایک ایسی روایت قائم کردے گا کہ آنے والے فنکار ان روایات پر عمل کرنا اپنے لئے باعث فخر خیال کریں گے، سونا آگ ہی میں تپ کر کندن بنتا ہے ضیاء محی الدین بھی ایک مدت تک فن کے تپتے صحرا کی کڑی دھوپ میں برہنہ پا سفر کرتے رہے ہیں اور اس طرح انہوں نے اپنے وجود کی رفعتوں سے کمال فن کے دریچے وا کئے ہیں ۔

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمُود

اداکار، دوسرے کی کہانی کو اپنی کہانی بنا کر پیش کرنے والا، دوسرے کے رنگوں میں رنگے جانے والا، کیا اس کی بھی کوئی اپنی کہانی ہے کیا اس کا بھی

کام کیے ہیں۔ مقصد نظمیں پیش کرنا ہے۔ لیکن یا انسانی جیتے
جاگتے کرداروں یا PHOTOGRAPHIC SILHOUETTES کے
ذریعے بیک گراؤنڈ کے کردار دیئے جا سکتے ہیں ان تمام
نظموں میں اصلی کردار "حسن کوزہ گر" ہے جس کے اندر عشق
اور تخلیق فن کی کشمکش ہے"

(ن م۔ راشد کا خط ضیاء محی الدین کے نام)

9LS01UX

۱۰ اگست ۱۹۷۵ء

عزیز ضیا۔ بہت دن ہوئے تمہارا خط ملا تھا۔ تب بدل گیا ہوں۔
میں نومبر میں پاکستان آنے کا پروگرام بنا رہا ہوں۔ تم شروع یا
وسط نومبر میں کہاں ہو گے؟ اگر کراچی یا لاہور میں ہو گے تو
ملاقات ہو سکے گی۔ میں کراچی میں دو چار دن سے زیادہ نہیں
رکوں گا۔ لاہور میں شاید ہفتہ بھر یا زیادہ ٹھہرنا پڑے گا۔ میرا
چوتھا مجموعہ "گمان کا ممکن" اس وقت زیر طباعت
ہو گا۔ اسکی وجہ سے رکنا ضروری ہے۔ "آئینہ ادب" لاہور
شائع کر رہا ہے۔

سنو، تم نے میری نظم "حسن کوزہ گر" پڑھی ہے؟ میں نے
اس کے دو تین اور sequence لکھے ہیں۔ سوچ
رہا تھا تم سے پوچھوں ان کا ٹیلی ویژن فلم بن سکتا
ہے یا نہیں۔ ان نظموں میں وہ visual images
(مثلاً تصویر؟) ہیں۔ جو ٹیلی ویژن کے کام (آ)

"گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم حاصل کرنے کا اتفاق ہوا بی اے تک تعلیم حاصل کی۔ ایم اے کر رہا تھا کہ چھوڑ دیا اور ریڈیو سے منسلک ہو گیا اس کی داستان کچھ یوں ہے کہ جب میں بی اے میں تھا تو محض ایک ایڈونچر کے طور پر ایک ایسی جگہ گیا جہاں اس زمانے میں صرف امیر لوگ ہی جا سکتے تھے۔ یعنی مری، مری میں میری ملاقات ن۔م۔ راشد سے ہوئی جو اس وقت آزاد کشمیر ریڈیو سے منسلک تھے۔ شاید میں ان کو اس طرح کا ذہین لڑکا نظر آیا جیسے کہ بی اے کے بہت سے طالب علم ہوتے ہیں انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم براڈکاسٹنگ کر سکتے ہو۔ میں نے کہا 'ہاں' حالانکہ میں بالکل واقف نہیں تھا لیکن اس عمر میں اکثر ایسا لگتا ہے کہ کوئی چیز بھی آدمی کے قابو سے باہر نہیں۔"

(کہانی میری ضیاء محی الدین، رسالہ آہنگ)

اور آج بھی ضیاء محی الدین کے قابو سے کوئی چیز باہر نہیں ہے۔ انہوں نے جس چیز کو بھی چاہا خواہ وہ تھیئٹر ہو، ٹیلی ویژن یا فلم اسے اپنا بنا ہی لیا ہے اور شو بزنس کا مقصد بھی یہی ہوا کرتا ہے کہ سب کی توجہ حاصل کی جائے اور اس دوران لوگ وہیں سوچیں۔ جو آپ انہیں دکھا رہے ہیں۔

"دوسرا اعتراض میرے لباس پہ ہوتا تھا۔ کہ یہ جھالروں والے اور پھولوں والے کپڑے پہنتا ہے جو سوقیانہ پن ہے لیکن میری رائے میں شو بزنس کے لئے خوش پوشی بے حد ضروری ہے اور میں اپنے ملبوسات پر واقعی محنت کرتا ہوں اور بعض دفعہ تو محض لوگوں کو SHOCK کرنے کے لئے۔ لوگوں نے مذاق بھی اڑایا

میں اس کا برا نہیں مانتا ویسے بھی میں کرتا پاجامہ اور سر پر کی
ٹوپی پہن کر نہیں آنا چاہتا کیونکہ میرے خیال میں یہ ریاکاری ہوتی
ہے۔ جب میں عام زندگی میں پتلون قمیض پہنتا ہوں تو وہاں
کیوں نہ پہنتا ہاں مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں نے یقیناً ملبوسات
میں جدت طرازی کی ہے۔"

(انٹرویو شمیم عالم روزنامہ مساوات کراچی)

"بچپن کی کچھ باتیں ایسی بھی ہیں جنہوں نے شاید میری آئندہ زندگی پر اثر ڈالا۔ مثلاً میرے ایک استاد حساب کے سوال کرتے تھے۔ وہ بہت پٹائی کیا کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے یہ سمجھ لیا کہ میں حساب میں کبھی چل نہ پاؤں گا۔ اور پھر کوشش بھی نہیں کی کہ کچھ رٹ رٹا کے ہی کروں۔ بس سیدھے سیدھے امتحان کی کاپی میں لکھ دیتا کہ مجھے ایک بھی سوال سمجھ میں نہیں آیا۔ اور ایک بہت ہی بڑا گول صفر مجھے مل جایا کرتا میرے والد نے بھی جو خود ایک استاد اور مشہور پروفیسر تھے۔ کبھی کچھ زیادہ زور نہیں دیا۔" اس سلسلے میں ہاں جب میٹرک کے امتحان کا مرحلہ آیا تو انھوں نے ایک ٹیوٹر رکھ دیا جس نے مجھے حساب، الجبرا اور جیومیٹری کی کچھ چیزیں رٹا دیں اتفاق دیکھئے کہ امتحان میں یہی چیزیں آگئیں اور اتنی اچھی طرح میٹرک پاس کیا کہ وظیفہ مل گیا۔"

(کہانی میری۔ ضیا محی الدین رسالہ آہنگ)

" ویسے مار تو مجھے ایک اور چیز کے لئے بھی پڑی، میرے والد نے مجھے خوش خطی سیکھنے کے لئے مرزا ہادی حسن صاحب کے پاس بھیجا۔ روزانہ اسکول کے بعد ایک گھنٹہ ان کے پاس بیٹھنا پڑتا۔ اور کبھی ج اور خ کے دائرے ٹھیک نہ بنتے تو بڑی پٹائی ہوتی۔ عجیب بات یہ ہے کہ مار نے مجھے حساب

سے تو متنفر کر دیا۔ لیکن خوش خطی سے نفرت نہیں ہوئی ۔"
(میری کہانی، ضیاء محی الدین رسالہ قند ڈرامہ نمبر ۲)

"اسکولوں میں اس زمانے میں ڈرامہ تو کم کھیلا جاتا تھا لیکن تقریر کرنے کے مقابلے اکثر ہوا کرتے تھے ۔ یہ تقریر بازی بھی ایک طرح سے ڈرامہ ہی ہوتی تھی کیونکہ دس گیارہ سال کا لڑکا کیا لکھے گا کوئی لکھ دیتا ہو گا جسے وہ رٹ لیتے ہوں گے۔ اصل چیز اس قسم کے مقابلے میں ادائیگی ہوتی تھی تو مجھے بھی تقریر بازی کا شوق ہو گیا۔

میرے والد ڈرامہ کے ہدایت کار ہونے کے ساتھ ساتھ ڈرامے بھی لکھا کرتے تھے ۔ اور پھر اپنے کالج میں خود ہی ڈائرکٹ کر کے پیش بھی کیا کرتے تھے ۔ معلوم نہیں انہیں یہ خیال کیوں آیا کہ مجھے بھی ڈراموں میں حصہ لینا چاہیئے۔ چنانچہ جب میں بہت چھوٹا تھا تو اکثر اپنے ڈراموں میں ایک آدھ چھوٹا سا پارٹ میرے لئے لکھ دیتے تھے ۔ جنہیں میں ادا کیا کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے ایک ڈرامہ میں میں نے یونانی دیوتا کا چھوٹا سا رول کیا تھا ۔ اس وقت میری عمر کوئی دس گیارہ سال کی تھی۔ یوں ابتدائی عمر میں ہی سے تھیٹر سے میرا رشتہ پیدا ہو گیا۔

(میری کہانی ضیاء محی الدین رسالہ قند ڈرامہ نمبر ۲)

"چپ کی داد" کا ڈرامہ کیا اور میری ڈائرکشن میں کیا۔ پرنسپل کے شوق کو پورا کرتا تھا۔ ایسا ہی "گھر کا بھیدی" ایک بوگس ڈرامہ تھا۔ میں خود ڈرامہ بازی کے قواعد سے نا آشنا۔ بعد میں کچھ

سمجھ بوجھ پیدا ہوئی جب کہ ٹریننگ کالج لاہور میں تم نے دو ڈراموں "علاج" اور "کل" میں پارٹ کیا تھا۔"

(خادم محی الدین کا خط ضیاء محی الدین کے نام)

۲۸ اگست ۱۹۶۲ء

"گورنمنٹ کالج لاہور میں ڈرامہ کی ایک خاص قسم کی روایت تھی دراصل یہاں ڈرامے انگریزی میں ہوتے تھے۔ میں اردو مباحثہ (DEBATE) میں نمایاں ہو چکا تھا۔ کالج میں آنے کے بعد میں نے بہت کوشش کی کہ وہاں جو ڈرامے ہوتے ہیں ان میں حصہ ملے۔ اس سلسلہ میں پروفیسر حمید الدین صاحب صدر ڈرامیٹک کلب سے بھی ملا۔ لیکن مجھے اس قابل نہیں سمجھا گیا۔ یہ بھی عجیب ستم ظریفی ہے کہ آج ان لوگوں کا دور سے بھی ڈرامے سے کوئی تعلق نہیں ہے جو کالج کے زمانے میں مایہ ناز ایکٹر سمجھے جاتے تھے۔"

(کہانی میری۔ ضیاء محی الدین رسالہ آہنگ ۷۹ء)

"عام طور پر بیٹے اپنے باپ کا پیشہ ہی اختیار کرتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ڈاکٹر کا بیٹا ڈاکٹر اور وکیل کا بیٹا وکیل ہی بنتا ہے۔ میرا بھی جی چاہتا تھا کہ اپنے والد کی طرح پروفیسر بنوں۔ لیکن اب میں سمجھتا ہوں۔ کہ اس خواہش کے پیچھے بھی وہ آرزو تھی جو مجھے ڈراموں میں لائی یعنی بھیس بدلنے کی خواہش، میں دیکھتا تھا کہ پروفیسر حضرات نہایت عمدہ سیاہ گاؤن پہن کر آتے۔ پائپ ان کے منہ میں لگا ہوتا اور آنکھوں پر چشمہ۔ یہ لوگ مجھے اس زمین کے باسی نہیں لگتے تھے۔ تو میرا بھی دل چاہتا تھا کہ ان کی طرح گاؤن پہن کر اور پائپ لگا کر

پانچ سات کتابیں ہاتھ میں لئے سج سج کر اور ناپ تول کر قدم رکھتے ہوئے کلاس میں آؤں۔"

(میری کہانی۔ ضیاء محی الدین رسالہ قند ڈرامہ نمبر ۲)

"ایک اور چیز جس نے مجھے ڈرامے کی دُنیا میں آتے میں مدد دی وہ تھا میرا شرمیلا پن۔ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ میں بہت شرمیلا ہوں۔ مجھے بات کرنے میں بڑی ہچکچاہٹ ہوتی ہے۔ میں پاکستان کی بات نہیں کر رہا کیونکہ یہاں تو اس کا بالکل الٹ ہے۔ لیکن مغرب میں ننانوے فیصد اداکار ایسے لوگ ہوتے ہیں جو بنیادی طور پر بڑے شرمیلے ہوتے ہیں جو بات کا اظہار اس وقت نہیں کر پاتے جب تک انہیں اسٹیج کاسٹیوم اور دیگر لوازمات نہ ملیں۔ وہاں کہا جاتا ہے کہ YOU NEED A THEATRE TO EXPRESS YOURSELF

پھر مجھے اس بات کا بھی احساس تھا کہ اور جو تخلیقی کام کرتا ہوں مثلاً افسانے لکھنا، (مجھے لکھنے کا بھی بہت شوق تھا) ان کے نتائج سے میں خود بہت غیر مطمئن رہتا۔ لیکن ڈرامے کے سلسلے میں مجھے اپنے آپ سے اتنی زیادہ مایوسی نہیں ہوتی تھی۔"

(کہانی میری ضیاء محی الدین رسالہ آہنگ ۷۶ء)

"میں جب کبھی اپنی زندگی پر نظر دوڑاتا ہوں تو مجھے سب سے زیادہ افسوس اپنی تعلیم کی کمی پر ہوتا ہے۔ بچپن میں اگر دلجمعی سے اپنی زبان پڑھی ہوتی تو آج محرومی کا اتنا شدید احساس نہ ہوتا۔ فارسی میں رفت رفتند رفتم رفتیم تک ہی معاملہ رہا۔ عربی میں کبھی ام ابزو سے آگے نہ بڑھ پایا۔ انگریزی سیکھی اور اپنے حساب سے خوب

چکھی لیکن کسی انتظام کے تحت نہیں۔ بس کبھی ادب کبھی نظم، کبھی جاسوسی کہانی کبھی کھیل تمثیل۔ تہ بہ تہ بیٹھتی رہی لیکن ایسی نہیں جیسے کسی اچھی جلد کی ہوئی کتاب کے ورقوں پہ ہوتی ہے"

(ضیاء محی الدین کا خط داؤد رہبر کے نام)

"مری سے جب لاہور لوٹا تو میں نے ریڈیو کی طرف رجوع کیا۔ ان دنوں لاہور ریڈیو سے ایک پروگرام ہوا کرتا تھا" پاکستان ہمارا ہے" جس میں رفیع پیر اور شوکت تھانوی بھی لکھا کرتے تھے وہاں پر اور بھی بہت سے لوگوں سے واقفیت ہوئی۔ اعجاز بٹالوی، ضیاء جالندھری اور ظہور آذر۔ یہ بالکل نوجوان لوگ تھے جو پروگرام اسسٹنٹ ہوا کرتے تھے اور جو جغادری لوگ تھے ان میں رشید صاحب، بخاری صاحب اور نظامی صاحب تھے۔

وہاں کا ماحول علمی و ادبی تھا۔ میں ان لوگوں کی باتیں سنتا کہ ہکسلے کی کتاب یوں ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ نے اس طرح لکھا ہے۔ مجھے یہ زندگی بڑی بھرپور سی نظر آئی اس سے دو باتیں ہوئیں جو میں سمجھتا ہوں غلط ہوئیں میرے لئے، ایک تو مجھے جو دوسرے شوق تھے۔ مثلاً ٹیبل ٹینس یا کرکٹ کھیلنے کا، وہ مجھے بکواس لگنے لگے۔ دوسرے یہ عجیب شوق سا پیدا ہوا کہ کافی ہاؤس میں بیٹھ کر خواہ مخواہ کی بحثوں میں حصہ لوں اور ان لوگوں کی باتوں کو سنتا رہوں جو باکمال (CONVERSATIONALIST) سمجھے جاتے تھے۔

اس چیز کو غلط میں اس لئے کہتا ہوں کہ اس کا نتیجہ

یہ ہوا کہ کم از کم سال ڈیڑھ سال تک میں نے کتابیں بالکل
نہیں پڑھیں اور اپنی باتوں میں یہ ظاہر کرتا رہا کہ گویا بہت
کچھ پڑھا ہے یہ بعد کی بات ہے کہ مجھے یہ احساس ہوا کہ میں
بالکل خالی ہوں اور محض ایک SMART COMMENT
کر دینا کوئی چیز نہیں ہوتی ۔"

(کہانی میری ۔ ضیاء محی الدین رسالہ آہنگ ۸۵ء)

تعلیم کی کمی کا احساس رکھنے والے ضیاء محی الدین نے میٹرک ٹھیک
چودہ برس کی عمر میں ۱۹۴۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے فرسٹ ڈویژن میں
پاس کیا۔ ایف اے ۱۹۴۷ء میں فرسٹ ڈویژن ہی میں، بی اے ۱۹۴۹ء
میں ساتھ ہی سائیکلوجی میں HONOUR بھی کالج کی اہم نصابی سرگرمیوں
مثلاً DEBATE، تیراکی وغیرہ میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بے شمار انعامات
بھی حاصل کئے اور کالج کا سب سے بڑا AWARD "کالج رول
آف آنر" بھی حاصل کیا۔

## ن م ۔ راشد کا انتخاب انہیں ریڈیو میں لے آیا

" وہاں میری آواز کا امتحان لیا گیا، مجھے یاد ہے کہ آواز
جانچنے والوں میں سے کسی صاحب نے یہ کہا کہ اس کی آواز کلچرڈ
( CULTURED ) ہے، مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی،
مری اٹھک بیٹھک ایسے ماحول میں ہوئی جن میں حافظ محمود
شیرانی، ڈاکٹر اقبال داور نٹیل کالج والے داؤد رہبر کے والد،
خضر تمیمی اور خود میرے والد جیسے سروں میں گفتگو کرتے

GOVERNMENT COLLEGE, LAHORE.

(S E A L)

ROLL OF HONOUR

This is to Certify that the name of Zea Mohy-ud-Din was inscribed in the Academic Roll of Honour, Government College, Lahore, in the year 1948.

Sd/- A.S. Bukhari,

Principal,
Government College, Lahore.

تھے ان میں رلیارام صاحب ( لاہور شہر کی باغ و بہار شخصیت موسیقی کے رسیا اور مربی ) بھی تھے اور استاد جھنڈے خاں بھی۔ بچپن اور پھر لڑکپن میں مجھے ان لوگوں کی نشستیں انتہائی بیزار کن لگتی تھیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ میں نے سب سے زیادہ اثر انہی محفلوں سے لیا۔ ان کے آداب کے بارے میں اب سوچتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ لوگوں کو بتاؤں کہ یہ لوگ ثقافت کی باتیں نہیں کرتے تھے۔ بلکہ خود ثقافت تھے، ان میں محمود نظامی تھے، ان کا ایمان تھا کہ دوستوں کی دل آزاری کبھی مت کرو، مسٹر عبدالقادر تھے، میں نے جب پہلی بار انہیں تقریر کرتے سنا تو ایسا لگا۔ کہ موتی جھڑ رہے ہیں میری عمر اس وقت چھ برس کی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک عجیب چیز میرے دل پر نقش ہوئی۔ کہ لب و لہجہ کس قدر خوبصورت چیز ہے۔ میرے والد محترم خادم محی الدین نے مجھے شدھ سنگیت کی پہچان کرائی۔ اسٹیج سے مجھے انہی نے روشناس کیا، بخاری برادرز، بڑے بخاری نے اچھے ادب کی طرف اشارہ کیا، کچھ راہ بھی دکھائی۔ چھوٹے بخاری صاحب نے آواز کے اتار چڑھاؤ، مائیکروفون کے آداب سکھلائے۔ ای ایم فارسٹر علم و فضل کا خزانہ تھے۔ انگریزی ادب میں ان کا مقام ایسا جو ایک صدی میں دو ایک لوگوں کو ملتا ہے دوسروں کی بات ایسے سنتے تھے جیسے ان سے کچھ سیکھ رہے ہوں داؤد رہبر، میں نے ابھی تک کوئی ایسی قرونِ وسطیٰ کی شخصیت نہیں

سے رکھا ہے کہ کسی وقت REVISE کر کے دوبارہ چھپوا سکوں"
(خادم محی الدین کا خط ضیا محی الدین کے نام)
۳۰ر جون ۱۹۶۲ء

"تیرھویں چودھویں جماعت میں پڑھتا تھا تو اوسط درجے کے ذہین لڑکوں کی طرح میں نے بھی اس بغاوت سے گزرنا شروع کیا جو گھریلو ماحول' باپ، اردگرد کی فضا مگر خاص طور پر باپ کے خلاف ہوتی ہے۔ اس کی بھنک میرے والد کو پڑی۔ ان کو مجھ سے والہانہ لگاؤ تھا۔ اس لئے سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی (وہ صاحب ذوق بھی تھے۔) ان سے نہ رہا گیا۔ خود گفتگو کرنا تو انہوں نے مناسب نہ سمجھا میرے استاد سراج الدین صاحب سے کہا کہ وہ مجھے سمجھائیں۔ سراج الدین صاحب جہاں دیدہ آدمی تھے۔ اور انسانی علوم کے پروردہ تھے۔ ایک دن انہوں نے مجھے گھر بلایا کچھ کام وام کی بات کرنے کے بعد اپنی کوٹھی کے پھاٹک تک میرے ساتھ چلے اور عین رخصت کے وقت جیسے ایک دم سے کوئی بات یاد آگئی ہو کہنے لگے۔ ادبی وہ اپنی گفتگو میں ادبی کا استعمال بڑی فراخدلی سے کرتے تھے) ایک چھوٹی سی بات کہنی ہے

"WHAT PARENTS DO FOR CHILDREN IS NATURE BUT WHAT CHILDREN DO FOR PARENTS IS CULTURE".

(ضیاء محی الدین کا خط شوکت زین العابدین کے نام)

"ریڈیو میں پہلے تو میں فیچر پروگراموں میں حصہ لیتا رہا۔ بعد میں جب کچھ ملاقاتیں بڑھیں مراسم بڑھے تو ایک ادھ چھوٹا پارٹ ڈرامے میں مل جاتا تھا۔ اس کے بعد ریڈیو پاکستان کے خبروں کے شعبے سے وابستہ ہو گیا۔ یہ جو نوکری مجھے ملی وہ اس زمانے میں خاصی بڑی سمجھی جاتی تھی۔ اس لئے کہ اس وقت ایک یہ چیز ہوتی تھی گزٹیڈ افسر تو ریڈیو والوں نے ہمیں "گزٹیڈ" کر دیا تھا۔"

(میری کہانی ضیا محی الدین رسالہ قند ڈرامہ نمبر ۲)

"میں اور میرے دوست ابن انشاء دونوں ریڈیو کے خبروں کے شعبے میں ملازم تھے۔ میں ایسی خبریں لکھا یا ترتیب دیا کرتا تھا جن کا وہ ترجمہ کیا کرتے تھے۔ ان کی حوصلہ افزائی کے نتیجے میں میں نے کئی ایک افسانے لکھے جو افکار، ادب لطیف، نقوش وغیرہ میں چھپے۔

میں نے ڈرامے لکھنے کی کئی دفعہ کوشش کی۔ لیکن شاید مجھ میں وہ صلاحیت نہ تھی جو مجھے بڑا لکھنے والا بنا سکے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے لئے لکھنا بہت مشکل ہے شاید میں اپنے اندر وہ نظم و ضبط اور وہ ٹھیراؤ نہیں پیدا کر سکا جو ایک بلند پایہ چیز لکھنے کے لئے ضروری ہے۔"

(کہانی میری ضیا محی الدین رسالہ آہنگ)

آپ نے ضیاء محی الدین، میرے بھائی کے متعلق چند بچپن کے واقعات حالات اور عادات کے بارے میں استفسار کیا ہے۔ اور یقین جانئیں آپ نے مجھے مشکل میں ڈال دیا ہے۔ وہ اس لئے کہ جب بچپن کو گذرے ہوئے ایک زمانہ ہو جاتا ہے تو بہت سی باتیں فراموش ہو جاتی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان پر ماضی کی گرد کی دبیز تہہ جم جاتی ہے۔ مگر آپ کا حکم سر آنکھوں پر، میں اپنی یادداشت کے دفینے سے ضیاء کے بارے میں کچھ بتانے کی کوشش کروں گی۔

ضیاء بھائی کی پیدائش سے پہلے ہمارے تین بھائی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ اور ہم پانچ بہنوں کی ولادت کے بعد یقیناً ہمارے والدین کی شدید خواہش تھی۔ کہ خدا تعالیٰ انہیں اولاد نرینہ کی نعمت عطا فرمائے۔ مجھے یاد ہے کہ میں چھٹی جماعت کی طالبہ تھی۔ ضیاء کی پیدائش کا وقت قریب تھا۔ ہمارے گھر میں میری نانی اماں اور پھوپھی جان چند روز پیشتر ہی قصور سے لائل پور (حال فیصل آباد) آ گئی تھیں اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سب کو شاید اس بات کی توقع ہے کہ اس مرتبہ خدائے ذوالجلال کی برکت سے ضرور ہمارے ہاں ایک بھائی پیدا ہوگا۔ آخر وہ دن بھی آ گیا'' اس روز میرے سکول میں سالانہ ٹورنامنٹ تھیں۔ اور اباجی قبلہ (شیخ خادم محی الدین) بڑی آپا حمیدہ سے یہ کہہ کر کالج روانہ ہوئے تھے، کہ آج تم لڑکیوں میں سے کوئی سکول نہیں جائے گی۔ گھر پر رہ کر کام کاج میں ہاتھ بٹانا ہوگا۔ مگر میں یہ حکم سن کر رونے لگی کیونکہ سکول کی سالانہ کھیلوں میں بہت سے EVENTS میں حصہ لے رکھا

تھا۔ اور روزانہ مشق کرتے ہوئے میری استانی نے مجھے یقین دلایا تھا کہ کم از کم چار EVENTS میں تمہارے اوّل آنے کی پوری امید ہے۔
جب آپا جی کالج چلے گئے۔ تو میں نے چپکے چپکے کمرے میں چھپ کر سکول جانے کی تیاری کی، آپا حمیدہ باہر کام میں مصروف تھیں۔ میں اس قدر جلدی میں تھی کہ قمیض تو صاف پہن لی۔ مگر شلوار تبدیل کرنا ہی بھول گئی۔ اتنے میں یہ خبر ملی کہ ہمارے ہاں بھائی پیدا ہوا ہے۔ میں یہ خبر سُن کر خوشی سے گھر کے پچھواڑے والے دروازے سے سکول کی طرف بھاگ گئی۔ تمام لڑکیاں میری طرف دیکھ کر ہنس پڑیں، میں نے سبب پوچھا تو بولیں کہ قمیض تو صاف ہے مگر شلوار اتنی میلی! آج تمہارے ہوش کہاں تھے۔؟ میں نے جواب میں کہا۔ "آج ہمارے ہاں بھائی پیدا ہوا ہے.....!" اور میری ہم جماعت نے زوردار قہقہہ لگایا "اسی لئے تمہیں کسی نے پہننے کے لئے صاف شلوار نہیں دی"
جب میں سکول سے واپس آئی تو گھر میں شادی کا سا سماں تھا، ابّا جی قبلہ کے دوست اور سب عزیز و اقارب مبارک باد دینے کے لئے جمع تھے، اور اس خوشی کے ہنگامے میں کسی کو یاد نہ تھا، کہ میں نے ابا جی کی حکم عدولی کی تھی۔ مگر میں چار EVENTS میں جو انعامات حاصل کر کے لائی تھی۔ انہیں دکھانے کے لئے بیتاب تھی۔ آخر جب ذرا آنے والوں کی بھیڑ کم ہوئی تو میں اپنے انعامات اٹھا کر ابا جی کے پاس لے گئی۔ وہ پہلے تو حیران ہوئے۔ جب میں نے بتایا۔ تو وہ نہایت شفقت سے بولے۔ "آخر، تم باز نہیں آئیں" اور ان کے چہرے پر ضیاء کی ولادت کی ایک عجیب طمانیت اور بے مثال روحانی سکون سا تھا۔
ضیاء کی پرورش اور اس کی دیکھ بھال میں زیادہ تر بڑی آپا کا ہاتھ تھا

اماں تو گھر کے کام کاج میں شب و روز مصروف رہتیں۔ ضیاء کو نہلانا، کپڑے پہنانا اور پھر اُسے سجا سنوار کر اس کی پریم میں بیٹھانا یہ سب فرائض انہوں نے سنبھال رکھے تھے۔ اور ہم بہنیں ایک دوسرے کے ساتھ لڑائی کرتیں کہ ہم اسے باہر سیر کے لیئے لے جائیں گی۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ گرمیوں کے دن تھے۔ اور اُن دنوں لائل پور میں آندھیاں بہت آتی تھیں۔ اور بالعموم ان میں اس قدر شدت ہوا کرتی تھی کہ تمام آسمان گرد و غبار سے پہلے سرخ اور پھر مکمل طور پر سیاہ ہو جاتا تھا۔ ضیاء کو آپا حمیدہ نے آندھی آنے سے پیشتر ایک چھوٹے ٹب میں پانی ڈال کر بیٹھا دیا۔ اس وقت ضیاء کی عمر ایک سال سے کچھ کم تھی۔ وہ پانی کے ٹب میں بیٹھا پانی سے کھیل رہا تھا۔ اچانک آندھی شروع ہوئی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام فضا ایک گہری سیاہ چادر میں لپٹ گئی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے رہا تھا۔ ہم سب جلدی سے اندر کمروں میں جا چھپے۔ کسی کو یہ خیال نہ رہا۔ کہ ضیاء کہاں ہے، جب آندھی کا زور کم ہوا اور اندھیرا چھٹا، ہم سب صحن میں نکلے تو دیکھا کہ ضیاءؑ چپ چاپ اُسی طرح پانی کے ٹب میں بیٹھا ہے اس پر سب کو سخت حیرت ہوئی کہ کس حوصلے اور صبر کا مالک ہے کہ نہ رویا نہ گھبرایا نہ کسی قسم کی مدد کے لئے آواز ہی نکالی۔ یہی عادت ضیاء کی اب بھی ہے کہ وہ ہر بات نہایت حلیم الطبعی نرمی متانت سے کرتا ہے اور جذباتی ہونے سے گریز کرتا ہے۔

ضیاء کو بچپن ہی سے عمدہ لباس اور صاف ستھرے کپڑے پہننے کا شوق تھا۔ اس میں خوش لباسی کا یہ ذوق گویا قدرت نے ہی ودیعت کیا ہے جو آج تک قائم ہے، مجھے یاد ہے کہ جب بھی دھوبی دھلائی کے کر

آتا تو ضیا بڑی آپا کے پاس آکر پوچھتا اس میں میرے کپڑے کہاں ہیں ؟ —— اس کی نیکریں، قمیضیں جب اُسے دکھائی جاتیں تو وہ ان کی استری پر اعتراض کرتا تھا۔ کہ دھوبی ٹھیک سے استری نہیں کرتا۔ اور آپا حمیدہ کہا کرتیں، فکر مت کرو۔ میں انہیں دوبارہ استری کر دوں گی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ دھوبی کپڑے لاتے میں کچھ دنوں کی تاخیر کر دیتا اور اماں اُس کے سکول یونی فارم کے کپڑے گھر میں دھو کر استری کر دیتیں۔ مگر اُسے اماں کے استری کیئے ہوئے کپڑے پسند نہ آتے تھے۔ وہ انہیں اٹھا کر زمین پر پھینک کر زور زور سے اپنے پاؤں سے مسل دیتا۔ اور کہا کرتا "میں الو کا پٹھا ہوں گا اگر یہ کپڑے پہنوں"۔ لباس کی تراش خراش اور ہر طرح سے نک سُک سے درست ہو کر گھر سے باہر نکلتا تھا۔

جب ضیاء سنٹرل ماڈل سکول لاہور میں داخل ہوا۔ تو نہایت باقاعدگی سے سکول جاتا آباجی نے اُس پر کبھی کسی معاملے میں سختی نہ کی۔ مگر وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ ضیاء اُن کی اکلوتی اولاد نرینہ ہوتے کے ناطے ضرور بڑا آدمی بنے اور نام پیدا کرے۔ دبی زبان سے سرزنش کرتے تھے۔ کہ پڑھائی میں زیادہ دل لگایا کرو۔ ڈرامے میں کام کرنے کا شوق بھی بچپن سے تھا ابا جی نے سنٹرل کالج کی سٹیج پر ایک ڈرامہ سٹیج کروایا تھا۔ جس میں ضیاء نے ایک چھوٹے سے سکول کے طالب علم کا پارٹ ادا کیا تھا[1]، اور نہایت خود اعتمادی سے وہ رول کیا۔

---

[1] اس کھیل کا نام "دیوتا" تھا جسے خادم محی الدین صاحب نے پیش کیا تھا۔

جب ضیاء میٹرک میں تھا۔ اُسے ٹینس اور کرکٹ کا بہت شوق تھا۔ ہر شام باقاعدہ ٹینس شوز اور سفید پتلون پہن کر سکول کی گراؤنڈ میں پہنچ جاتا تھا۔ اباجی کو خدشہ تھا۔ کہ کہیں اس کا یہ کھیلوں کا شوق اس کی پڑھائی پر منفی اثرات نہ ڈالے۔ مگر جب اس کا میٹرک کا نتیجہ نکلا تو اس نے خاندان بھر کے لڑکوں میں سب سے زیادہ نمبر لے کر اعلیٰ فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔

ضیاء کے مزاج اور افتاد میں سنجیدگی اور متانت بچپن سے ہی تھی دوست نواز بھی بہت تھا اور اب تک ہے اس کا حلقہ یاراں بہت وسیع ہے۔ خدا نے مطالعے کی ایسی لگن اُس کے دل میں پیدا کی کہ کالج کے دنوں میں رات کو دیر تک ڈرامے انگلش لٹریچر اور تازہ ترین ادبی کتابیں اس کے زیر مطالعہ رہتیں اماں کئی بار نصف شب کو اٹھ کر آئیں اور دیکھتیں کہ ضیاء بڑے انہماک سے بستر پر بیٹھا ہے اور کتاب ہاتھ میں ہے۔ وہ سونے کے لئے کہتیں تو جواب دیتا کہ کتاب تو ابھی ختم نہیں ہوئی۔ اور صبح کو جب آکر دیکھتیں تو کتاب سرہانے رکھی ہوتی۔ اور وہ صبح کی اذان کے بعد محوِ خواب ہوا کرتا تھا۔

ضیاء کی خوش خوراکی بھی ضرب المثل ہے۔ بہت تھوڑا کھاتا ہے اور بہت اچھی قسم کے کھانے پسند کرتا ہے۔ دستر خوان پر دال نہ ہو تو ضیاء اب بھی رغبت سے کھانا نہیں کھاتا۔ بہت سال پہلے کا ذکر ہے کہ ہم قصور اپنی پھوپھی جان کے ہاں گئے۔ انہوں نے سب کی خاطر تواضع کے لئے اچھے اچھے کھانے پکائے مگر دال موجود نہ تھی، اس وقت ضیاء کی عمر بہت چھوٹی تھی مزاج بگڑ گیا کہ دال کھاؤں گا۔ چنانچہ پھوپھی جان نے بھائی بشیر کو بازار بھیجا اور وہ کسی

نانبائی سے ماش کی دال لے کر آئے۔ اس وقت ضیاء کی آنکھوں کی چمک قابل دید تھی۔ پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی ہونے کے سبب سبھی اس سے پیار کرتے تھے۔ اور اس کی پسند ناپسند کو اولیت حاصل تھی۔ سب سے بعد ناشتہ کرتا تھا۔ اور باورچی خانے میں امّاں کو خاص ہدایت کرتا تھا۔ کہ میرے ٹوسٹ اس طرح گھی میں تلے جائیں۔ کہ بالکل روسٹ ہو کر سرخ اور کرارے ہو جائیں۔ امّاں اپنے چہیتے بیٹے کی ہر فرمائش دل و جان سے پوری کرتی تھیں۔ ہم پانچوں بہنیں ضیاء کے ٹوسٹوں کو بہت حریصانہ نظروں سے دیکھتی تھیں۔ مگر اماں سے ایسی فرمائش کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ وہ تو پہلے ہی ہم پانچوں کے لئے خانہ داری کے کام کرتے نڈھال ہو جاتی تھیں۔

اب تو ضیاء سے سالانہ ایک ملاقات ہو جاتی ہے۔ مگر اس کی طبیعت میں وہی سادگی وہی کم گوئی اور آنکھوں میں وہی ذہانت اور فراست کی چمک ہے۔ جو لڑکپن میں تھی۔ آخری مرتبہ گزشتہ ماہ جب وہ ہم سے رخصت ہو رہا تھا تو ہم نے پوچھا اب کہاں جا رہے ہو؟ نہایت سادگی سے بولا، "کل سویرے میں اپنے پنڈ واپس جا رہا ہوں۔" (یعنی برمنگھم واپسی ہے)

(ضیاء کی بہن رشیدہ سلیم سیمیں کا خط راقم الحروف کے نام)

رواں ہے یہ روایت

# کولمبو پلان فیلوشپ

۱۹۴۸ء میں ریڈیو پاکستان سے منسلک ہونے کے بعد ریڈیو کے لئے ضیا محی الدین کے سپرد مختلف احباب کے انٹرویو، یونیورسٹی کے طلباء کا پروگرام اور نیوز براڈکاسٹنگ کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کے فرائض بجا لانا بھی شامل تھے۔ وہ ان فرائض کو بطریق احسن ادا کر رہے تھے۔ کہ ۱۹۵۱ء میں انہیں کولمبو پلان کے تحت آسٹریلین براڈکاسٹنگ کارپوریشن میں ٹریننگ کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ کولمبو پلان جنوبی ایشیا اور خصوصاً کامن ویلتھ ممالک کے لئے ترقی کا ایک منصوبہ تھا جو ۱۹۵۰ء میں وجود میں آیا تھا۔ اور جس کے لئے امریکہ۔ کینیڈا، آسٹریلیا، جاپان اور برطانیہ نے ۲۶۲۶ ملین ڈالر کی امداد فراہم کی تھی۔ ضیاء محی الدین کو تقریباً دو سال آسٹریلیا میں رہ کر آسٹریلین براڈکاسٹنگ کارپوریشن کے جدید تکنیکی امور سے واقف ہونا تھا لیکن یہ فیلوشپ ایک لحاظ سے ان کی زندگی کا TURNING POINT بھی ثابت ہوا آسٹریلیا میں انہیں احساس ہوا کہ ان کی منزل ریڈیو نہیں بلکہ تھیٹر ہے کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ آسٹریلیا میں جتنے بھی

لوگ ریڈیو میں حصہ لیتے ہیں بنیادی طور پر تھیٹر کے ایکٹر ہیں۔ چنانچہ ضیاء محی الدین بھی اس دو سال میں بطور ایکٹر۔ ڈائریکٹر اور مصنف آسٹریلین کارپوریشن میں اپنا لوہا منوانے کے ساتھ تھیٹر میں حصہ لیتے رہے اور آسٹریلیا کے مرکزی تھیٹر سڈنی میں کام بھی کیا۔ اپنی ٹریننگ کے انہی دنوں میں آپ نے ریڈیو پاکستان کو چھوڑ کر رائل اکیڈمی آف ڈرامیٹک آرٹس لندن JOIN کرنے کا پروگرام بنا لیا۔

"میں نے یہ طے کر لیا کہ مجھے اب ڈرامے ہی کو اپنانا ہے ان دنوں میں ریڈیو پاکستان میں تھا اور آسٹریلیا میں کولمبو پلان فیلوشپ پر تھا۔ وہاں سے میں نے استعفیٰ بھجوا دیا۔ اور انگلستان جانے کا ارادہ کیا۔ چھوٹے بخاری صاحب ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل تھے وہ مجھے ذاتی طور پر جانتے تھے چنانچہ جب انہوں نے میرا استعفیٰ منظور کر لیا اور مجھے یہ بھی کہا کہ انگلستان میں فلاں فلاں سے ملنا شاید تمہاری مدد کریں۔

(کہانی میری۔ ضیاء محی الدین رسالہ آہنگ)

"آسٹریلیا میں ریڈیو کے کام کے دوران جب تھیٹر دیکھا تو وہاں ایک اور بات سمجھ آئی۔ یعنی جو ریڈیو کا ایکٹر ہے وہ تھیٹر ضرور کرتا تھا۔ بہر حال یہاں پر اسٹیج یعنی تھیٹر نے اثر کیا۔ اور لوگوں سے پتہ چلا کہ یہ سب کچھ جو کیا جاتا ہے اس کی اپنی گرائمر ہے۔ تو جناب اس گرائمر کو جاننے کے لئے، کہ آخر یہ سب کچھ ہے کیا۔ سوچا کہ پہلے ولایت جایا جائے اور اس بات کو سمجھا جائے آسٹریلیا میں نے تقریباً ڈیڑھ سال عملی تربیت

حاصل کی، اور چھ ماہ تک ریڈیو پر پروگرام پروڈیوس کئے۔ یہ کانٹریکٹ فیچرز اور پلیز کے سلسلے میں تھا۔ جب وہ کانٹریکٹ ختم ہوا تو میں نے بخاری صاحب کو ایک لمبا چوڑا خط لکھا کہ میں آخر کرنا کیا چاہتا ہوں۔ اور اس بات کی معذرت بھی کی کہ جناب میں آیا تو قوم کے خرچے پر اس لئے تھا کہ ریڈیو کی سروس کروں گا مگر میرا ارادہ یہ ہے۔ بخاری صاحب نے جواب میں کمال شفقت کا مظاہرہ کیا۔ یعنی بجائے اس کے کوئی ڈانٹ ڈپٹ ہوتی۔ الٹا انہوں نے چند لوگوں کے نام خطوط دیئے جو اس زمانے میں وہاں ریڈیو میں کام کرتے تھے۔ تو یہ خط دراصل ایک سرٹیفکیٹ کی حیثیت رکھتے تھے۔ کہ اس لڑکے کو اگر وہاں کام مل جائے تو . . . . . کیونکہ یہ یہاں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آرہا ہے پتہ نہیں وہاں اس کا کیا حشر ہو گا یہ بات تو یہ خود جانتے مگر سب کچھ شفقت سے لکھا تو جناب پھر ولایت پہنچ گئے . . . ."

گفتگو دسمبر ۸۶ء

"تم نے آسٹریلیا میں تھیٹر کی روایت کی بابت پوچھا ہے بھئی اب تو بہت ہو گئی ہے میں جب ریڈیو کی ٹریننگ کے سلسلے میں گیا تو اس زمانے میں یہ روایت یعنی تھیٹر خالصتاً انگریزوں کے ہاتھوں میں تھا۔ یہ بات کر رہا ہوں ۵۲-۱۹۵۱ء کی خاص انگریزوں کے لکھے ہوئے ڈرامے ہوتے تھے وہی کئے جاتے تھے۔ ہاں خالص آسٹریلیوی تھیٹر بہت کم تھا۔ انگریزوں کے

کامیاب ڈرامے جو WEST END کی روایت تھے یہاں
پر ہوتے تھے۔ یعنی جیسے امریکہ میں امریکی تھیٹر، گو ان کی زبان
انگریزی ہی ہے مگر اس میں خالص امریکی طرز اور انداز جھلکتا ہے
یوں آسٹریلین تھیٹر کی اپنی روایت بہت کم تھی مگر اب وہاں
بہت ڈرامے ہوتے ہیں۔ تھیٹر ہوتا ہے اکثر یہاں ویسٹ انڈ
کے کامیاب کھیل دہرائے جاتے تھے۔"
گفتگو دسمبر ۸۶ء لاہور کینٹ

"قیام آسٹریلیا کے دوران کہانیاں لکھنے کا شوق بھی بڑھا۔
تو کئی کہانیاں ادب لطیف وغیرہ میں روانہ کیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں
کہ یہ ساری کہانیاں بکواس تھیں اب سوچ کر شرم آتی ہے کہ کیا لکھا
تھا۔
"مثلاً آسٹریلیا میں ایک لڑکی کو دیکھا، عاشق ہو گئے، پھر
ایک مجرم شخص کے ساتھ اس کے تعلقات بڑھے ہمارے دل
کو دھچکا لگا۔ اور جھٹ سے کہانی لکھ دی، ایسا ہی ہوتا ہے ان

دنوں میں ... قرۃ العین حیدر سے دوستی ہوئی۔ ان کے یہاں
آنا پڑا۔ ان کا اپنا ایک ماحول تھا جس میں وہ رہتی تھیں یعنی
DOWN TO EARTH لوئر مڈل کلاس وہ جو رومانوی فضا تھی
اُسی کا انہوں نے اظہار کیا۔ یہ سب باتیں آدمی جوانی میں کرتا
ہی ہے جو شاید نہیں کرنی چاہئیں۔ لیکن اس کے ساتھ ابن انشاء سے
ہماری دوستی تھی۔ وہ "نگار" میں لکھنے پر مجبور کرتا تھا۔ کہ ایک
کہانی تم لکھ دیا کرو۔ ابن انشاء میرے ساتھ ریڈیو میں خبروں کا
ترجمہ کیا کرتے تھے۔ ان سے میری دوستی تھی۔ بلکہ جب میں
آسٹریلیا گیا تو اپنی کتابیں انہیں دے گیا۔ کیونکہ اس زمانے میں
بہت پیسے ہوتے تھے۔ میں ان دنوں اپنی ہمشیرہ کے پاس رہا
کرتا تھا۔ خیر ان پیسوں سے یا تو میں ۵۵۵ کے سگریٹ خریدا کرتا
تھا یا پھر کتابیں خریدتا تھا۔ بے شمار کتابیں ان پیسوں سے آجاتی
تھیں۔ تو جب میں آسٹریلیا گیا تو کتابوں کو صندوق میں بند کر کے
ابن انشاء کے ہاں چھوڑ گیا۔ بعد میں لاہور میں سیلاب آیا۔ جب
صندوق کھولا تو ہاتھ میں کتاب یوں آگئی۔ جیسے کون کی چکنائی۔
خیر میں نے یہ کتابیں بڑی محنت سے جمع کیں۔ بات سے بات
کہاں نکل گئی۔ لکھنے کی تحریک انہی لوگوں کی وجہ سے ہوتی تھی۔
تو کچھ ہم بھی لکھ دیا کرتے تھے۔ اور یہ سمجھتے تھے کہ ہمارا شمار بھی
بہت جلد افسانہ لکھنے والوں میں ہونے والا ہے مگر خدا کا شکر
ہے کہ بہت جلد یہ احساس ہو گیا کہ جو میں لکھتا ہوں وہ اس قدر ناقص
ہے اور اتنا سطحی ہے کہ اگر کچھ لکھنا ہے تو سوچ سمجھ کر لکھو۔ ہاں

میرا پہلا افسانہ مولانا صلاح الدین صاحب کے رسالے" ادبی دنیا" میں چھپا۔ یہ شکر ہے کہ میں نے اس زمانے میں بھی افکار، ادبی دنیا اور ادب لطیف میں ہی لکھا، "بیسویں صدی" میں کچھ نہیں چھپا۔"
گفتگو دسمبر ۱۹۸۶ء

" یہ خبر نہیں کہ پہلے انگریزی ادب میں شوق پیدا ہوا یا اردو ادب میں۔ خدا بہتر جانتا ہے۔ کیونکہ ابا جی انگریزی کے استاد تو تھے۔ مگر وہ لکھتے اردو میں تھے۔ ہاں ایک بات ضرور ہے کہ ہمارے سارے گھرانے میں لکھنے لکھانے کی ایک روایت تھی میرے چچا ڈاکٹر اقبال تو تھے ہی، داؤد رہبر مستقل لکھتے تھے۔ ابا جی بے شمار ریڈیو ٹاک اور ہلکے پھلکے خاکے لکھتے تھے۔ ڈرامے لکھتے تھے۔ گویا لکھنا ہمارے خاندان کا ایک حصہ تھا۔ مگر میرا خیال ہے کہ شاید تحت الشعور میں کہیں احمد شاہ بخاری (پطرس) کی ذات تھی جس سے لکھنے اور انگریزی ادب میں ذوق کی راہیں کھلیں۔ میں نے انگریزی صرف بخاری صاحب سے پڑھی۔ باقی استادوں سے میں نے انگریزی نہیں پڑھی۔ انگریزی کے نام پر شاذ کوئی اور زبان پڑھی ہے۔ میرے ہم عصروں میں کتابیں پڑھنا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ میں نے شیکسپیئر کو اگرچہ کالج میں پڑھا۔ مگر خدا جانتا ہے کہ مجھے شیکسپیئر کے بارے میں اس وقت تک سمجھ نہ آئی جب تک میں نے ولایت جا کر شیکسپیئر کا کھیل نہ دیکھا۔ شیکسپیئر کا کھیل دیکھا تو پھر پتہ چلا۔ کہ یہ تو معرفت کا وہ مقام ہے جسے دیکھا

میرا پہلا افسانہ مولانا صلاح الدین صاحب کے رسالے "ادبی دنیا" میں چھپا۔ یہ شکر ہے کہ میں نے اس زمانے میں بھی افکار، ادبی دنیا اور ادب لطیف میں ہی لکھا، "بیسویں صدی" میں کچھ نہیں چھپا۔

گفتگو دسمبر ۸۶ء

"یہ خبر نہیں کہ پہلے انگریزی ادب میں شوق پیدا ہوا یا اُردو ادب میں۔ خدا بہتر جانتا ہے۔ کیونکہ ابا جی انگریزی کے استاد تو تھے۔ مگر وہ لکھتے اردو میں تھے۔ ہاں ایک بات ضرور ہے کہ ہمارے سارے گھرانے میں لکھنے لکھانے کی ایک روایت تھی میرے چچا ڈاکٹر اقبال تو تھے ہی، داؤد رہبر مستقل لکھتے تھے۔ ابا جی بے شمار ریڈیو ٹاک اور ہلکے پھلکے خاکے لکھتے تھے۔ ڈرامے لکھتے تھے۔ گویا لکھنا ہمارے خاندان کا ایک حصہ تھا۔ مگر میرا خیال ہے کہ شاید تحت الشعور میں کہیں احمد شاہ بخاری (پطرس) کی ذات تھی جس سے لکھنے اور انگریزی ادب میں ذوق کی راہیں کھلیں۔ میں نے انگریزی صرف بخاری صاحب سے پڑھی۔ باقی استادوں سے میں نے انگریزی نہیں پڑھی۔ انگریزی کے نام پر شاید کوئی اور زبان پڑھی ہے۔ میرے ہم عصروں میں کتابیں پڑھنا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ میں نے شیکسپیئر کو اگرچہ کالج میں پڑھا۔ مگر خدا جانتا ہے کہ مجھے شیکسپیئر کے بارے میں اس وقت تک سمجھ نہ آئی جب تک میں نے ولایت جا کر شیکسپیئر کا کھیل نہ دیکھا۔ شیکسپیئر کا کھیل دیکھا تو پھر پتہ چلا۔ کہ یہ تو معرفت کا وہ مقام ہے جسے دیکھا

جائے۔ کھنگالا جائے۔ پڑھا جائے۔ پھر کہیں جا کر انگریزی ادب سے واقفیت ہوئی۔"

گفتگو دسمبر ۸۶ء، (لاہور کینٹ)

پیمانِ جنوں

# رائل اکیڈمی آف ڈرامیٹک آرٹس، لندن

آسٹریلیا کے قیام نے ضیاء کے تھیٹر کے ذوق کی آبیاری کی تھی، رائل اکیڈمی آف ڈرامیٹک آرٹس لندن کی تربیت نے تو ضیاء کے انداز زندگی ہی کو بدل کر رکھ دیا۔ اب ڈرامہ ہی اوڑھنا بچھونا تھا۔"رائل اکیڈمی آف ڈرامیٹک آرٹس لندن" کی بنیاد ۱۹۰۴ میں رکھی گئی تھی۔ جہاں دو سال میں تھیٹر اور ڈرامہ کا کورس مکمل کرایا جاتا تھا اور طالب علم کو انگریزی کے ڈرامہ آغاز سے لے کر موجودہ دور کے ڈراموں سے متعارف کرایا جاتا تھا۔ اس دو سال میں ہر دور کے نمائندہ ڈرامہ کے متعلق تنقید کے علاوہ ایکٹنگ کے متعلق بھی پڑھایا اور عملی طور پر ہر طالب علم کو روزانہ کسی نہ کسی ڈرامہ میں کوئی نہ کوئی کردار ضرور کرنا ہوتا تھا۔ اکیڈمی کی طالب علمی کے دوران ضیاء نے برٹش براڈ کاسٹنگ کارپوریشن ( B. B. C ) کی ایسٹرن سروس میں بطور پروڈیوسر خدمات بھی سرانجام دیں۔ بطور پروڈیوسر ( B. B. C ) کے ساتھ ڈیڑھ سال تک منسلک رہے۔ ڈرامہ کے ہدایت کار کے علاوہ ضیاء نے بطور ایکٹر بھی کام کیا۔ تقریباً چھ ڈرامے اس زمانے کے یادگار ہیں۔ ضیا کو ایک ٹیم کے ساتھ (AMERICAN AIR BASES) پر بھی ڈرامہ پیش کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ یہ ٹیم مسلسل پانچ ماہ تک

(AMERICAN AIR BASES) پر ڈرامہ پیش کرتی رہی اور اس طور امریکن پبلک ضیاء سے متعارف ہوئی۔ پاکستان واپسی تک مغربی دنیا اور امریکہ ضیاء کی اداکاری سے واقف ہو چکی تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ ضیاء نے مغربی دنیا اور امریکہ میں اپنی اداکاری کے جھنڈے گاڑ دیئے تو بے جا نہ ہوگا۔

" رائل اکیڈمی آف ڈرامیٹک آرٹس، لندن میں مجھے داخلہ بروقت نہ مل سکا۔ کیونکہ ان کی کلاس (ٹرم) شروع ہو چکی تھی لہذا دو ماہ تک انتظار کرنا پڑا۔ لیکن اس دو ماہ کا فائدہ ہوا کہ میں نے ان چیزوں کی تیاری کر لی جو داخلے کے وقت ضروری ہوتی ہیں۔ وہاں تحریری ٹیسٹ نہیں ہوتا۔ بس داخلے کا فارم اس کے ہمراہ ایک درخواست اور وہ کوئی چیز سنتے ہیں اس میں ایک تو کلاسیکل اور دوسری جدید ہونی چاہیئے۔ تو مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے ایک تو شیکسپیر کے کھیل " رومیو اینڈ جیولیٹ " کا اقتباس سنایا تھا۔ اور دوسرے روسی ادیب ترگنیف کے ایک کھیل کا کوئی پارٹ تھا۔ اس زمانے میں آج کی طرح اتنا زیادہ رش نہیں ہوتا تھا۔ اب تو خیر سے بہت تعداد لوگوں کی ہوتی ہے۔ اور اب انہوں نے اس کی معیاد بھی بڑھا کر دو کی بجائے تین سال کر دی ہے۔ اور اچھا ہی کیا ہے کیونکہ پریکٹیکل ہے اب وہاں اسی دوران ڈرامے کرنے کو مل جاتے ہیں۔ تو یہاں پر پہلے تو ڈرامے کی تاریخ پڑھائی جاتی ہے کہ کب سے انگریزی ڈرامہ شروع ہوا۔ پھر دوپہر کے کھانے کے بعد یعنی دو بجے سے چھ بجے تک مختلف مشق کروائی جاتی ہیں۔ آواز نکالنے

کی مشق، تلوار چلانے کی مشق۔ حرکات و سکنات کی مشق۔ یعنی اسٹیج پر مختلف طریقے سے چلنے کی مشق۔ اور ساتھ ہی ساتھ پہلے دن سے کسی نہ کسی ڈرامے کی مسلسل مشق جاری رہتی ہے (استاد کی زیر نگرانی) پھر وہاں پر کوئی نہ کوئی کھیل پیش کیا جاتا ہے یعنی اس جگہ پہ۔ کوئی ڈائریکٹر بن جاتا ہے اور وہ اپنے حساب سے کاسٹ چن کر کوئی چیز پیش کرتا ہے۔ تو مجھے یاد ہے کہ پہلے مجھے انہوں نے ایک ڈرامہ ڈائریکٹ کرنے کے لئے کہا شاید اس لئے کہ میں ان لڑکوں سے عمر میں زیادہ تھا۔ یا پھر شائد ان سے تجربہ زیادہ تھا۔ ریڈیو کے حوالے سے آسٹریلیا وغیرہ سے ہو آیا تھا۔ خیر اس ڈرامے کو میں نے ڈائریکٹ کیا۔"

"پھر ایک سال کے بعد جب آپ ابتدائی ڈرامے کی تاریخ یا پریکٹیکل کر لیتے ہیں تو زیادہ تر مختلف کھیل ہی کروائے جاتے ہیں اس میں مختلف دور کے کھیلوں سے آغاز ہوتا ہے یعنی سترھویں صدی کے کھیل، اٹھارویں صدی کے اور پھر موجودہ۔ کیونکہ ہر دور کے لکھے ہوئے کھیلوں کی زبان مختلف ہے ان کا اسٹائل مختلف ہے پھر موجودہ لکھے ہوئے کھیلوں کی مشق کروائی جاتی ہے پھر دو سال کے بعد وہ سند دے دیتے ہیں۔ اور جب سند دی جاتی ہے تو پروڈیوسر حضرات کو بلایا جاتا ہے کیونکہ انہیں نئے اداکاروں کی ضرورت تو رہتی ہے تاکہ وہ دیکھ سکیں۔ یہ بھی ضرور کہوں گا کہ میں یہ سب کچھ نہ کر پاتا اگر پرنسپل نہ چاہتے کیونکہ انہوں نے میری فیس معاف کر دی تھی گویا ایک طرح سے وظیفہ ہی ہو گیا۔"

گفتگو دسمبر ۸۶ء

"پھر جب تھیٹر کی عملی زندگی شروع ہوئی تو بہت اچھا ہوا کہ پہلے ریپرٹری تھیٹر میں کام کیا۔ اس زمانے میں اسٹیج سے وابستہ جتنے تکنیکی کام تھے کئے۔ برطانیہ میں کوئی ستر بہتر ہوائی فوج کے اڈے تھے۔ ان سب میں کوئی نہ کوئی ڈرامہ ہوا کرتا تھا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ کا۔ تو وہاں بہت ڈرامے کئے اور اپنے حساب سے پیسے بھی معقول ملتے تھے۔ مگر لندن میں ابھی تک کوئی ڈرامہ نہیں کیا تھا۔"

"پھر ۱۹۵۶ء میں اباجی کی طبیعت خراب ہوئی تو واپس . . . . پاکستان آیا پنڈی میں۔ اباجی تو دو تین ماہ کے بعد ٹھیک ہو گئے اور میں نے واپس جانے کا ارادہ کر لیا۔ جب کراچی پہنچا تو ایک صاحب سے ملاقات ہوئی انہوں نے میری واپس برطانیہ جانے کی وجہ پوچھی اور پھر خود ہی کراچی کے آرٹس کونسل میں ڈرامہ کرنے کی پیش کش کی۔ یہ خواجہ معین الدین کا کھیل "لال قلعے سے لالوکھیت تک" تھا۔ بہت خوبصورت ڈرامہ تھا۔ اچھے مزے کے فقرے آئے۔ اچھا لگا۔ اچھے سے زیادہ سوچا کہ یہ کرنا چاہیئے۔ یعنی تمام (ALL MALE CAST) میں نے کہا کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا ضرور کریں۔ یہ صاحب سرور کے بھائی تھے۔ سرورحین سے میری بعد میں شادی ہوئی۔

۱۹۵۶ء میں پاکستان واپسی پر ضیاء ڈرامہ پر اتھارٹی ہو چکے تھے اب انکی بات میں وزن تھا یہ پہلے پاکستانی تھے جنہوں نے اکیڈمی میں باقاعدہ ڈرامہ کی تربیت حاصل کی تھی۔ پاکستان میں باصلاحیت افراد کی سرپرستی ہمیشہ مسئلہ رہی ہے اس لئے ضیاء کو پاکستان میں اپنا آپ منوانے کے لئے بہت تگ و دو کرنا پڑی۔ واپسی پر انہوں نے لاہور

میں گروپ تھیٹر کی بنیاد رکھی۔ گروپ تھیٹر دراصل پاکستان میں ڈرامہ کی پہلی پیشہ ورانہ پروڈکشن تھی۔ اس گروپ تھیٹر نے لاہور اور کراچی میں کئی ایک کامیاب ڈرامے پیش کیئے۔

۱۹۵۷ء میں ضیاء کی خدمات کراچی آرٹ تھیٹر سوسائٹی نے بطور ریذیڈنٹ ڈائریکٹر حاصل کیں۔ ضیاء ڈرامہ ڈائریکٹر کے علاوہ پاکستان ٹائمز میں ڈرامہ نقاد کی حیثیت میں بھی لکھتے رہے۔ انہوں نے ۱۹۵۹ء تک اردو اور انگریزی میں تھیٹر کے لیئے نو ڈرامے، ریڈیو کے لیئے سولہ FULL LENGTH PLAYS پیش کیئے۔ اس کے علاوہ فلموں پر تبصرہ بھی لکھا۔ اور اسکولوں اور کالجوں میں تھیٹر کی اہمیت پر لیکچرز بھی دیئے۔ اس زمانہ کی یادگار خواجہ معین الدین کے ڈرامے "لال قلعے سے لالو کھیت" اور "مرزا غالب بندر روڈ پر" ہیں جن کے پروڈیوسر اور ڈائریکٹر ضیاء محی الدین تھے۔

" تو جب خواجہ معین الدین کے ڈرامے کو کرنے کا مرحلہ شروع ہوا تو پہلے میں نے ان اداکاروں سے کہا کہ پہلے آواز لگانے کی تربیت ہوگی۔ کیونکہ یہ مائیکروفون نہیں چلے گا۔ اور جو تھیٹر کا صحیح طریقہ ہے وہ اپنایا جائے گا۔ اس زمانے میں میرے ساتھ محمود علی۔ ماجد، یوسف۔ سبحانی بایونس اور فضل لبشر تھے۔

یوں خواجہ صاحب بہت اچھا لکھتے تھے مگر ان ڈراموں کو باقاعدہ ڈرامہ کی ہیئت میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں اس میں ایک آغاز۔ درمیان اور انجام ہوا کرتا تھا۔ لیکن وہ جو ایک بہت بڑا ڈرامائی تصادم جسے کہتے ہیں۔ وہ نہیں ہوتا تھا۔ کچھ ان سے اجازت لے۔ اسے آگے پیچھے کر لیا۔ لیکن ایک بات کہہ دوں

کہ سین لاجواب لکھتے تھے۔ خوبصورت اور مزے دار فقروں کے ساتھ.... تو خیر" لال قلعے سے لالو کھیت" تک کیا یہ کھیل پیٹرک ہال میں ہوا اور اسکے افتتاح کے لئے شام کو سہروردی بطور مہمان مدعو تھے۔ کھیل کی وہ خوبیاں جو پروڈکشن کے زمرے میں آتی ہیں مثلاً اس کا سیٹ بہت عمدہ تھا۔ یعنی جھونپڑی اسی قسم کی تھی۔ جیسے اصل اور حقیقت میں ہوتی ہے، اسی طرح ٹاٹ کا پردہ (یعنی کوئی مبالغہ نہیں تھا) بلکہ حقیقت سے قریب رکھا۔ موڈ کے حوالے سے ہلکی روشنی تھی۔ ہر منظر کے اختتام پر تاریکی ( BLACK OUT ) کی تکنیک استعمال کی گئی تھی۔ اور کوشش کی گئی کہ تیس سیکنڈ سے زیادہ دیر نہ لگے اور منظر کے لوازمات بدل جائیں۔

اس کے بعد شیکسپیئر کے ڈرامے "ہیملٹ" اور "رومیو جولیٹ" کئے۔ تھراٹن وائیلڈر کا مشہور مزاحیہ کھیل "میچ میکر" کیا۔ یہاں ہمارے ساتھی فرید احمد اور محسن شیرازی تھے۔ کچھ کھیل گورنمنٹ کالج لاہور میں کئے۔ اور پھر محسن شیرازی نے اپنے پلے سے پیسے دے کر اونیل کا کھیل الحمراء لاہور میں "لونگ ڈیز جرنی انٹو نائٹ" کیا یہ کھیل، اٹھائیس دن تک چلا۔ اور اچھے خاصے پیسے کمائے۔

۱۹۵۸ء میں حفیظ جاوید نے "جیولس سیزرز" کا ترجمہ کیا اسے گورنمنٹ کالج میں کھیلا۔ پھر آرٹس کونسل کے کہنے پر طے کیا کہ سال میں چھ ڈرامے کروں گا۔ یعنی ہر دو مہینے بعد ایک ڈرامہ اس سلسلے میں ( LOOK BACK IN ANGER ) کیا۔"

۱۹۵۹ء میں انگلستان گیا۔ اور وہاں ( NOEL CAWARD )
کا ڈرامہ ( HAY FEVER ) ڈائریکٹ کیا۔"

گفتگو ستمبر ۸۶

"تین ایکٹ کا یہ مزاحیہ کھیل ( NOEL CAWARD ) نے ۱۹۲۵ء
میں تحریر کیا۔ جسے ۸ر جون ۱۹۲۵ء کو ایمبیسڈر تھیٹر لندن میں کھیلا گیا۔ پھر اسی
کے دو سال بعد مصنف نے خود اس میں چند تبدیلیاں کیں اور ۱۹۲۷ء کو اسے
تحریری شکل دی گئی۔

اسی زمانے میں A PASSAGE TO INDIA کے ہدایتکار
سے ملاقات ہوئی اس نے میرا ڈائریکٹ کیا ہوا کھیل دیکھا۔ اِن
دِنوں "پیسیج ٹو انڈیا" اپنے ابتدائی مراحل پر تھا۔ اُس نے
مجھ سے میری آئندہ مصروفیات کی بابت دریافت کیا۔ میں نے
بتایا کہ میں یو این کی طرف سے کچھ ایشائی ملکوں کی ثقافت کے بارے
میں مضمون پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ جیسے تھائی لینڈ، جاپان،
فلپائن اس نے مجھے کہا کہ تم ہمارے ساتھ ڈرامہ کیوں نہیں کرتے
میں نے اسی زمانے میں ای ایم فارسٹر کا ناول تو پڑھ رکھا تھا۔
اس نے کہا ایک ہندوستانی کریکٹر ہے میں نے جھٹ کہا وہ ڈاکٹر
عزیز کا ہی ہے۔ اس نے کہا بالکل اگر چاہو تو۔ میں نے حامی بھر لی
اس کھیل کو DONALD ALBERY نے کامیڈی تھیٹر لندن میں پہلی
بار ۲۰ر اپریل ۱۹۶۰ء کو پیش کیا اس کھیل کے ہدایت کار
( FRANK HUASER ) تھے۔"

گفتگو ستمبر ۸۶ء

# پہلی شادی

۱۹۵۸ء کا سال ضیاء کی زندگی میں ایک نئے انداز میں داخل ہوا۔ ابھی ضیاء فن کی دنیا میں اپنا لوہا منوا ہی رہے تھے۔ ایک نئی دنیا نے انہیں سمیٹنے کے لئے اپنی آغوش وا کر دی اور انہیں فن کی دنیا کے ساتھ گھریلو زندگی پر توجہ دینا پڑی۔ عام طور پر فن کی دنیا اور گھر میں زندگی کا ایک ساتھ چلنا بہت مشکل ہوا کرتا ہے۔ ضیاء کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہوا اور ان کی یہ شادی چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر علیحدگی پر منتج ہوئی۔

"اس کا کیا جواب دوں۔ اس انتہائی ذاتی سوال کے بارے میں کیا لکھوں۔ یوں تو لفظ دماغ میں آتے جائیں گے۔ اور میں لکھتا جاؤں گا۔

کوئی بھی شادی۔ جب سے یہ ادارہ کھلا ہے۔ کیوں ناکامیاب ہوتی ہے؟ اس میں یا شخصیتوں کا تضاد ہوتا ہے یا اپنی کم مائگی۔ اپنی کمزوریوں کو برداشت کرنے کی سکت نہیں ہوتی۔ چھوٹی چھوٹی باتیں ایک دوسرے کو ہنر بہ دے کر بڑے اور اہم واقعات بن جاتے ہیں۔ شاید اس سے بڑھ کر جنسی تعلق کی کمی جس کا اقرار کرنا ہمارے یہاں بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ عورت تو خیر اس کا ذکر کبھی کر ہی نہیں سکتی۔ اور مردوں نے یہ تعین کر رکھا ہے کہ ان کی جنسی برتری اللہ میاں کے گھر سے تصدیق شدہ ہے۔ یہ تو

رہی تمہید۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ میری پہلی شادی کے بگاڑ میں کوئی گہرے نفسیاتی پیچ نہ تھے۔ نہ ان میں کوئی ایسا مرض تھا جسے برسوں سے گھن لگ رہا تھا۔ جب میں پاکستان پہنچا اور آہستہ آہستہ ایسی حرکتوں میں الجھ گیا۔ جو گھریلو خوشگواری کے لئے خطرناک ہوتی ہیں۔ پہلی پاکستانی بات یہ اپنائی کہ بیوی کی طرف سے بے اعتنائی برتنا شروع کردی۔ ہماری زبان میں (TAKEN FOR GRANTED) کے لئے معلوم نہیں کیا محاورہ استعمال کرتے ہیں۔ (مولوی عبدالحق صاحب ہوتے تو وہ ضرور کچھ بتاتے) میں نے کسی زمانہ میں یہ فقرہ پڑھا تھا۔ کہاوت ہے کہ جس کو پسند کرتے ہیں اس کو زیادہ جھٹکائیاں دیتے ہیں۔ اب یاد نہیں کس ضمن میں پڑھا تھا لیکن کچھ ایسا حال ہوا کہ اپنی لاتوجہی کا احساس مدھم پڑھتا گیا میرا مطلب یہ نہیں کہ میری زندگی اوباش قسم کی ہوگئی۔ ہاں اس میں کچھ اچاٹ پن کا احساس ابھر آیا تھا۔

جنسی فتوحات کی لت جوئے کی لت سے بہت زیادہ مختلف نہیں دونوں میں ایک ہیجانی کیفیت ہوتی ہے۔ جنسی فتح سے انسان کو اپنی انا کی تسکین کے ساتھ اپنی فوقیت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ وہ دوسروں کی حسیات کو بھی نظر انداز کرتا جاتا ہے۔ اب کسی کی شخصیت نازک کرچیوں کا پھیلاؤ ہی تو ہوتی ہے۔ ہوش جب آیا، تو دیکھا کہ بیوی کی ذات

کا آبگینہ ٹوٹ چکا تھا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اچھی بھلی
شادی کی دیوار کو اپنے ہاتھوں سے پھوڑا۔ خیر یہ سب بقول
میرے دوست ( HAROLD LANG ) کے
" PART OF THE RICH TAPESTRY
OF LIFE " ہے۔

ضیاء محی الدین کا خط،

" سرور کا خط بھی تمہارے خط کے ساتھ ہی ملا ہے۔
اور بچوں کے دو ( SNAP. ) بھی۔ می نوس اب ماشاءاللہ
بھاگ دوڑ کرنے لگا ہے۔ اور ننھے رشا میاں بھی میرنگ کی طرح
اس کے پیچھے تصویر میں بگل بجاتے آرہے ہیں۔ اللہ تم سب کو
امان میں رکھے "

( خادم محی الدین کا خط ضیاء محی الدین کے نام )
۱۲-۷-۶۳ کا خط

" میری پہلی شادی ۱۹۵۸ء میں ہوئی۔ ان سے میرے دو
بیٹے تھے بڑا لڑکا پاکستان میں پیدا ہوا، گو یا لوگ کوشش
یہ کرتے ہیں کہ ولایت میں بچہ ہو تا کہ اُسے ساری زندگی کی سہولتیں
میسر آسکیں مگر وہ خاص طور سے بچہ جننے پاکستان آئیں اور جس
کا خمیازہ وہ لڑکا ( مینوس ) بھگت رہا ہے۔ یعنی وہ وہاں جاتا
ہے تو مشکل . . . . یہاں رہے تو "

"میری پیاری سرور سلامت رہو، آپ کا خط اور بچوں کی تصویریں پاکر بے حد خوشی ہوئی۔ خدا کا شکر آپ خیریت سے ہیں۔ آپ تو بڑی اچھی اُردو لکھ لیتی ہیں۔ میں اب نظر کی کمزوری کے سبب کچھ بھی لکھ پڑھ نہیں سکتی۔ میرا پیارا امی نوس اب خدا کے فضل سے سیانا نظر آتا ہے۔ لیکن بنتے ریشا کچھ اچھی طرح پہچانے نہیں گئے۔

شاید اگلی تصویروں میں جو آپ روانہ کریں گی ان کی شکل صورت زیادہ صاف دکھائی دے۔ ہم نے گرمی کا یہ موسم بڑی تکلیف سے گزارا ہے۔ اب کچھ موسم پھرنے لگا ہے۔ میری پیاری سرور آپ لوگ کب تک پاکستان آئیں گے۔ آپ سب سے ملنے کو جی بہت چاہتا ہے۔ کیا میرے پیارے ضیاء میاں کو آنے کی فرصت ملے گی۔ خدا ان کے کام میں ترقی اور برکت دے۔ بچوں کو بہت بہت پیار۔ تصویروں کا شکریہ۔ میرے ضیاء کو بہت بہت پیار۔ آپ کی دعا کرنے والی والدہ۔ بیٹی زیادہ نہیں مہینے کے بعد آپ ایک خط ضرور لکھ دیا کریں۔ نہایت تاکید ہے۔ بڑی مہربانی ہوگی۔

(والدہ ضیاء کا خط ضیاء کی بیوی کے نام)

۵-۹-۶۳

"میرے جان سے پیارے ضیاء۔ تمہارا خط ملا شکر ہے کہ بھولی ہوئی ماں یاد آئی۔ یہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ تم نے گھر خرید لیا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ تم اپنا قرضہ اتار دو۔ میرے

پاس جو کچھ ہے وہ آ کر لے جاؤ اور قرضہ اتار دو۔ تمہارے گھر کی
پوری خوشی مجھے جب ہوگی۔ میں نے سب وکیلوں سے پوچھ لیا
ہے وہ کہتے ہیں جب تک تم زندہ ہو جس کو چاہو دے سکتی ہو
میرے مرنے کے بعد حصے ہوں گے دو حصے تمہارے اور تیسرا
حصّہ بہنوں کا ہے۔ میں تو تمہیں بھیج نہیں سکتی تم آ کر لے سکتے
ہو۔ نہیں تو مجھے کوئی ترکیب لکھ دو۔ میں بھیج سکوں۔
بچوں اور بہو کو دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ مگر میری
خوشی پوری نہیں ہوئی۔ وہ میرے پاس تو آتے نہیں دور سے
دیکھ کر رونے لگتے ہیں۔ ان کو تھوڑا بہت اپنی زبان بھی سکھاتے
وہ صرف انگریزی میں بولتے ہیں بس سب کچھ ٹھیک ہے خدا انہیں
زندگی دے اور خوش رکھے۔ کچھ دنوں کے بعد شاید مانوس ہو جائیں
کبھی کبھی اپنی بہنوں کو جواب دے دیا کرو۔ اس طرح مناسب
نہیں ہے کبھی تو ان کے خط کا جواب دے دیا کرو۔ باپ تو
نہیں رہا وہ تم سے بہت توقع رکھتی ہیں کہ کبھی ہمارا بھائی بھی لکھے
دنیا کے کام تو ہوتے ہی رہتے ہیں کام سے ہی انسان زندہ ہے
اسحاق صاحب ۲۶ تاریخ کو جا رہے ہیں۔ ان کے آتے تک
میں کراچی میں رہوں گی۔ میری دعا ہے کہ خداوند کریم تمہیں ہر وقت
خوش رکھے اور تمہارے کام میں برکت دے۔ تمہاری دعا کرنے
والی ماں۔"

(والدہ ضیاء کا خط ضیا محی الدین کے نام)
۲۰ راکتوبر، کراچی

مہرباں ہے فلک

# اے پیسج ٹو انڈیا

اے پیسج ٹو انڈیا ۱۹۶۰ء میں ڈونمر پروڈکشن لمیٹڈ نے ای ایم فارسٹر کے شہرہ آفاق ناول اسٹیج کرنے کا پروگرام بنایا۔ بعد میں اس ڈرامہ پر فلم بھی بنی۔ اس میں مرکزی کردار ڈاکٹر عزیز کا تھا جس کے لئے ضیا محی الدین کو منتخب کیا گیا یہی وہ ڈرامہ ہے کہ جس نے ضیاء کی شہرت کو آسمان پر پہنچا دیا اور ضیاء ایک انٹرنیشنل اداکار کی حیثیت میں پہچانے گئے۔

اے پیسج ٹو انڈیا" اینگلو انڈین ادب کے صحرا میں ایک نخلستان کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ناول اپنے خلوص، محبت اور فن کا ایسا مظاہرہ ہے۔ جو صدیوں کے بعد ظاہر ہوتا ہے۔ اس میں انگریزوں اور انگریزی ہندوستان کی بڑی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے اور ساتھ ہی ہندوؤں اور خصوصاً مسلمانان ہند کی بڑی خوبصورت تصویر کشی کی گئی ہے۔ اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے ان تعلقات کا ذکر ملتا ہے۔ جو وہ انگریزوں کے ساتھ روا

---

یہ فلم حال ہی میں بنائی گئی ہے۔ DAVID LEAN/ والی

رکھے ہوئے ہیں۔ یہ ناول کوئی مسئلہ حل تو نہیں کرتا مگر ہندوؤں مسلمانوں اور انگریزوں کی توجہ ضرور اس طرف مبذول کراتا ہے جو تقسیم ہند سے قبل ہندوستانی معاشرہ کا خاصہ تھی۔ ای ایم فارسٹر نے محض فضا میں باتیں نہیں کی ہیں بلکہ اس نے اس وقت کی اصل زندگی کو ہمارے سامنے بے نقاب کیا ہے اس ناول کا مرکزی تھیم، رنگ ونسل کا امتیاز ہے اور رنگ ونسل کے تصادم کو انہوں نے بہت ہی دلفریب انداز میں نمایاں کیا ہے اور چونکہ تصادم بہت زوردار ہے اس لئے اس ناول پر مبنی ڈرامہ بھی بہت HIT ہوا ہے۔

## پلاٹ

اس ڈرامہ کا پلاٹ بہت ہی سادہ ہے مسز مور اور ایڈلا کیوسٹیڈ چندر پور میں رونی کو ملنے کے لئے آتی ہیں۔ رونی چندر پور میں مجسٹریٹ ہے۔ ان دونوں کا خیال ہے کہ اس کے ذریعہ وہ انڈیا کو دیکھ سکیں گی۔ مس کیوسٹیڈ ایک مخلص مگر سادہ لوح لڑکی ہے جسے اینگلو انڈین معاشرہ اور ہندوستان کا کوئی علم نہیں اس کا خیال ہے ہندوستان کو سمجھنے کے لئے ہندوستانی لوگوں سے ملنا چاہئے یہ وہ بات ہے جو برٹش حکمرانوں نے کبھی بھی ہندوستان میں روا نہیں رکھی۔ انگریز ہندوستان کے ایسے حکمران تھے جو مقامی لوگوں سے ہمیشہ ہی علیحدہ رہے ہیں۔ ان کی زندگی دفاتر یا کلبوں تک محدود رہی ہے۔ ان کا مقامی لوگوں سے ملنا جلنا نہیں اور مقامی

لوگ بھی انہیں شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس طرح شک کی فضا ہی ہر طرف نظر آتی ہے۔ مقامی گورنمنٹ کالج کا پرنسپل فیلڈنگ اینگلو انڈین معاشرہ کی اس اقدار سے نالاں ہے اور مقامی لوگوں کے لئے ہمدردی کا جذبہ رکھتا ہے اتفاق سے مسز مور کی ملاقات ایک شب مسجد میں ڈاکٹر عزیز سے ہوتی ہے۔ ڈاکٹر عزیز سول سرجن میجر کیلنڈر کے اسسٹنٹ ہیں ڈاکٹر عزیز ایک مہذب اور حساس نوجوان ہے جسے یہ احساس ہے کہ اس کے بزرگ اس ملک کے حکمران تھے۔ گورنمنٹ کالج میں پرنسپل فیلڈنگ کے ہاں ڈاکٹر عزیز کی ملاقات مسز مور اور مس کیوسٹیڈ سے ہوتی ہے۔ اور ڈاکٹر عزیز اپنی وضع داری اور خلوص کی وجہ سے انہیں پکنک کے لئے مدعو کرتا ہے جسے مسز مور اور مس کیوسٹیڈ اور پرنسپل فیلڈنگ اور ان کے نائب ہندو پروفیسر گوڈبال منظور کر لیتے ہیں یہ پکنک مالابار کے غاروں میں ہونا قرار پاتی ہے۔ مس کیوسٹیڈ مالابار غاروں کی ECHO کو سمجھ نہیں پاتی ہے۔ (HALLUCINATION) کا شکار ہو کر ڈاکٹر عزیز پر اپنی بے عزتی کا الزام لگاتی ہے۔ ڈاکٹر عزیز معصوم ہیں۔ مگر پکنک سے واپسی پر ڈاکٹر عزیز کو RAPE کے الزام میں گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ اور اس طرح ایک نئے قسم کا CRISES پیدا ہوتا ہے۔ اور رنگ ونسل کا تصادم چاندپور کی بستی میں نمایاں ہوتا ہے۔ انیگلو انڈین کالونی میں سوائے پرنسپل فیلڈنگ کے کوئی بھی مقامی لوگوں سے ہمدردی نہیں رکھتا

پرنسپل فیلڈ نگ کو ڈاکٹر عزیز کی معصومیت اور بے گناہی کا پورا یقین ہے اور وہ اس کے لئے ہر قسم کی گواہی دینے کو تیار بھی ہے ڈاکٹر عزیز کو ایک ہندو مجسٹریٹ ( TRIAL ) کرتا ہے مس کیوسٹیڈ گواہی کے موقعہ پر اس بات کا اعتراف کرتی ہے کہ اسے محض بدگمانی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر عزیز اس میں ملوث نہیں ہیں۔ یہاں ایک نیا تصادم پیدا ہوتا ہے وہ انگریز جو مس کیوسٹیڈ کے اس کیس کو پوری طرح PROTECTION دے رہے تھے اب اس سادہ لوح لڑکی کو اکیلا چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ اس کی وجہ سے ان کی بہت بڑی بے عزتی ہوتی ہے۔ اس موقعہ پر پھر پرنسپل فیلڈ نگ آگے آتا ہے اور اس بے سہارا لڑکی کو پناہ دیتا ہے۔ ڈاکٹر عزیز اس پر اپنے دوست فیلڈ نگ سے بدگمان ہو جاتا ہے۔ وہ تمام انگریزوں سے بدگمان ہو چکا ہے چاندپور کی ملازمت چھوڑ دیتا ہے اور کسی مسلم ریاست میں چلا جاتا ہے۔

ای ایم فارسٹر کے ناول " اے پیسیج ٹو انڈیا " کی ڈرامائی تشکیل سانتا راما راؤ نے کی ہے۔ یہ تین ایکٹ کا ایک ڈرامہ ہے پہلے ایکٹ میں پرنسپل فیلڈ نگ کا ڈرائنگ روم دکھایا گیا ہے جہاں مسٹر فیلڈ نگ نے مسز مور اور مس کیوسٹیڈ کے علاوہ ڈاکٹر عزیز اور پروفیسر گوڈ بال کو مدعو کیا ہوا ہے۔ ڈاکٹر عزیز اور مسٹر فیلڈ نگ کی گفتگو ملاحظہ ہو۔

فیلڈ نگ :۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ بحیثیت مسلم " برج پارٹی "

میں نہیں جاتے ۔

عزیز :۔ ہم مسلمان تاش نہیں کھیلتے ہیں ۔

فیلڈ نگ :۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ اس قسم کی برج نہیں ہے ۔ برج پارٹی دراصل مسٹر ٹرٹن، کمشنر چندر پور، مشرق اور مغرب کے درمیان اختلاف کو پر کرنے سے مراد لیتے ہیں ۔

ڈاکٹر عزیز :۔ اچھا تو یہ برج پارٹی ایسی ہے، بہت اچھا اگر ہم اس میں شریک نہیں ہوتے ۔ میرے دوست کہتے ہیں کہ ہم ان انگریزوں سے سوائے نفرت اور گالیوں کے کیا حاصل کر سکتے ہیں ۔ کیونکہ انہیں ہمارے رسم ورواج اور تہذیب سے کوئی ہمدردی نہیں اس لئے اس میں شریک ہونے سے فائدہ ۔

فیلڈ نگ :۔ ہو سکتا ہے کہ (انگریز) اس میں مخلص ہوں ۔

ڈاکٹر عزیز :۔ مجھے معاف فرمائیں ۔ مسٹر فیلڈ نگ مجھے آپ سے اختلاف ہے دوستی ممکن ہو سکتی ہے ۔ ممکن کیا ضروری ہے لیکن انگریز اور ہم، تیل اور پانی کی طرح ہیں ۔ ہم مل نہیں سکتے ۔ ہمارے اپنے سیاسی اختلافات ہیں ۔ انہیں ہماری خوراک اور ہمارے رسم ورواج پسند نہیں ہم آپ کے انداز پسند کرتے ہیں ۔ لیکن آپ ہمیں بیک ورڈ تصور کرتے ہیں ۔

فیلڈ نگ :۔ مگر میں نے برج پارٹی میں ایسی دوستی کا نہیں سنا ۔

ڈاکٹر عزیز :۔ میرے دوست دانا ہیں جب وہ کہتے ہیں کہ ایسی برج پارٹیوں میں نہیں جانا چاہیئے ۔ البتہ مجھے انگلش کلب میں جانے کا اشتیاق ہے جہاں ہم جا نہیں سکتے ۔

فیلڈنگ :۔ آپ ان کلبوں کو انتہائی بور پائیں گے۔ بلیرڈ، ٹینس، شراب کا دور آپ ایسے انتہائی غیر انسانی تصور کریں گے۔ بس دور کے ڈھول سہانے ہیں۔

ڈرامہ کے دوسرے ایکٹ میں دو منظر ہیں پہلے منظر میں ایک پہاڑ کے قریب پکنک پارٹی کا اہتمام ہے۔

ڈاکٹر عزیز :۔ آخر کار ہم یہاں پر آہی گئے ہیں۔ اور ہم مشہور مالا بار غاروں کو دیکھ رہے ہیں۔ مسز مور اور مس کیوسٹیڈ۔ کیا یہ دبدبہ والا اور شاندار نظارہ نہیں؟ خوش آمدید مالا بار۔

مس کیوسٹیڈ :۔ ایسا دکھائی پڑتا ہے۔ کہ ہمیں ایک عجیب وغریب نظارہ نظر آرہا ہے۔

ڈاکٹر عزیز :۔ مسز مور کیا سفر آرام دہ تھا نا؟

مسز مور :۔ بے شک آرام دہ تھا۔

مس کیوسٹیڈ :۔ میں اس نظارہ کو کسی قیمت پر بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ مجھے مسٹر فیلڈنگ پر افسوس ہے کہ انہوں نے گاڑی کو مس کر دیا۔ اب معلوم نہیں دوسرا موقعہ کب آئے گا۔

مسز مور :۔ کوئی بات نہیں وہ دوسری گاڑی میں آجائیں گے۔

مس کیوسٹیڈ :۔ مجھے اس کا افسوس رہے گا۔ کہ آپ نے ہماری وجہ سے اپنا پروگرام تبدیل کیا۔

ڈاکٹر عزیز :۔ نہیں نہیں! میں خود خواہش مند تھا دوست کے ہاں تو جب چاہوں جا سکتا ہوں۔ آج ہی دوست کا خط ملا ہے۔ اس کے جانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

مس کیوسٹیڈ :۔ لیکن میں تو شرمندگی محسوس کر رہی ہوں۔ کہ آپ نے یہ
سب کچھ ہمارے لیئے کیا ہے۔

ڈاکٹر عزیز :۔ مس کیوسٹیڈ۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ میری زندگی
کی سب سے بڑی خواہش پوری ہو رہی ہے۔ کہ آپ دونوں میری
مہمان ہیں میں اپنے آپ کو شہنشاہ بابر تصور کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر عزیز :۔ ہاں تو مسز مور اور مس کیوسٹیڈ کیا آپ کو پہلی غار پسند
آئی۔ بڑا ہی عجیب وغریب نظارہ ہے اور بڑی ہی نادر قسم کی گونج
غار کے قریب سنائی دیتی ہے۔

مس کیوسٹیڈ :۔ بہت ہی عجیب وغریب!

ڈاکٹر عزیز :۔ آیئے اب ہم اگلی غار میں چلتے ہیں۔ یہ بہت ہی دلچسپ
ہے۔ گائیڈ مجھے بتا رہا تھا کہ یہ اندر سے پالش کی ہوئی ہے اور شیشہ
کی طرح چمک رہی ہے۔ آیئے مسز مور

مس کیوسٹیڈ :۔ ڈاکٹر عزیز کیا آپ کی شادی پہاڑوں پر ہوئی تھی۔

ڈاکٹر عزیز :۔ ہندوستان میں ایسا نہیں ہوتا۔

مس کیوسٹیڈ :۔ آپ کی بیگم کیسی تھیں؟

ڈاکٹر عزیز :۔ وہ ایک شریف خاندان سے تھیں ایک سادہ مسلم خاتون

مس کیوسٹیڈ :۔ اور آپ اپنی شادی سے خوش تھے۔!

ڈاکٹر عزیز :۔ اوں، کیوں نہیں۔ بہت خوش تھا۔ یقیناً" مس کیوسٹیڈ
آپ کو بڑا تعجب ہوگا کہ ہم نے شادی سے پہلے ایک دوسرے
کو دیکھا تک نہ تھا۔

مس کیوسٹیڈ :۔ کیا یہ آپ کے خاندان نے سب کچھ کیا تھا؟

ڈاکٹر عزیز :۔ ہاں، یہ سب بہت اچھا سلسلہ تھا۔
مس کیوسٹیڈ :۔ کیا وہ موسم گرما میں سب کو چھوڑ کر تو نہیں چلی جاتی تھی۔
ڈاکٹر عزیز :۔ میں کبھی کبھی اسے تنگ کیا کرتا تھا۔ مگر وہ صحیح معنوں میں
ایک مغل شہزادی تھی۔ لیکن وہ مجھے چھوڑ کر کبھی نہیں گئی۔
مس کیوسٹیڈ :۔ آپ کتنے خوش قسمت ہیں۔ آپ یقیناً اس کے نہ ہونے
پر افسوس کر رہے ہوں گے۔ کیا آپ نے ایسا ہی شادی کی؟
ڈاکٹر عزیز :۔ ہاں ایک ۔ صرف ایک
مس کیوسٹیڈ :۔ لیکن مسلمان تو چار شادیاں کر سکتے ہیں۔ کیا ایسا نہیں
ہے؟
ڈاکٹر عزیز :۔ (گھبرا کر) آدمی .... کمزور چیز ہے۔
دوسرے ایکٹ، کے دوسرے منظر میں ہمیں پتہ چلتا ہے کہ
ڈاکٹر عزیز کو RAPE کے کیس میں گرفتار کر لیا گیا ہے اور
چاندپور کی انگریز آبادی کلب میں آئندہ کا لائحہ عمل تیار کر رہی
ہے۔ اور ان کے اندر بہت ہیجان ہے بظاہر یہ واقعہ بھی عجیب و
غریب ہے کہ ایک مقامی ڈاکٹر نے ایک حکمران انگریز لڑکی کو
بے عزت کرنے کی کوشش کی ہے کے واقعات
کی روشنی میں ان کا محتاط ہونا لازمی تھا۔
(ڈاکٹر) میجر کیلنڈر : مجھے اس قسم کا کیس یہاں دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا
اور خدا کرے ایسا کبھی کیس نہ آئے، ہندوستان میں بخار ہی ہو سکتا
ہے۔ اور بخار ہی ہونا چاہیئے۔ (مس کیوسٹیڈ) کے جسم پر کچھ کیڑے
مکوڑے دیکھے گئے ہیں۔ اور انہیں ہٹا دیا گیا ہے۔ البتہ وہ دماغی

طور پر پوری طرح صحت مند نہیں ہے۔ اسے خوف سا محسوس ہو رہا
ہے۔ بلکہ اس سے زیادہ کچھ اور ۔۔۔ ہمیں انتظار کرنا ہو گا اور
دیکھنا ہو گا۔ مسز مور شاید آپ کچھ میری مدد کر سکیں مس کیوسٹیڈ
ECHO کی شکایت کرتی ہیں انہیں ایسا احساس ہوتا ہے کہ
اس کا دماغ بھی ایک غار بن گیا ہے۔

مسز مور :۔ ہاں، ایسا تو محسوس ہوتا ہے۔

میجر کیلنڈر :۔ کیا اس کا تعلق غار کے ساتھ ہے۔

مسز مور :۔ ہاں۔ مگر غار کے ECHO کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

میجر کیلنڈر :۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو مجبور کر رہا ہوں۔ مگر مجھے
اس کے متعلق بتایئے۔ کہ میں کچھ اس بچاری کو رہا کر سکوں۔

مسز مور :۔ بوم، کچھ ایسا ہی کہیئے۔ بوم ہی کی آواز واپس آتی ہے۔ اور
ہر طرف بوم بوم ہی سنائی دیتا ہے۔

اے پیسیج ٹو انڈیا کا تیسرا اور آخری ایکٹ، چندر پور کے
مجسٹریٹ کی عدالت ہے جہاں ڈاکٹر عزیز پر RAPE کے کیس میں مقدمہ
چلایا جا رہا ہے۔ ایک مقامی مجسٹریٹ مسٹر داس اس کیس کو سن رہے
ہیں۔ عدالت کا کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ کٹہرے میں ڈاکٹر عزیز ہیں
پولیس کمشنر اپنے کیس کو پیش کرتے ہیں۔

(پولیس کمشنر، میک برائیڈ) :۔ جناب عالی! آج ہم ایک ایسا کیس دیکھ رہے
ہیں جو جرم کے ساتھ بغاوت کا عنصر بھی لئے ہوئے ہے۔ میں مس
کیوسٹیڈ کے سلسلہ میں مختصراً عرض کروں گا۔ یہاں میں اس بات کی وضاحت
کر دوں کہ میں کوئی اخلاقی یا جذباتی اپیل نہیں کروں گا۔ کیونکہ حقیقت

خود ہی اپنے آپ کو بے نقاب کر رہی ہے اس سال کی تین اپریل
کو مس کوسٹیڈ، اور ان کی دوست مسز مور گورنمنٹ کالج کے پرنسپل
مسٹر فیلڈنگ کے ہاں مدعو تھیں۔ اسی جگہ ملزم (ڈاکٹر عزیز) کی ملاقات
پہلی بار مس کوسٹیڈ سے ہوئی۔ اور یہیں سے اس نے اپنے مجرمانہ عزائم
پورا کرنے کا پروگرام بنایا۔ اُس نے مس کوسٹیڈ اور دوسرے مہمانوں
کو مالابار غاروں میں پکنک پر مدعو کیا۔ ہم کیس کے دوران یہ ثابت
کرنے کی کوشش کریں گے۔ کہ ملزم بُرے کردار کا ہے۔
اس کی گرفتاری کے بعد اس کے ہاں سے جو کاغذات ملے ہیں وہ اس
کی ذہنی حالت کی پوری طرح عکاسی کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ وہ
پکنک کے وقت کس قسم کے خیالات ذہن میں رکھے ہوئے تھا۔ یہ
بات بھی عیاں ہے کہ عام طور پر سیاہ فام اقوام جسمانی طور پر گورے رنگ
کو پسند کرتی ہیں

ایک تماشائی :۔ خواہ عورت مرد کی نسبت انتہائی بدصورت ہی کیوں
نہ ہو؟
(قہقہے)

مجسٹریٹ :۔ میں حکم دیتا ہوں کہ اس شخص کو کمرۂ عدالت سے باہر نکال
دیا جائے۔

میک برائیڈ : مسٹر رونی اس بات کی شہادت دیں گے۔ کہ مسٹر فیلڈنگ
کی پارٹی میں بھی ملزم کا انداز بڑا جارحانہ تھا ....

میک برائیڈ :۔ مس کوسٹیڈ غار میں داخل ہوئیں ملزم نے اس کا پیچھا
کیا تاکہ سوچے سمجھے پروگرام کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ وہاں اندھیرا

تھا اس نے اس کی عینک کو پکڑا۔ سٹرپ ٹوٹ گیا اور یہ بھاگ آنے میں کامیاب رہی۔ اور بمشکل سڑک تک آ ئی۔ ہم میجر ڈاکٹر کیلنڈر کو گواہی کے لئے بلائیں گے۔ تو معلوم ہو جائے گا کہ مس کو اسٹیڈ کی کیا حالت تھی۔ جب ملزم کو چندر پور کے اسٹیشن پر گرفتار کیا گیا تو عینک اور ٹوٹا ہوا سٹرپ اس کی جیب میں موجود تھا۔ ملزم دوہری شخصیت کا مالک ہے۔ بظاہر یہ ایک عزت دار شخص نظر آتا ہے۔ بباطن ایسا نہیں۔ اس نے اپنے مہمان کے ساتھ بڑا ہی ظالمانہ سلوک کیا ہے۔ اور اگر آپ حکم دیں تو میں اپنے پہلے گواہ کو طلب کروں۔

(مس کو سٹیڈ تشریف لایئے۔)

میک برائیڈ: مس کو سٹیڈ: میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ کیا ملزم آپ سے مسٹر فیلڈ نگ کے ہاں ملا تھا۔

مس کو سٹیڈ:۔ جی

میک برائیڈ:۔ کیا مالابار غاروں میں پکنک کے متعلق ملزم نے آپ کو مدعو کیا تھا۔

مس کو سٹیڈ:۔ جی اپنے نوکروں اور گائیڈ کے ساتھ۔

میک برائیڈ:۔ کیا یہ حقیقت ہے کہ مسز مور نے پہلی غار کی سیر کے بعد دوسری غاروں کی سیر کو ملتوی کر دیا تھا۔

مس کو سٹیڈ:۔ جی،

میک برائیڈ:۔ کیا آپ اس غار میں اکیلی گئیں۔

مس کو سٹیڈ:۔ ہاں یہ بالکل درست ہے۔

میک برائیڈ :۔ کیا ملزم نے آپ کا پیچھا کیا تھا۔

مس کوسٹیڈ :۔ خاموش رہیں، میں سوچ رہی ہوں۔

میک برائیڈ :۔ کیا ملزم نے آپ کا پیچھا کیا۔

مس کوسٹیڈ :۔ مجھے افسوس ہے۔ میرا مطلب ہے کہ میں غار میں جانے سے پہلے اپنی منگنی اور رونی کے متعلق سوچ رہی تھی۔

میک برائیڈ :۔ اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں یہ کیس سے غیر متعلق ہے۔

مس کوسٹیڈ :۔ دیکھیے یہ تو غیر متعلق نہیں۔ میں ڈاکٹر عزیز سے اپنی منگنی کے متعلق گفتگو کر رہی تھی اور ڈاکٹر عزیز مجھے اپنی شادی کے متعلق بتا رہے تھے۔

میک برائیڈ :۔ ہاں یہ آپ کے کیس کے متعلق ہو سکتا ہے اس سے ملزم کے ذہن کو سمجھا جا سکتا ہے۔ بہرحال آپ یہ بتائیں کہ کیا ملزم نے آپ کا پیچھا کیا ہے۔

مس کوسٹیڈ :۔ کیا میں سوچ سکتی ہوں۔ غور کر سکتی ہوں۔ اب اس کی تصویر میرے ذہن میں آرہی ہے۔

میک برائیڈ :۔ ہاں تو .....

مس کوسٹیڈ :۔ میں نے پا لیا۔ میں نے پا لیا۔ میں ایک چٹان پر چڑھنے والے کی طرح ہوں۔ جس کی رسی ٹوٹ گئی ہو۔ اس آدمی سے محبت نہ ہونی چاہیئے۔ جس سے شادی ہو۔ مجھے یاد آگیا ہے۔ مجھے یاد آگیا ہے۔

میک برائیڈ :۔ مس کوسٹیڈ :۔ کیا یہ آپ کا پیچھا کر رہا تھا یا نہیں ؟

مس کوسٹیڈ :- میں کچھ کہہ نہیں سکتی ۔
میک برائیڈ :- کیا مطلب ۔
مس کوسٹیڈ :- نہیں ۔ ملزم میرا پیچھا نہیں کر رہا تھا ۔
مجسٹریٹ :- ذرا اس بات کو دوہرایئے ۔
مس کوسٹیڈ :- میرا خیال ہے کہ میں نے غلط الزام لگایا تھا ۔ مجھ سے
بھول ہوئی ہے ۔ ڈاکٹر عزیز نے میرا پیچھا نہیں کیا تھا ۔
مجسٹریٹ میک برائیڈ :- آپ اب اپنا کیس واپس لیجیئے ۔ کیا مس
کوسٹیڈ آپ اپنے الزام واپس لیتی ہیں ۔
مس کوسٹیڈ :- ہاں میں اپنا الزام واپس لیتی ہوں ۔
مجسٹریٹ :- ملزم کو بغیر کسی قسم کے الزام کے بری کیا جاتا ہے"۔

اس قسم کا کردار (جیسا کہ ڈاکٹر عزیز کا کردار ہے) عام طور پر ایسے کردار اسٹیج پر ادا کرنے مشکل ہی نہیں بلکہ مسئلہ ہوا کرتے ہیں ۔ ضیاء محی الدین نے جب "اے پیسیج ٹو انڈیا" میں ڈاکٹر عزیز کے کردار کو ادا کیا تو خود ای ایم فارسٹر نے کہا تھا کہ شاید اتنا CLEAR یہ کردار میرے ذہن میں بھی نہ تھا جس طور پر ضیاء محی الدین نے ادا کیا ہے ۔

ڈاکٹر عزیز ایک مہذب اور کلچرڈ انسان ہیں وہ لوگوں کو حافظ، اقبال اور حالی کی غزلیں سنا کر محظوظ کرتے ہیں ۔ اگرچہ یہ مذہبی نہیں ہیں لیکن خوبصورت چیزیں اور خوب صورت مسجد اس کے جذبات کو تحریک دیتے ہیں اور تصورات اُسے اسلام کے اس دور میں لے جاتے ہیں ۔ جب اسلام ایک جذبۂ معرکہ رکھتا تھا اور اس طرح وہ مغل شہنشاہ کو یاد کرتے ہوئے مسرت محسوس کرتا ہے اور

ہندوستان کو اپنا گھر تصور کرتا ہے۔ اُسے اپنے پیشے ڈاکٹری سے محبت ہے اور وہ ایک ماہر سرجن ہے البتہ اُسے غیر معمولی طور پر HYGIENE ہونا بڑا محسوس ہوتا ہے۔ وہ رنڈوا ہے اور اپنی مرحومہ بیوی کی تصویر فیلڈنگ کو دکھاتا ہے ڈاکٹر عزیز کا تصورِ جنس بھی خوب ہے۔ وہ مس کو سٹیڈ کو SEXUAL تصور نہیں کرتا کیونکہ اس کی چھاتیاں نمایاں نہیں ہیں۔ مس کو سٹیڈ کا ایک معمولی سا سوال کہ اس کی کتنی بیویاں ہیں اس کو UPSET کر دیتا ہے TRIAL میں سب سے زیادہ چیز جو اُسے مضطرب کئے ہوئے وہ یہ ہے کہ اُسے RAPE کے جس کیس میں ملوث کیا گیا ہے اُس میں عورت اس قسم کی ہے جس کی کوئی ذاتی خوبصورتی نہیں ہے۔

ضیا محی الدین نے اس کردار کو جس طور ادا کیا اس نے تھیٹر کی دنیا میں ان کے لئے ایک علیحدہ مقام پیدا کیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس ڈرامہ میں کام کرنے کے بعد ان پر فلم اور اسٹیج کے دروازے وا ہی ہوتے چلے گئے۔

اے پیسیج ٹو انڈیا میں انہیں ویسٹ انڈ کا ۱۹۶۰ء کا سب سے ابھرتا ہوا اداکار قرار دیا گیا یہ انتخاب ورائٹی پول کے ذریعے ہوا۔ یہ انعام حاصل کرنے والے ضیا محی الدین پہلے ایشیائی تھے اور ظاہر ہے کہ پہلے پاکستانی بھی۔

76

SAM SPIEGEL'S
PRODUCTION OF
Lawrence
of Arabia

DIRECTED BY
DAVID LEAN

A HORIZON BRITISH
PRODUCTION FOR
COLUMBIA PICTURES

Biography

ZIA MOHYEDDIN

as

TAFAS

Pakistan's most noted actor, Zia Mohyeddin, who makes his motion picture debut with an international all-star cast in "Lawrence of Arabia", can boast a background in show business that might be the envy of entertainers many years his senior.

Born in the historic city of Lahore, Pakistan, in 1930, Mohyeddin studied English Literature and Psychology at the University of Punjab, obtaining his BA degree in 1949, and was doing post-graduate work in Psychology when an opportunity for employment with the Pakistan Broadcasting Service presented itself.

As a writer-producer-director there Mohyeddin achieved an outstanding reputation in the field, and in 1950 was the recipient of a Colombo Plan Fellowship to Australia, to study broadcasting under the Commonwealth Technical Assistance Programme. For 18 months Mohyeddin wrote and produced numerous programmes,

and first discovered his aptitude and love for acting, appearing in several plays.

Returning to England in 1952, he enrolled for intensive dramatic training at the Royal Academy of Dramatic Art, alternating his studieswith frequent appearances on the B.B.C.

At the completion of his training he returned to Pakistan, setting up the first professional theatre in that country, remaining until 1958 when he returned to London to take up his theatrical career in earnest.

While appearing on a BBC TV show, he was spotted by producer Frank Hauser, who signed the talented young actor for the leading male role in the West End hit, "A Passage to India", a part he played until signed by producer Sam Spiegel and director David Lean for his key role in "Lawrence of Arabia" as Tafas, the guide who takes Lawrence to meet Prince Feisal.

Shortly after arriving in Jordan for location filming, Mohyeddin was notified of his selection to appear as Romeo in "Romeo and Juliet" at Stratford's Royal Shakespeare Theatre, the same dramatic mecca where his fellow actor in "Lawrence of Arabia", Peter O'Toole, was launched to stardom last year.

Winner of the "Most Promising Actor of the West End" award for 1960 in a "Variety" poll, Mohyeddin is considered one of the brightest new talents on the theatrical horizon.

* * * *

from HORIZON PICTURES (GB) LTD., 31, DOVER STREET, LONDON, W.1 Hyde Park 9211

# لارنس آف عربیا

اسے پیسیج ملوانڈیا کے فوراً بعد ہم ضیا محی الدین کو SAM SPIEGEL کی پروڈکشن لارنس آف عربیا میں دیکھتے ہیں۔ لارنس آف عربیا کا کردار عالم اسلام کے لئے بالعموم اور پاکستان کے لئے بالخصوص ناپسندیدہ رہا ہے علامہ اقبال نے خلافت کی حمایت میں بے شمار نظمیں لکھیں ہیں جن میں عربوں اور خصوصاً سعودی عربوں کی انگریزوں کی حمایت سے ترکی خلافت کے خلاف بغاوت کو ناپسند کیا ہے۔

بیچتا ہے ہاشمی ناموس دینِ مصطفےٰ
خاک و خون میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

مگر اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ لارنس کی اپنے ملک اور قوم کے لئے نمایاں خدمات ہیں اور آج سعودی عربیا، عراق اور اردن کی حکومتوں کا قیام اسی کا مرہون منت ہے۔

لارنس آف عربیا کا نام تھامس ایڈورڈ لارنس تھا۔ یہ ۱۸۸۸ء میں نارتھ ویلز میں پیدا ہوا۔ بعد میں اس نے فوج کے شعبہ انٹیلی جنس میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۱۴ء میں اس کی ملاقات شہزادہ عبداللہ سے ہوئی جو اس وقت ترکوں سے برسرپیکار تھا۔ عربی شہزادہ عبداللہ کا مرکز مدینہ تھا۔ جہاں مرکز میں شہزادہ فیصل جنگ کو کنٹرول کر رہا تھا۔ آفس گائیڈ کے ذریعے لارنس کی ملاقات فیصل سے ہوتی ہے اور لارنس ہی کے کہنے پر حجاز ریلوے پر حملے کئے جاتے ہیں اور ترکوں کی فوج کو گوریلا انداز سے مشق ستم بنایا جاتا ہے آخر کار جیت عربوں کی ہوتی

ہے اور خلافت عثمانیہ سے سعودی عربیہ، عراق اور اردن علیحدہ ہو جاتے ہیں اور نئی حکومتیں وجود میں آتی ہیں۔

لارنس آف عربیا نے ان واقعات پر مشتمل اپنی سوانح عمری بھی لکھی جسے اُس نے SEVEN PILLER OF WISDOM کا نام دیا لیکن یہی سوانح عمری بعد میں REVOLT IN THE DESERT کے نام سے شائع ہوئی۔

ضیاء محی الدین نے لارنس آف عربیا میں "تافس گائیڈ" کا رول ادا کیا ہے یہی گائیڈ شہزادہ فیصل کا کردار ادا کرتا ہے۔ بلکہ شہزادے کا دستِ راست بھی کہا جا سکتا ہے۔

فلم لارنس آف عربیا پاکستان میں آئی اور پاکستانیوں نے اسے دیکھا اور ضیاء محی الدین کے کام کو بھی پسند کیا۔

"معلوم نہیں فلم لارنس عربیا کب تک RELEASE ہو رہی ہے۔ اور وہ پاکستان میں آئے بھی یا نہیں۔ ہمیں اس کے لیے یعنی تمہارے دیکھنے کی آرزو ہے۔"

(خادم محی الدین کا خط ضیاء کے نام)

۱۱ اگست ۱۹۶۲ء

"LAWRENCE OF ARABIA" IS RUNNING AT KARACHI -. SURAYA AND RAZIA HAVE BOTH ENJOYED IT. IT WOULD BE A DISAPPOINTMENT IF THE FILM IS NOT EXHBITED IN LAHORE. I HEAR THAT IT REQUIRES A MUCH BIGGER SCREEN, WHICH NO CINEMA HERE HAS GOT. ZIA'S ROLE IN IT HAS BEEN ADMIRED BY BOTH THE SISTERS AND OTHERS ALSO WHO SAW IT."

"خادم محی الدین کا خط سرور بیگم ضیاء کے نام"

۱۳/ اکتوبر ۱۹۶۳ء

"تم نے فرانس والی فلم کا نام نہیں لکھا۔ معلوم نہیں ہماری طرف آئے یا نہیں "لارنس آف عربیا" کراچی چل رہی ہے۔ ڈی اور رضیہ دونوں دیکھ چکیں۔ تمہارے پارٹ کی بڑی تعریف کر رہی ہیں۔ سنا ہے کہ اس فلم کا لاہور میں آنا مشکوک ہے۔ کیونکہ یہاں کسی سینما میں اتنا لمبا چوڑا سکرین نہیں ہے۔ جس پر یہ دکھائی جائے ورنہ میں بھی دیکھ سکتا۔ کراچی جا کر دیکھوں۔ تو خرچ بہت سا درکار ہے۔ اس لئے حسرت ہی رہے گی۔ شنید ہے کہ یہاں پلازہ سینما والے اس کے لئے اپنا سکرین وسیع کرنے کی فکر میں ہیں"

(خادم محی الدین کا خط ضیاء کے نام)

۱۷/ اکتوبر ۱۹۶۳ء

" آج کل راولپنڈی میں فلم لارنس آف عریبیہ چل رہی ہے
جس میں آپ کا رول بہت پسند آیا ۔ بار بار دیکھا مگر آپ کی محبت
نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا ۔ اور مجھے یہ پڑھ کر اتنی خوشی ہوئی
جو میں ہی جانتا ہوں ۔ کہ " ضیا بہت ہی ملنسار اور ہینس مکھ
آدمی ہیں "۔ یہ الفاظ ہمارے پاکستان کے مقبول اخبار "جنگ"
کے فلمی نمائندے اے جی راجپوت کے ہیں ۔ جنہوں نے آپ
سے ایک مرتبہ لندن میں انٹرویو لیا تھا ۔ میری عرض یہ ہے
کہ آپ اپنا اچھا سا دستخط شدہ یعنی آٹو گراف والا کوئی فوٹو
بھیجیں اور اگر آپ کے پاس کوئی فلمی پوز ہے تو وہ بھی بھیجیں
تاکہ میں بھی اپنے انگریز دوستوں اور اینگلو انڈین دوستوں
میں فخر سے سر اونچا کر سکوں کہ میرے پاکستانی اور مسلمان بھائی
ضیاء نے اتنی شہرت میں بھی بہترین اخلاق کا مظاہرہ کیا
ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور میری دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ میرے بھائی
جان ضیاء کو ایک ایسا اداکار بنا دے ۔ جس کی مثال دنیا
میں آج تک نہ ہو "

( حمید غنی بٹ کا خط ضیاء کے نام )

۱۳ر جولائی ۱۹۶۴ء

تیرا انتظار جب سے ہے

ضیاء محی الدین نے ایک جگہ کہا کہ باہر رہ کر میں نے محسوس کیا کہ مجھ میں اپنے والد کی ایک بات بھی نہیں آئی ــــ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی ــــ آپ ہزار دُور رہیں۔ پیشے کے اعتبار سے الگ کیوں نہ ہو جائیں مگر یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ آپ میں اپنے باپ کی کوئی رمز نہ دکھائی دے ــــ خادم محی الدین ایک ڈرامہ نگار، استاد، ماہر علم موسیقی تو تھے ہی، مگر ان میں ایک صفت اور بھی تھی اور وہ یہ کہ وہ بیٹے کے بہت بڑے عاشق تھے، شاید اس لئے کہ ضیاء محی الدین ان کے اکلوتے بیٹے تھے۔ ــــ ان کی بیٹے سے محبت بے غرض تھی۔ کوئی ایسی تمنا نظر نہیں آئی کہ انہوں نے بڑھاپے میں مددگار ہونے کو محبت کا یہ انداز اپنایا ہو ــــ ان کے خطوط میں تو ان کی کامرانی کی دعائیں ہی دعائیں دکھائی دیتی ہیں ــــ وہ ضیاء کو کسی دُکھ میں، کسی پریشانی میں، کسی بیماری میں مبتلا نہیں دیکھ سکتے اور اپنی بیماری، پریشانی یا دُکھ کا اظہار اس انداز سے بھی نہیں کرتے کہ بیٹا خط پڑھ کر سوچنے لگے ــــ ہاں ان کے ہر خط سے البتہ اُن کے ڈرامے، فلمیں، اسٹیج کے ہر کام کو دیکھنے کی حسرت دن بدن شدت اختیار کرتی چلی جاتی ہے ــــ اور آخر یہ انتظار بے قراری کی صورت اختیار کر لیتا ہے ــــ بقول امیر مینائی ؎

فرقت میں ایک پل کسی کروٹ نہ تھا قرار<br>
گیا دونوں پہلوؤں میں دلِ ناصبور تھا

پیارے ضیاء سلمہ - تمہاری خیریت کا آخری خط ۲۲ اپریل کا لکھا ہوا ملا تھا۔ اس کے بعد تمہارا کوئی خط نہیں آیا۔ جس سے ہم دونوں کافی پریشان رہے ہیں - یہ تیسرا مہینہ جا رہا ہے۔ تم نے اپنے اسی خط میں اطلاع دی تھی۔ کہ تم اپنے نئے فلیٹ یا مکان میں اپنا سامان لے جانے والے ہو۔ چونکہ اس مکان کا پتہ تم نے نہیں لکھا تھا۔ اس لئے میں انتظار کرتا رہا کہ کب تم اپنے نئے ایڈریس سے خط لکھتے ہو۔ ڈاکٹر واجد صاحب سے خط لکھ کر تمہارا نیا پتہ دریافت کیا۔ ان کا جواب دیر تک نہیں ملا۔ آخر کل انہوں نے جواب دیا۔ کہ ہمیں خود معلوم نہیں۔ البتہ آپ ان سے پرانے ایڈریس پر خط لکھ دیں۔ شہر بانو نے لندن سے واپس آکر یہ اطلاع اپنے ابا کو دی۔ کہ آپ لوگ ابھی تک نئے گھر میں منتقل نہیں ہوئے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے مشورے سے میں یہ خط پُرانے پتہ پہ ہی لکھ رہا ہوں۔ امید ہے کہ تمہیں مل جائے گا۔

یہاں ہم تم سے کوئی مال و دولت یا تحفے تحائف کے خواہاں نہیں۔ فقط تمہاری خیریت کا خط چاہتے ہیں۔ اگر ہمیں اس سے بھی محروم رکھا جائے تو کیا یہ ظلم نہیں؟ ہماری پریشانی کا اندازہ تمہیں کیا ہو سکتا ہے؟ ہر روز سخت گرمی میں دن کے ۲ بجے باہر نکل کر لیٹر بکس دیکھنا اور اسے خالی پاکر منہ کی کھانا۔ نماز میں خدا سے تمہاری سلامتی کی دعائیں مانگنا۔ غرض محرومی اور پریشانی۔ مگر تم اپنی عادت سے مجبور ہو۔ شاید اس کا اندازہ تمہیں جب ہو گا۔ کہ منی نولیس یہاں بڑے ہو کر کسی جگہ اپنے کام پہ لگ جائیں اور تمہیں خط نہ لکھیں۔

والدہ کئی مرتبہ تمہارا خط نہ آنے پر آبدیدہ ہو چکی ہیں۔ ایک دن میں

نے ان کو چھپ کر یہ گانا گاتے سنا۔

رجنڈڑی لٹی میرا یار سجن
کدی موڑ مہار تے آ وطن
ولایت دے پینڈے بھاویں نہیں
ساتوں ضیاء ملے ڈاہڈے ملہنگے نیں
اوہ تاں شوہ دریا دے لاہنگے نیں
کدی موڑ مہار تے آ وطن

---

می نولیس اور اس کے بھائی کو دیکھنے کے لئے دل بہت چاہتا ہے ننھے کی کوئی تصویر ہمیں نہیں ملی۔ ہوسکے تو بھیجو۔ عزیزہ سرور کو بچوں کو ہم دونوں کا بے حد پیار۔

اسحاق ایک ماہ کے لئے جرمنی گئے ہیں۔ وہاں کوئی STUDY کورس ہے۔ ۳ یا ۴ اگست کو واپس آئیں گے۔ والدہ کا دعا اور پیار۔

بندہ خادم

پیارے ضیاء سلمہ، امید ہے میرا پچھلا خط اور علیحدہ لفافے میں دو مضامین ملے ہوں گے۔

میں نے اس خط میں ایک CAUTION لکھ ڈالی۔ امید ہے تم نے برا نہ مان لیا ہوگا۔ اگر تم اس سے کبیدہ خاطر ہوئے تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوا معذرت کرتا ہوں۔ میرا مدعا تم تینوں کی خوش حالی اور صحت کی برقراری کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

اگر وہاں کیو با کے حالات نازک صورت اختیار کر رہے ہوں (خدا نہ کرے ایسا ہو) تو تم یہاں اپنے گھر کیوں نہ لوٹ آؤ۔ کم از کم تھوڑے عرصے کے لئے ہی سہی۔ اگر حالات درست ہیں تو خیر۔ ہم تو تمہاری سلامتی کے لئے دعا گو رہتے ہیں۔

گلے کی جو تکلیف تمہیں سال بہ سال یا ہر چھ ماہ بعد ہو جاتی ہے اس کے لئے گلے کا معائنہ کرا کر آپریشن کیوں نہ کرالو۔ یہ آپریشن ہلکا سا ہے۔ چار پانچ روز کی تکلیف ہوگی۔ امریکہ میں تو اچھے سے اچھے ماہر خصوصی ڈاکٹر ہیں۔ اور علاج کے لئے لوگ دور کے ملکوں سے وہاں آتے ہیں۔ آخر تمہارا کام اسٹیج پر بلند آواز سے بولنے کا ہے۔ عین کسی ڈرامے کے وقت پر جس میں تمہارا پارٹ ہو۔ یہ دورہ پڑ جائے۔ تو تمہیں مایوسی ہوگی۔

رضیہ ابھی یہیں ہے اور اپنا ٹانگ کے درد کا علاج کرا رہی ہے۔ ابھی اسے تین ہفتے اور ٹھہرنا ہے تاکہ مکمل صحت ہو جائے۔ تمہیں اور سرور، می نو س کو ہم سب کی طرف سے پیار۔ والدہ دعا کہتی ہیں۔ خیریت سے جلد اطلاع دو۔

خط لکھ کر بند کر چکا تو تمہارا ۲۲ر اکتوبر کا خط پہنچا۔

ڈاکٹر وحید، فیروز سنز کے مالک ہیں اور میرے مہربان۔ مجید سے بعض دفعہ فرمائش کر کے مضمون لکھواتے ہیں۔ خدا کرے جنگ رک جائے۔ ابھی تو U. THANT کے مشورے سے دونوں شبیر غرّانے کی بجائے چپ سادھ گئے ہیں۔

پرسوں ۲۶ر اکتوبر کو ہمارے می نوس کی سالگرہ تھی۔ حمیدہ رضیہ دونوں یہاں ہیں۔ اور کہہ رہی ہیں کہ تم سب یہاں ہوتے تو ہم اس سالگرہ کو دھوم دھام سے مناتے۔ چراغ جلاتے۔ اچھا خدا اسے پروان چڑھائے اور عزیزہ سرور بھی بخیر و خوبی فروری میں فارغ ہوں۔ زیادہ دعا۔

پیارے ضیاء سلمہ - تمہارا اور عزیزہ سرور کا خط دونوں ملے اور حالات پڑھ کر ہماری تسکین ہوئی۔ مصروفیت بجا لیکن والدہ کی مامتا اور بوڑھے ابّا کی محبت کا بھی خیال رکھا کرو۔ دو چار سطریں اپنی خیریت کی لکھ دینے میں کون سا زیادہ وقت لگتا ہے۔

براڈوے میں تمہارے اپنے لکھے ہوئے ڈراموں کو پیش کرنے کی خبر موجب مسرت ہے۔ جب یہ وہاں کے تھیٹر میں پیش ہوں۔ تو ان کے متعلق اطلاع دینا اور متعلقہ اشتہار بروشر وغیرہ بھی بھیجنا۔

سرور نے بچوں کے SNAPS بھیجنے کا وعدہ خط میں کیا ہے دیکھیں کب پورا ہوتا ہے۔

یہاں کے حالات بدستور ہیں۔ گھر کے ارد گرد اور نئے بنگلے تعمیر ہو رہے ہیں۔ اور ہماری پر لطف تنہائی اور سکون ملیامیٹ ہو رہا ہے۔ شور شرابے میں پڑھنا لکھنا بھی مشکل ہو گیا۔ اب یہ تمام علاقہ شہروں کی گلیوں جیسا ہوتا جا رہا ہے۔ جی یہاں سے اچاٹ ہے۔ مگر جائیں تو کہاں؟

بقول غالبؔ ؎

وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

شاعرانہ طبیعت خدا کسی کو نہ دے۔

انسان کو دنیا میں THICK SKINNED ہو کر رہنا چاہیئے

فرانس میں کون سی فلم بن رہی ہے اور اس میں تمہارا کیا ROLE ہے اس کا نام ہی لکھ بھیجو کہ بشرطیکہ زندگی یہاں آئے۔ تو جا کر دیکھ ہی آئیں

لارنس عربی اب تک تو پاکستان میں نہیں آئی۔ شاید ہندوستان پہنچی ہو۔

آج کل یہاں گرمی شباب پر ہے۔ اور ہم دونوں کے جسم گرمی دانوں (پیت) سے اٹے پڑے ہیں۔ راتیں قیامت کی آتی ہیں جب کہ ہوا بند اور حبس کا سامنا ہوتا ہے۔ اس پر مچھر مسہری میں دم گھٹتا ہے۔ پنکھا چلائیں تو ہوا گرم۔ نہ دن کو چین نہ رات کو آرام۔ امیر مینائی نے خوب ہماری حالت بیان کی ہے۔

دن میرا روتا ہے میری رات کو
رات میری روتی ہے دن کے لئے

میں اس زار نامی سے تم کو پریشان کرتا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن آزردگی بڑھ جائے تو چیخ پکار ہی کرنی پڑتی ہے۔ کیا والدہ کے لئے ایک عدد EGG WHISK کسی کے ہاتھ خرید کر بھیج سکو گے؟
بچوں کو بیحد پیار۔ تم سب کو والدہ دعا اور پیار کہہ رہی ہیں۔

بندۂ خادم

۸ر نومبر۔ ۸ بجے صبح۔ ابھی ابھی کراچی کال کرنے پر تمہارا تار کا مضمون ملا۔

میرے پیارے ضیاء، موڈل ٹاؤن اباجی کی میز سے بیٹھی۔ یہ خط لکھ رہی ہوں کل صبح ، بجے اباجی یونیورسٹی میوزک کا بی اے کا پرچہ لینے جا رہے تھے۔ حسب معمول اپنے سارے لوازمات کے ساتھ کل انہوں نے اپنا کالا سوٹ پہنا۔ اور ٹائی بھی لگائی۔ اماں سے کہتے گئے۔ میں ۱۱ بجے تک آجاؤں گا۔ میرا شوربہ تیار رہے۔ ڈبل روٹی میں لیتا آؤں گا۔ ۷ بجے کی بس کے لئے تقریباً ۶½ ہی سٹینڈ پر چلے گئے۔ شیڈ پر چار طالب علم اور دو ہمسایہ عورتیں تھیں۔ بس جی بلاک پہنچی بھی نہیں۔ اباجی شیڈ سے اٹھ کر سڑک کے الٹی طرف جا کر کھڑے ہو گئے۔ ان طالب علموں نے کہا کہ پروفیسر صاحب پہلے چلے گئے اتنے میں انہوں نے دیکھا کہ اباجی کا سر ڈھلک گیا ہے۔ انہوں نے کہا آج یہ کیسے کھڑے ہیں۔ دو تین لمحوں کے اندر وہ دھڑام پورے FORCE سے گر گئے۔ اور ان کا ہارٹ فیل پہلے ہوا ہے۔ آنکھ کے پاس دائیں طرف جہاں آنکھ ختم ہوتی ہے۔ اس شکل میں خاصا گہرا زخم لگا مگر خون نہیں بہا۔ اماں ابھی کھانے والے کمرے سے صحن تک جا کر اپنے کام سمیٹ رہی تھیں۔ کہ برکت "کھوکھے والا"، اس کا بیٹیا ' حجام احمد جو ہمیشہ اباجی کے بال کاٹنے آتا ہے۔ اور نواب ہمسائی کے دو

نوکر چارپائی پر اٹھا کر نہیں لائے کواڑ زور سے پیٹا۔ اماں نے کہا کون ہے
کہنے لگے گھبرائیں نہیں۔ طبیعت کچھ خراب ہے ابھی ٹھیک ہو جائیں گے
ڈاکٹر کو بلایا۔ دو ڈاکٹر آئے۔ اماں نے دیکھا۔ ماتھا گرم ہے۔ گال تھپکائے
بولو بولو کیا ہوا۔ ڈاکٹر کہنے لگا ہارٹ فیل ہوا ہے تو اماں اتنی بھولی ہیں۔
کہنے لگیں کوئی نئی بیماری ہے پھر کوئی ٹیکا لگا دو۔ کوئی دوا دے دو۔ جب انہیں
بتایا۔ ابا جان ختم ہو گئے ہیں۔ تو بیہوش ہو گئیں۔ پاس صرف ہمسائے تھے
ہوش آیا تو کسی کا پتہ معلوم نہ تھا۔ لفافوں پر باجی سے پتہ لکھوا رکھا کرتی
تھی۔ تین لفافوں پر آپا، باجی اور چھوٹی آپا کا پتہ ملا۔ انہیں تاریں اور
پیغام بھیجے۔ آپا ۱۲ بجے پہنچ گئیں۔ باجی صبح آ گئی۔ میں نے ۹ بجے فون تسیم
صاحب کا RECEIVE کیا۔ تو کہنے لگے ابی آج پھر ایک SAD
خبر ہے۔ ابا جی فوت ہو گئے۔ میں نے کہا کس کے ابا جی۔ کہتے ہیں آپ کے
میں تو کچھ بھی سن نہیں سکی ٹیکسی لے کر ہمشیرہ کے ہاں گئی۔ چاروں لاہور کی FLIGHTS
پوری پوری جا رہی تھیں۔ ایک بجے بیگم پہنچی اس سے ذکر ہوا اس کے کوئی
جاننے والے نے ۲۰ منٹ FLIGHT رکوا کر ہمیں مجھے اور ہمشیرہ کو باقاعدہ
دھکے دے کر سوار کرا دیا۔ ہم لوگ ۵ بجے شام بیکہ رات کو پہنچے ڈرائنگ
روم میں ابا جی بالکل سوتے لگتے تھے تازہ تازہ چہرہ آنکھیں بند۔ ایک دم
سے خیال آیا۔ اتنا شور ہے اٹھ جائیں گے۔ پیروں کو چھوا۔ ماتھے پر ہونٹ
لگائے۔ ابا جی بولو۔ نہیں بولتے تھے۔ پاتھو اور ایوب نے ٹائی کوٹ پتلون
اتروائے۔ اماں اتار نے نہیں دیتی تھیں۔ سامنے والا وفا ر آ کر لپٹ گیا۔
الگ ہونے نہیں دیتا تھا۔ تھیلے میں، پانی تھرمس میں تھا۔ پین، گھڑی، عینک
جو ایک طرف سے ٹوٹ گئی۔ پرچہ SEALED جو دنیا تھا پرسوں

جا کر بیلیں لگوا کر آئے تھے۔ سخت EXCITED تھے کل ۱۰ بجے یونیورسٹی سے آدمی آیا کہ سٹوڈنٹ بیٹھے ہیں۔ پروفیسر صاحب پہنچے کیوں نہیں۔ رشید صاحب کی فیملی حسب معمول بیٹھی تھی۔ اور اباجی کے گرد یوں چکر لگا کر بیٹھی تھیں۔ ہم لوگ TOUCH بھی کریں تو فوراً کہیں مت ہاتھ لگاؤ۔ اباجی بالکل سرد تھے۔ ان کی ٹوپی سے ان کے FLESH کی خوشبو آرہی ہے۔ ہمشیرہ کہتی ہیں کہ کراچی LAWRENCE دیکھنے آرہے تھے۔ یعنی تمہیں دیکھنے۔ وہاں میوزک کی SITTINGS ہو رہی تھیں کہتے تھے اباجی کے آنے تک ملتوی رکھیں گے۔ اماں نے کل رات تک ایک بوند نہیں پی تھی۔ میں نے زبردستی چائے پلائی۔ بسکٹ کھلایا۔ کہنے لگیں میں مر نہیں جاتیں۔ اگر مجھے رونا نہیں آتا۔ میرا حلق بند ہے۔ پھر ایک دم رونے لگیں۔ میرا ساتھی چلا گیا ہے۔ مجھ سے کہتا تھا تم نہ ہو تو میں زندہ ہی نہ رہ سکوں۔ اب میں جی کے کیا کروں گی۔ پھر زمین کو چھو کر کہیں یہ اتنی ٹھنڈی ہے دری بچھا کر بیٹھتے تھے۔ ریڈیو کے پاس حقہ ادبی دنیا۔ P.G.WOODHOUSE کی نئی کتاب ہر جگہ کمرے میں کپڑے لٹکے ہیں۔ سلیپر کھڑے ہیں کھڑاویں رکھی ہیں پان کا ڈبیا میں رکھے ہیں۔ تمہاری تصویریں ہر کمرے میں لٹک رہی ہیں۔ وقار کی اماں کہتی ہیں۔ ضیاء کے بغیر بہت اداس تھے۔ ایک بار اسے مل لینے کو پھر جی چاہتا ہے۔ چچا جی کی قبر کے تقریباً ساتھ ہیں۔ اتنی لمبی قبر ہے میں ابھی آئی ہوں۔ پھول پڑے ہیں اتنے لوگ بیٹھے ہیں۔ مگر اباجی کہیں نہیں۔ اماں کہتی ہیں۔ ضیاء کو اطلاع نہ دو۔ میں نے کہا میں تو تار بھیج کر آئی ہوں۔ باقی آئندہ خط لکھو۔ میں چند دن یہاں ہوں۔ اماں کو خط لکھو۔ بڈ۔ پیار کے ساتھ

(ضیاء کی ہمشیرہ کا خط ضیاء محی الدین کے نام)

# MUSIC CRITIC AND DRAMATIST

—:o:—

## Late Prof. Khadim Mohyeddin

**By a Staff Reporter**

Professor Khadim Mohyeddin a prominent music critic, dramatist and educationist, died of heart failure in Lahore on Thursday at the age of 75.

He collapsed when he was waiting for a bus in Model Town on his way to the city where he was to conduct the Examination in Music of the Board of Secondary Education

Prof. Mohyeddin was a father of Mr. Zia Mohyeddin, the famous Pakistani actor-producer, who has performed in "Passage to India" and "Lawrence of Arabia" and is in London at present. He was also the younger brother of the prominent orientalist, the late Dr Mohammad Iqbal, former Principal of the Oriental College, Lahore

Prof. Mohyeddin also leaves behind a wife and five daughters. 'Qul' will be held on Saturday (today) at his residence at 44-H, Model Town, Lahore, from 3 p.m. to 4-30 p.m.

Born in 1888, Prof. Mohyeddin received his early education in Ferozepur and Jullundur and graduated from the Punjab University in Lahore After he obtained the Bachelor's degree in Education, he was attracted by the Khilafat Movement and instead of joining the Government service proceeded to England. He obtained M Ed. from the University of Leeds soon after the First World War

On his return home, he joined the Provincial Education Service and retired in 1942 from the Government Training College. After independence, he joined Dyal Singh College, Lahore, as Professor of English

Prof. Mohyedddin was a member of the Board of Studies for Music of the Punjab University and a member of the Music Committee of the Board of Secondary Education. He was closely associated with the All-Pakistan Music Conference for which he acted as a judge.

He was the author of two books on music including "Tashkil-e-Mauseeqi" which has been prescribed as a text-book by the University. Prof. Mohyeddin wrote a number of articles in English on Pakistani classical music. He also leaves a collection of plays in Urdu entitled "Bahar-e-Tamseel." He had been staging himself plays during the time he was associated with the Training College and Dyal Singh College. He could himself play on *dilruba*.

Maulana Salah-ud-Din Ahmad, Editor, *Adabi Duniya*, said on Friday that Prof. Mohyeddin was a prominent critic of music and had a broad vision as a dramatist, The Maulana described him as an eminent cultural figure who had distinguished himself in the fields of music and dramas.

SATURDAY NOV.9.63

پیارے ضیاء

آج باہر بے شمار لوگ بیٹھے ابا جی کے لئے قرآن شریف پڑھ رہے ہیں۔ آج ابا جی کو ہم سے رخصت ہوئے تین روز ہو گئے۔ اماں اچھی ہیں۔ تم خط لکھ کر انہیں بتاؤ۔ انہیں کیا کیا کرنا ہے۔ ابا جی کی کتابیں، ذاتی BELONGINGS خاص طور پر ان کی گھڑی، بٹوا، البمیں، ان کی تحریریں، یہ سب کیا ہوں گی۔ میری رائے ہے کہ تم اماں کو آ کر لے جاؤ۔ ابھی نہیں۔ بھائی اسحاق سب انتظام کر رہے ہیں۔ انہیں شکریہ کا خط لکھ دو۔ آج کے اخبار کا تراشہ بھیج رہی ہوں۔ اور کچھ کہہ نہیں سکتی۔

سرور کو سلام۔

بڑ

---

میرے پیارے ضیاء واری صدقے پیارے ضیاء۔ تم کہتے ہو کہ اماں خود خط لکھو۔ میں کیا لکھوں کہ تمہارے ابا جی چلے گئے۔ میرے دل سے پوچھو کہ ہمیشہ کے لئے چلے گئے۔ وہ کبھی نہیں آئیں گے۔ خداوند کریم میرے پیارے بچوں کو سلامت۔ آمین کہوں کس سے کہوں میں حال دل اپنا۔ مورے درد کی وہ تو دوا ہی نہیں۔ میں صبر تو کرتی ہوں۔ لیکن مجھے یقین نہیں آتا۔ وہ مر گئے ہیں۔ ہر وقت منٹ کے بعد کانوں میں آواز آتی ہے۔ ڈیرا نذر آ نا بس بیٹیا میں کیا لکھوں ابھی میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ میں ماڈل ٹاؤن میں رہوں گی۔ یہاں رہوں گی۔ تو کبھی کبھی قبرستان بھی چلی جایا کروں گی۔ کپڑے دے دوں گی۔ اور باقی سب پڑا رہے گا۔ میں جلدی نہیں کہتی کبھی تمہارا آنا ہو جائے گا۔ تو پھر دیکھا جائے گا۔ بس بیٹیا خدا تم کو بھی صبر دے۔ اور مجھ کو بھی۔ اور ان کا گھر بہشت میں ہو۔

دنیا میں کون کون سی بات ان کی یاد کروں۔ تم جیسا لکھو گے میں ایسا ہی کروں گی۔ میری پیاری بہو کو اور میکس کو پیار۔ اور بدنصیب اماں جو پیچھے رہے گی تمہارے۔ آج رات کو بڑی جا رہی ہے۔ کل تمہاری آپا چلی جائے گی۔ ایک ہفتے کے بعد رضیہ بھی چلی جائے گی۔ خدا تمہارا نام روشن رکھے۔

تمہاری دعا کرنے والی اماں

---

ماڈل ٹاؤن

۱۶ر نومبر ۱۹۶۳ء

پیارے ضیاء دعا،

اماں کی اور سب کی جو حالت ہے وہ تو آپ IMAGINES کر ہی سکتے ہیں یا شاید نہیں کر سکیں گے۔ بالخصوص اماں کہ زندگی میں ان کا مقصد حیات ہی ختم ہو گیا۔ باجی نے بڑی کوشش و تاکید کی ہے کہ میں انہیں ساتھ لے جاؤں مگر فی الحال وہ تیار نہیں ہوتیں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ان کی نظر کس قدر خراب ہوتی جا رہی ہے۔ اور اب رنج کی وجہ سے اور بھی زیادہ ہو گی آپ کا کہا وہ سب سے زیادہ مانتی ہیں۔ آپ ان سے کہیں کہ وہ ماڈل ٹاؤن تنہا نہ رہیں۔ خرابی نظر کی وجہ سے اور ویسے بھی اکیلے رہنا قریباً ناممکن ہے وہ میرے پاس چلی جائیں تو آنکھ کے آپریشن میں بھی جس کی عنقریب ضرورت پڑے گی سہولت ہو گی۔ جس طرح آپ اور اماں مناسب سمجھیں ہم کرنے کو تیار ہیں مگر یہاں ہم میں سے کسی کا مستقل طور پر رہنا ناممکن ہے۔ اتنا بڑا گھر ہے کہ ہم سب کو ڈر ہے کہ اماں تنہا ہوں گی تو کیا حال ہو گا۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ آبا جی کے علاوہ میرے ایک دوست بھی چلے گئے ہیں کہ ہر قسم کی بات وہ میرے ساتھ ہی پہلے کرتے

تھے۔ مگر ہم کیا کریں۔ رویا بھی نہیں جاتا۔ سرور کو دعا پیار اور دونوں بچوں کو بھی آپا حمیدہ پاس بیٹھی دعا سلام لکھواتی ہیں۔

دُعاگو ہمشیرہ۔

---

پیارے ضیاء

تمہیں اللہ ہزاری عمر لگائے۔ تمہارا خط مجھے قصور مل گیا تھا۔ جواب جلد نہ لکھ سکی کہ وہ TERM ہمارے ہاں بڑی مشکل ہوتی ہے امید ہے کہ تم بخریت ہو گے معہ بیوی بچوں کے۔ میں ۲۷ دسمبر کی شام کو اماں کے پاس آ گئی تھی۔ چھوٹی آپا بھی پنڈی سے آ گئی تھیں ابھی جا رہی ہیں بڈ شاید ۴ جنوری تو آ جائے گی۔ تم سب کو نیا سال مبارک ہو۔ خدا کرے کہ یہ چونسٹھ کا سال خیر و برکت کا ہو۔ سن ترلیسٹھ سے بڑی ہی تلخیاں وابستہ ہیں۔ آج ابا جی مرحوم کی تین عدد تصاویر ENLARGE ہو کے آئی ہیں کیا بتاؤں کس قدر خوب صورت ہیں۔ جی چاہتا ہے دیکھتے ہی رہیں بڈ چھوٹی تصاویر لے گئی تھی۔ کراچی سے اسی نے بڑی کروائی ہیں یہ حال ہی کی تصاویر ہیں۔ ایک میں تو ریڈیو پر کسی INTERVIEW کے دوران گفتگو کر رہے ہیں۔ اور باقی دو میں نئے گھر کے برآمدے میں کھڑے ہیں۔ ڈریسنگ گاؤن وہی برسوں کا مگر کس قدر موزوں لگتا تھا۔ ان کے جسم پر۔ آہ وہ اپنے ساتھ سبھی کچھ لے گئے۔ اور اپنی پیاری یاد چھوڑ گئے۔ جس کی کسک تا عمر سینوں میں رہے گی۔

امید ہے پیاری سرور معہ بچوں کے بصحت ہو گی۔ ضیاء کسی وقت تمہارے بچے اور تم دونوں بے طرح یاد آتے ہو۔ اور یک لخت جی چاہنے لگتا ہے کہ میرا پیارا بلو بھی ہمارے درمیان بیٹھا ہو۔ خدا تمہیں اہل و عیال "سمیت (کس قدر ثقیل سا لفظ اہل و عیال) ہم سب سے جلد ملائے۔ تو پیاری سرور سے کہنا کہ دونوں بچوں

۱۰/۲/۸

کی ایسی تصویر بھیجیے جسے میں فریم کروا سکوں ۔ میرا یہ پیغام بھولنا نہیں ۔ اور اگر کبھی ہو سکے فیملی کا گروپ فوٹو ہو تو مجھے دلی مسرت ہو گی اسے وصول کر کے ۔ میں کل شام تک قصور جا رہی ہوں ۔ ۳ ر کو اسکول سب کھل رہے ہیں ۔ اماں فی الحال یہاں ہی ہیں ۔ آنکھ کے آپریشن کے سلسلہ میں فروری مارچ تک کراچی جائیں گی ۔ ممکن ہے اس سے بیشتر ہی چلی جائیں وہ کھل کر بات تو کرتی نہیں ۔

(ہمشیرہ کا خط ضیاء کے نام)

C/o Pure Products Limited
Estate Avenue
Karachi-13
(Pakistan).

Telephone : 79454 Cable : "PURFOPROC"
Factory : Sind Industrial Trading Estate Ltd.

Karachi
9-11-63

My dear Zia

Aijaz Rashid's son rang up at 10-30 PM night before last to say that your worthy father had passed away suddenly, having collapsed from heart-failure, waiting at the bus stand. It was a grievous shock to me. I had known him closely since 1928 when he was trying for an overseas scholarship for going to Leeds for his M.E.D. Sharif Devji Canji the magnate in Bombay who controlled the Scholarship Trust was known to me as I was then posted at Bombay & I had the satisfaction of arranging things for Khadim successfully

Both on his way to U.K. & on return he stayed with us. This is obviously old history — much too old where you are concerned but not so old for me.

May God bless him unlike his elder brother Mohd Hoosein whom I knew well as my Khaloo; & like Iqbal his younger brother he spoke never too much & rarely afraid anybody & I donot think he ever cultivated anyone deeply enough to feel afraid him. I donot believed he ever harmed a soul.

I have a post card, still, contg some verses I asked him years ago to send to me — <u>Please</u> return it to me after perusal. It is now an even more precious memento & I would like to keep it as a souvenir.

I trust you & your good wife are doing well in life. I saw a glimpse of you lately in the Lawrence of Arabia hence hope to see you sometime in July next year in London. My wife & daughter Nasreen (B.A) left

Yours affly
[illegible]

جمالِ لب و رخسار کے نام

ضیاء محی الدین کے ساتھ ایک خوش قسمتی یہ بھی رہی کہ جہاں جہاں بھی گئے، دوستوں کے چاہنے والوں کے محبت نامے اُنہیں ملتے رہے۔ براڈ وے میں ہوں یا برطانیہ میں، افریقہ کے صحراؤں میں چلے جائیں یا اپنے وطن میں ہوں، دوستوں کے خطوط کی خوشبو، اُن کا ہر جگہ استقبال کرتی دکھائی دیتی ہے۔ دوست، جو سوچتے ہیں، جو کرنا چاہتے ہیں، جو کر چکے ہیں۔ ان سب میں وہ دوستوں کی موجودگی چاہتے ہیں ــــ میری سمجھ میں تو خط لکھنے کا مفہوم یہ ہی آتا ہے ــــ یوں محبت کے اَن گنت انداز ہیں ــــ لیکن خط کے وسیلے سے جس جذبے کا اظہار ہوتا ہے، اس میں اگلی پچھلی ساری رتوں کے رت جگے بھی ملتے ہیں اور ایسے آدرش بھی کہ جن کو ابھی معلوم سے نامعلوم کا سفر کرنا ہے۔

جس طرح زندہ رہنے کے لیے زندگی کا احترام ضروری ہے اسی طرح خط لکھنے کے لئے بھی یہ احترام ضروری ہے۔ ضیاء محی الدین اس اعتبار سے خوش قسمت ہیں۔ کہ انہیں زندگی میں بہترین دوست نصیب ہوئے۔

اس حصّے میں ان کے دوستوں کے لکھے ہوئے خطوط شامل کئے جارہے ہیں۔ جس میں ایک طرف لکھنے والے کی محبت کی چاشنی ہے تو دوسری طرف ضیاء محی الدین سے تعلق کی ساری واردات کیلی فورنیا میں مقیم ایک ناول نگار دوست جم کے خطوط امجد حسین کا ایک خط اور

چند احباب کے محبت نامے، باقی داؤد رہبر کے خطوط ہیں بخط کیا ہیں؛ دل دگر کارہیں ہیں. آخر میں داؤد رہبر کا ایک خط راقم الحروف کے نام ہے اور ساتھ ہی ان کا ایک مضمون "انوکھا لاڈلا" شامل ہے جو بقول ان کے اپنے حیاتِ مختصر کا ماضی ہے جسے محبت کی دل نشین حکایت کہا جا سکتا ہے۔

7 Ridgeway Av., Kew, E.4.
13th March, 1953.

Dear Zia,

Thanks so mush for your letter. It told me lots I wanted to know; I'm very cross that we had to miss your feature on Indian music. Robert Andrey rang up that evening and told us you would be doing it; but our radio had had to spend its weekend at the radio doctor's and we were earless..But my dau ter Helen heard your broadcast and appreciated it. I was won ing if you'd have time to see Helen while you're in Sydney. She'd be very much interested. She has a telephomne and her address is 263 Elizabeth Street, Sydney ( just opposite the Anzac Memorial). I'm not going to talk about her here; but I think you'd find her mentally and musically fruitful.

Robert says you'll be staying with him in Melbourne and he's going to bring you here. So glad you are broadcsating on Iqbal. I told you we have Iqbal Singh's book on Iqbal at last?

Much haste but very good wishes. If you see Helen ask her to tell you about John Manifold, musucian and poet, in Brisbane. [handwritten addition, illegible]

Yours [illegible],

[signature]

MARGARET REID HOSPITAL JJ 3465 — BEVERLEY PARK HOSPITAL CAMPBELLTOWN 81 — STRATHALLAN HOSPITAL: JJ 3496

# THE N.S.W. SOCIETY FOR CRIPPLED CHILDREN

136 CHALMERS STREET, SYDNEY G.P.O. BOX 3545, SYDNEY TELEPHONE: MX 4392

17th January 1956.

Mr. Zia Moheuddin,
2 Emperor's Gate,
LONDON, S.W.7. ENGLAND.

Dear Zia,

Your charming Christmas card arrived last week and Caroline, Jon and I were all simply delighted to hear from you again. I was most interested to see that you are still in London and hope that you are very happy in your work.

Now, I have a surprise for you. Caroline and I are making a trip abroad this year. We will be leaving Sydney in March and going to Greece to stay with some Australian friends of ours, Charmain and George Johnston, who are writers and live on an island in the Aegean Sea about 58 miles from Athens. From there we will proceed to Istanbul and later back to Athens and up the Adriatic to Trieste. From there we are going to Florance and Rome, then up the west coast of Italy to Genoa. We will spend the remainder of the Spring in Europe and proceed to England about the end of June.

I will be staying for some of the time with Admiral and Mrs. Bernard Drew who have a flat in London and, on arrival, I will contact you as we would both love to see you.

I have obtained leave of absence from my job at the Crippled Children's Society and will not be returning to Australia to take up duties again until January.

This trip is something that I have dreamed about all my life and I can tell you how happy I am to be going and how particularly delighted I feel to be taking Caroline with me.

I shall look forward to seeing you. In the meantime, love from us all.

Yours sincerely,

114

December 17, 196[illegible]
P.O. Box 120[illegible]
Tahoe Valley, California

Dear Zia,

Don't know your address, so will ask the Farbers to forward this on to you. I do hope they sent on our thanks for your excellent record TABLES OF INDIA, about which you should be properly proud. Several people have enjoyed it. Thought of you with the first snows this season recently, because you left with the last of the snow then. On your stop in the Bay Area, you properly impressed Tony Boucher, who is seldom impressed. And we finally saw LAWRENCE--a beautiful job of acting you did!

As I think you know, my long novel was bought shortly after you left. It is finished now, titled A CIRCLE IN THE WATER, and in galleys, though I don't yet know the publication date. Jesus, I don't want to do another like it for at least another year or two. Also have completed an experimental (for me) crime novel for Ballantine, also a collection of short stories which I just mailed to N.Y. With all of that done, am finally going to try Hollywood directly. Just got a new agent down there, a talent agency that can deal directly for scripts for me. I'll go down after the first of the year and see how it goes.

One thing: I outlined an original idea for the Hitchcock TV show, which went down about a week ago. It would be lovely for you. I know how difficult it is ever to get a thing like that coordinated. But if they give me a go-ahead, it would be a nice thought. Let me know where you are and where you'll be into the next year--just in case we get as far as the producers with it.

Well, the above work is intended to free Marty of that damn work, which she is doing. It has been much too much lately, and she has been working 7 days a week. She surely made it possible for me to get that book done. But now that it is, and in the process of being seen by subsidiary markets and being readied for publication, we have both gotten impatient.

We both look back fondly upon your visit and hope we can see you again one of these days soon. Best from both of us to you and your wife and family.

Sincerely,

Jim

II A

February 23, 1965
P.O. Box 1206
Tahoe Valley, California
U.S.A.

Dear Zia,

We were delighted to receive and read your good letter, and thanks for writing. I got back very recently from Hollywood, and unfortunately could not get the approval from the Hitchcock Show producers on the story I told you about. But it was mainly because I'd outlined it insufficiently, and I feel I'll get another crack at it, making it more clear what I wanted to do with a script, possibly by putting it into short story form. Let's hope anyway. Both the producer and executive producer are British, by the way, and I could hear your fine accent talking to them about it. The possibilities for the show being picked up are excellent, they feel, in March; and if this happens, as it appears it will, I've got a good verbal committment to start off by doing the short story that was in that Cosmo issue featuring your wife, Sherry. Happily, they don't mind my writing out of Tahoe. I look forward to getting into script work. Had a very busy xxxxx time talking to various people, and also keeping on top of my long novel, A CIRCLE IN THE WATER, which comes out next month. Universal is deciding on it now. And also I felt Richard Egan would make a fine lead character, in a film dramatization. He is reading it as well, in advance copies. I had a fine time at his house. It was proof, as it was with you, that people such as you and Richard deal in honest values--you often have to confront people with talent and success to find it.

Yes, statistics, money, symbols of position, etc. It's an American way, and I tried to analize it in my novel, why it is, and why it's such a compulsion with most. It was a hard and deep-down search. It is, I think, a tradition in this country, as you have other traditions in other countries. And these things are substitutes for the honest values, and honest relationships between people.

I'm glad to hear you are busy and have collected from a TV series! Yes, a long year gone by, nearly. And it was a tough one here, as you know, but things look very much brighter right now. I've changed my entire representation. Donald is now handling my contracts, etc., in books and magazines, as well as possible theaterical! I'm very pleased about it. I've contracted with an agent in Hollywood for that work, and like them very much, being one of the few writers they represent--mostly they have actors, including Richard Egan. A.D. Peters, in London, is handling directly my British sales, as well as handling the arrangement for all other foreign sales. Don is helping me untangle a truly dismaying mess with my former N.Y. agent.

I think your idea for a book is fine, and if you find the time you should surely do it. A long time friend of Marty's, by the way, is teaching in Pakistan now. Marty sent her one of the pictures we took of you, and you were recognized immediately, of course, by the native sons, who were quite thrilled with the round-about association. It is quite easy to understand the lionizing you received at home--it wouldn't be a horrid bore to me, I want to tell you! A nod in the street sets me up for days.

Oh, yes, I would love to become the famous, rich author, with the trappings, including the Grant's. But you know, of course, that advertisement really isn't what it seems. The first implication is that the gentleman is asking his wife or mistress to get him this booze. But the fact is he's asking his mother. Now he keeps that typewriter on his lap. But he never writes anything, because he's bagged out on the drinks all day long, you see--which pleases his mother immensely, because she wants him to be totally dependent upon her, which is why she's always up, keeping him stoned out of his head all the time.

I hope the tour went off brightly and successfully to rave reviews. And I hope too this reaches you before you move on. One of these days we're hoping you'll return to Tahoe. And Hollywood. And, of course, we may meet too in N.Y. I really must go there, with the new arrangement, and only hope to do it before too long. Marty sends her love (I just talked to her on the phone; it is 5:30 A.M., the bloody graveyard). And we both wish you continued success and happiness in achieving it. Write when you find a moment; we always would like to hear.

Very best,

Jim

C O P Y

COLLEGE OF SAINT TERESA
Winona, Minnesota

March 13, 1964

Mr. Zia Mohyeddin
c/o Columbia Lecture Bureau
111 West 57th Street
New York 19, New York

Dear Mr. Mohyeddin:

Thank you so very much for the tremendously alive resume of so many impressions which made of yesterday's seminar a rich and happy experience. I know that the senior audience ---because of so many factors---wasn't worthy of you, but when you next come, and I do hope there will be another time, I am sure that they will feel more free to engage in dialogue. Women in college have more reticence than men in similar classes, a problem which I have never really been able to come to terms with. The freshmen, to whom I happened to mention this morning the convocation of yesterday, were enthusiastic beyond anything that I can recall. Since we are currently reading poetry, even though it is a far cry from the warmth and religious depth of Indian poetry (Alexander Pope on architecture) I feel that you have done something truly wonderful for these girls, and that you will not think it flattery (freshmen are much too honest to flatter) if I include with my message of appreciation some excerpts from the set of impressions I asked them to set down when I realized how high their interest was running.

For my own part, I thoroughly enjoyed the relaxing and amusing dinner conversation, as well as your presence in our seminar. While my acquaintance with art films is almost non-existent I liked Wild Strawberries very, very much, and I wish we could have talked further about Bergman, but one should thank God for the gifts He gives and not always be wanting more. I do hope that you enjoy exploring our America, since clearly you are "one upon whom nothing is lost" and the things you see and hear will undoubtedly still further affect your remarkable sensibility. Next time you come we'll have to talk about Yeats---right?

Gratefully,

/s/ SISTER BERNETTA
Chairman of English

UNIVERSITY OF *Minnesota*

COLLEGE OF LIBERAL ARTS
INTERNATIONAL RELATIONS AND AREA STUDIES
MINNEAPOLIS, MINNESOTA 55455
Social Science Building West 1282

March 12, 1968

14/1968/40

Mr. Zia Mohyeddin
c/o The Hudson Theatre
141 W. 44th St.
New York, N. Y.

Dear Mr. Zia Mohyeddin:

My wife and I are great admirers of yours and were delighted to read the glowing tribute to your performance in "The Guide" which the drama critic of the New York Times paid in the issue of 8 March 1968.

Though we have never been introduced formally, we have seen you often both on and off stage and of course take pride in your success as fellow countrymen.

I enclose my own biographical sketch by way of introduction. Perhaps you know our daughter Robin who lives in London and her husband Harvey Hallsmith who also is an actor and a writer.

My wife and I are hoping very much that you will get invited to play at the Guthrie Theatre here one day so that we can have the pleasure of seeing you perform locally.

I am coming to New York on 24 March and will stay at Hotel Waldorf Astoria till Friday, March 29. I am greatly looking forward to seeing "The Guide" during my stay and am writing to a friend to get me tickets.

If you will kindly let me have your address and telephone number in New York we might be able to meet at a mutually convenient time and get acquainted personally.

With kindest regards and best wishes for your continued success,

Yours sincerely,

S. M. Burke, S. Pk.
Professor and Consultant in South Asian Studies in the Department of International Relations and Area Studies

SMB:es
Enc.: Biographical Sketch

کولمبو ۱۰ر جولائی ۱۹۶۷ء

ضیاء پیارے

مدّت سے تمہارا خط آیا ہے۔ جواب اس لیئے نہ لکھ سکا کہ تمہارا خط معلوم نہیں۔ پہلے گیرک تھیٹر کی معرفت بھیجا تھا اس لیئے کہ تم وہاں اپنے جھنڈا گاڑھ چکے تھے۔ اب آخر اسی پتہ پہ لکھ رہا ہوں۔ ممکن ہے یہ لوگ تمہیں بھجوا دیں۔

سیلون سے اب کوچ ہے لیکن ابھی تک یہ معلوم نہیں کہ کہاں جانا پڑے پہلے دہلی جانے کا امکان تھا۔ پھر سنا کہ تیرو بی بھیج رہے ہیں۔ پھر سننے میں آیا ہے کہ تجربہ کار صحافی کی بیروت میں ضرورت ہے اور اب اطلاع یہ ہے کہ کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ صرف یہ فیصلہ ضرور ہے کہ سیلون سے جانا ہوگا۔

اب کہ گرمیوں میں لندن آؤ تو اس طرح لکھا ہے کہ لاہور سے کلتے کا چھے بلا رہے ہو۔ پیارے اگر جانا اس طرح ہو جائے تو اب کے کیا ہر گرمیاں لندن ہی میں گزاروں، مجھے خود ملاقات کی بیحد تمنا ہے۔ کئی سال ہوئے تمہاری صحبت کے بیلے لوٹے تھے۔ بلکہ تمہیں بتانا چاہتا کہ پاکستان کا چکر کب ہوتا ہے۔ لیکن میں تمہیں پاکستان آنے کی دعوت دے رہا ہوں۔ اور خود بن باس میں ہوں اور سیتا بھی پاس نہیں ہے۔ اور راون کے اس ملک میں کسی نے عارضیتاً سیتا بھی نہیں دی۔

سُنو میاں راون کو کوئی جانتا بھی نہیں۔ رام کے نام لیوا تو چند ہیں لیکن وہ بھی دسہرہ نہیں مناتے۔ کوئی اس کا ذکر نہیں سُنا۔ اور پھر ہم نے یہ بھی پوچھا۔ کہ بھئی آپ کے ہاں کے یا دن گزرے مشہور ہیں۔ وہ کہاں ہیں یہاں

ہیں، یہاں کے لوگ تو اکثر دبیشتر بالشتئے ہیں۔ اگرچہ ہم قد ہیں۔ باون گزوں کے بارے میں تحقیق تو لازم تھی۔ لیکن کوئی نشان تک نہیں ہے۔ عورتوں کے جسم چکنے ہیں۔ اس کے بارے میں معلوم کیا تو پتہ چلا کہ ناریل کے تیل کی کرامات ہے۔ ہم نے پوچھا کہ اس کی مالش ہوتی ہے کیا؟ جواب ملا۔ اندر سے نکلتا ہے۔ ہم نے اپنے منہ پر ہاتھ پھیرا تو واقعی چکناہٹ تھی۔ شری لنکا ماتھا کا جواب نہیں ہے..... لیکن کولمبو شہر یہاں پورا شہر ہے یہ پتہ نہیں چلتا کہ شام کس طرح بسر ہو۔

پچھلے مہینہ میں ایک موٹر کی لپیٹ میں آگیا روسی سفارتخانے کا ایک افسر چلا رہا تھا۔ اس نے سمجھا کہ میں بھی ریڈ گارڈ ہوں۔ بھائی نے پیچھے سے اس زور سے موٹر ماری کہ لوٹ پوٹ ہو گیا..... ہسپتال پہنچ گیا خیریت رہی کہ ہڈیاں بچ گئیں۔ کمر میں درد تھا۔ پانچ روز ہسپتال میں بستر پر سیدھا لیٹا رہا۔ چوٹیں کافی آئیں لیکن جان بچ گئی۔

اور کیا لکھوں۔ سخت "ادا زاری" ہے۔ پیار

تمہارا

امجد حسین

۱۹۶۲

جانِ عزیز ضیاء محی الدین عالمگیر !

میرے خط صرف انشاء پردازی نہیں ہیں۔ دل و جگر کا رس ہیں اور ان کا محرک آپ لوگوں کی محبت ہے۔ اس لئے ان کی ایک غرض یہ بھی ہے کہ آپ جواب لکھیں۔

آپ کا پچھلا پروگرام جس کو پروازِ صنم کہنا چاہیئے بہت ہی لطیف تھا۔ ہم نے آپ ہی نہ دیکھا اور بھی بہتوں کو دکھایا۔ ہم سب نے ایک دوست کے گھر میں جمع ہو کر پہلے کابلی چنوں کا سالن بلکہ مسالن پوریوں کے ساتھ کھایا۔ پھر آپ کی متحرک تصویر دیکھی جو برابر پھڑک رہی تھی۔ دوسرے دیکھتے تھے۔ اور ہم بھول کر کیا ہو رہے تھے۔

اس کے سوا کیا کہوں۔ کہ آیئے آیئے۔ سرور کو ہم سب کا سلام۔ یونانی ہیرے کو پیار۔

ہم سفر

داؤد رہبر

۱۳ اکتوبر ۱۹۶۲ء

جانِ عزیز

ٹیلی فون تو آپ اشاراتِ ایزدی ہی سے فرمائیں گے ۔ اتنا عرض کر دینا اپنا فرض ہے کہ جب گھر بدلیں ۔ تو نئے گھر کا پتہ اور ٹیلی فون نمبر لکھ دیں ۔ کہ حکم اضطرار سے صلائے خاص آپ تک پہنچا دیا کروں یہ جان کر اُس روز آرام ملا کہ قبلہ گاہی کو آپ میرے کہنے سے ایک روز قبل خط لکھ چکے تھے ۔ اس طرح آپ کا پلّہ بھاری رہا ورنہ یہ کہا جاتا کہ آپ نے اپنے آپ ان کو نہ لکھا ۔

سٹونی پوائنٹ سے دریا کے کنارے جنرل واشنگٹن کا پُل ٹاپ کر آپ تک پہنچ جاتے تھے ۔ اب تو ریل گاڑی سے آنا پڑے گا ۔ اکتوبر کی ۳۰ تاریخ کے قریب ایک چکر لگاؤں اور آپ کا منہ دیکھ آؤں گا ۔ ہنستے ہنستے رسم الخط میں چند سطریں لکھ دیجیئے گا

سرور کو بہت بہت سلام ۔ اور یونانی[1] کو پیار ۔

خاکسار داؤد

داؤد

---

[1] میرا ۔ بڑے بیٹے مینوس کی طرف اشارہ ہے کیونکہ مینوس یونانی کا لفظ ہے ۔

۲۰ — ۱۱ — ۱۹۶۲

ضیاء جی! جس گھر میں آپ قدم جماتے ہیں مالک مکان اس گھر کے خود دلدادہ ہو جاتے ہیں۔ ہم اور آپ وہ لوگ ہیں جن کے مکان بیابانوں کے بگولے ہیں۔ ریاض خیرآبادی بھی ہمیں لوگوں میں تھے کہ یہ کہہ گئے ؎

دشت میں گرد مرے کھا کے جو چکر نکلا
میں بگولہ اُسے سمجھا وہ مرا گھر نکلا

بہرکیف یہ بتا کر کہ اب آپ پھر گھر بدلیں گے۔ آپ نے مجھ کو پریشان خاطر کیا۔ خدا کرے ٹھکانہ معقول مل جائے۔

اگر آپ لندن چلے گئے۔ (خدا ایسا وقت ہرگز نہ لائے) تو ہم ہر اس خیمہ گاہ پر آکر آنسو بہائیں گے۔ جہاں آپ کے آثار ضرور پائیں گے۔ آپ مختار صدیقی بلکہ فیلڈ مارشل مختار صدیقی کو استخارہ کا ایک خط لکھ کر پوچھ لیجئے۔ کہ لندن واپس جانا آپ کے حق میں اچھا ہے یا نہیں۔ ہمارا وجدان تو کہتا ہے کہ آپ یہیں جم جائیے۔ یہ ہماری خود غرضی ہے۔ یہ خط ہماری عرضی ہے۔ آپ بتائیے آپ کی کیا مرضی ہے۔

خاکسار داؤد

۱۳ - ۱۲ - ۱۹۶۲

ضیاء جی! سلام جی اور دُعا جی!

دو سطروں والا خط آ گیا۔ پڑھ کر دُکھ ہوا۔ آپ چھکنے کے لئے بیٹے ہیں۔ ستم ہے کہ اس میں خلل ہے۔ خدا دروازے کھولے اور گھما گھمی سب ہے۔ آپ جس میدان کے اشہب ہیں۔ وہاں ہماری رسائی نہیں۔ آپ کے لئے کچھ نہ کر سکنے سے جی اور کڑھتا ہے۔ پچھلے دنوں آپ کے قبلہ گاہی کا ایک اور خط آیا جس سے محسوس یہ ہوا کہ لکھنا درحقیقت وہ آپ کو چاہتے ہیں۔ لیکن چونکہ آپ نہیں لکھتے ان کو اس لئے وہ سہم کر رہ جاتے ہیں۔

چھٹیاں قریب ہیں چار مہینے مسلسل کمرۂ درس میں بول بول کر اب چپ کا روزہ درکار ہے جس کا افطار کرنے میں آپ آ کر مدد کریں۔ تو کریں۔

سرور کو بہت بہت سلام ہم سب کا۔ یونانی کو پیار۔ نُورانی کی خیر۔

آپ کا

داؤد رہبر

نومبر ۱۹۶۴

مخدوم جہانیاں جہاں گشت!

آپ نے یہ لقب سُن تو ضرور رکھا ہوگا۔ یہ سید جلال الدین بخاری کا لقب ہے جو فیروز شاہ تغلق کے عہد میں (چودھویں صدی عیسوی) بڑے مرشد تھے۔ مجھ کو بعض مرتبہ یہ لقب ایسا بھایا کہ اپنے لئے اختیار کرنے کو جی للچایا۔ مشکل یہ ہے کہ اپنے آپ کو مخدوم کیوں کر کہوں، اپنے آپ کو صرف خادم کہیں گے۔ پھر جی میں آئی کہ نیا بنایا لقب کسی محبت خاص کے لئے کیوں نہ مقرر ہو۔ نگہ دوڑائی۔ آپ ہی آپ دکھائی دیئے کہ مخدوم بھی ہیں اور جگہ جگہ بھی ہیں۔

اب فرمایئے آپ امریکہ کب آئیں گے۔ وہ دورہ جس پر آپ سال گزشتہ آئے تھے۔ پھر کب ہے، جب آیئے۔ ہم کو بتایئے اور ہارٹفورڈ کو اس جلوے سے کیوں محروم رکھتے ہیں۔ یہ شہر بھی خاصا ہے۔ آپ کے استقبال کو اہل شہر نئی نئی عمارتیں بھی بنا رہے ہیں۔ یہاں بھی سٹیج کو لوگ سیج پھولوں کی سمجھتے ہیں۔ ناٹک ساگر کے شناور یہاں بھی ہیں۔ آپ آئیں گے تو داد دیں گے۔ اور یقین جانیے اب کے میں اپنے ساتھ لشکر نہ لاؤں گا۔ آپ ہی دیکھنے آؤں گا۔

سُنا ہے آپ نے مکان پھر بدل لیا ہے، طریقت کی منزلیں اور مجاہدے ہماری قسمت میں بھی ہیں۔ لیکن یارانِ طریقت کو آپ کی منزل کی خبر رہنی چاہیئے۔ نیا پتہ لکھیئے گا۔ سرور کو بہت بہت سلام۔ مینوس اور رشا کو پیار۔

خاکسار داؤد رہبر

۳۰/اپریل ۱۹۶۷ء        ضیاء جی

ٹیلی فون بھی آپ کی فیاض خانی آواز کو تارستیک کا رنگ نہ دے سکا۔ الحمد اللہ، آپ کی تین چار منٹ کی گونج گوش کے رستے غذائی روح ہوئی، میں بہت امید رکھتا تھا کہ تم آؤ گے، ہم مرغ پلاؤ کھائیں گے۔ تم کھاؤ گے۔ ہم گائیں گے۔ تم کو دیسی سنائیں گے۔ سوز کے ساتھ اس کو پردیسی بنا کر سنائیں گے۔ الیہ بلاول سنائیں گے۔ تم نہیں آسکتے۔ ہماری قسمت کبھی تو آؤ گے، اب نہ آؤ گے۔ تو میں انگلستان آؤں گا۔ تمہارے ٹیلی فون کا مشاہیر نمبر کھٹکھٹاؤں گا۔ تم گاؤں نہ آئے۔ تو میں شہر آؤں گا، وہاں آکر گاؤں گا۔

میرا خیال ہے کہ تم آج نیو یارک پہنچ چکے ہو۔ وہاں سے اگر لندن جا رہے ہو تو بہتر یہی ہے کہ وہاں کے پتے پر تم کو لکھوں۔ کیا تمہاری خبروں کے لئے اخبار پڑھیں؟

نوائے وقت یہاں نوائے بے وقت ہو کر پہنچتا ہے، اس لئے آپ کبھی کبھی یہ تو لکھ دیا کیجئے کہ اب افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں ہیں یا امریکہ کے منجمد شمال مغرب میں۔

میڈی سن امریکہ کا لائلپور ہے۔ زراعت کا زور ہے، مکی کی بہار ہے فرق صرف یہ ہے کہ یہاں پینے پلانے کی رسم خاص ہے۔ گہواروں میں جھولنے والے بچے بھی پیتے ہیں۔ ماں باپ آداب شراب سکھانے پر متوجہ رہتے ہیں۔ آپ آئیں تو بوتل کا اہتمام کرنے کا ایک موقع مل جائے گا۔

راشد صاحب کے تہران جانے کا بہت قلق ہے، نیو یارک میں ان کی وجہ سے ایک گونہ کشش ہے۔ خدا کرے ان کا جانا رک جائے۔

لندن پہنچتے ہی ایک خط ضرور لکھنا کہ یہاں تمہارے پھر آنے کی
کیا صورت ہوئی، مور کے پروں کا تحفہ بھیجنا۔
جناب چودھری ظفر اللہ خان صاحب مدظلہم کو تمہارا پتہ لکھ رہا ہوں
وہ ہر سال کچھ مہینے لندن میں گزارتے ہیں۔ ان کو اشعار بہت یاد ہیں۔
مزے مزے کی باتیں کرتے ہیں۔ تمہارا بہت پوچھ رہے تھے۔
سرور اور مینا پرست اور رشی منی کو فقیر کا سلام، نجم النساء کا نہ
پوچھ سکا۔ کیا ابھی لندن میں ہے۔ یا اس کی جگہ اب اور کوئی آیا ہے،
تمہارا داؤد

غور فرمائیے
پتہ یونیورسٹی ایوی نیو ہے
نہ کرمیڈی سن ایوی نیو، ۷؍جولائی ۱۹۶۷ء

دلارے ضیاء

ہم کو نہ رُلا رے ضیاء، جلدی آ،

آپ کا خط قلمی آم معلوم ہوتا تھا "ترشی ہوئی پھانکیں دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے آپ کے مزاج میں آج کل آہستگی اور نوک پلک کا زور ہے، شاید کسی مرزا نستعلیق کا پارٹ یاد کیا ہے۔

الحمد اللہ آپ کے تشریف لانے کا سامان ہو گیا۔ اس کو پیرا دیس کیوں کہتے ہیں۔ ایک نظم کہی، جب راشد صاحب آئے ایک فرمائشی مشاعرہ کیا جیسے فرمائشی قہقہہ ہوتا ہے۔ اس میں وہ نظم ہم نے پڑھی اس کا آخری شعر یہ ہے۔

تیرا وطن ہے یقیں یا ہراس یا مستی
تو کب ہے اس میں رہے اندر تیرے تری بستی

آفتاب حسن کو آپ بھونکا کہنے سے باز نہیں آتے، واشنگٹن آیا ہے ٹیلی فون پر کچھ باتیں ہوئیں اب تو شعر ٹھیک پڑھ لیتا ہے۔ لہجہ بھی اس کا صاف ہو گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خزانے کے محکمے میں اس کے ذوق کی تشفیاں نہیں ہوتیں۔ جگر اور حسرت کو پڑھ کر غم غلط کرتا ہے۔

راشد صاحب تہران چلے گئے۔ وہاں سے اب آغائی راشد کے نامے آیا کریں گے۔ نیویارک ان کی وجہ سے مقناطیس تھا۔ اب تو اس شہر میں آپ ہی آ کر رہیں تو ہم وہاں جائیں، جب پہنچو تو لکھ دینا۔ تقریب وہاں

آنے کی پیدا ہوگی معلوم نہیں آپ کے ناٹک کا نام اس بار کیا ہے آپ
کس روپ میں اوٹ سے نکلیں گے؟ نیویارک کے کس تھیٹر میں بجلیاں
چمکیں گی؟ میں سمجھا تھا کہ آپ فلم کے کام کے لئے تشریف لا رہے ہیں،
حقیقتاً آپ سٹیج کے مولا ہیں، آپ کی طبیعت وہیں کھلتی ہے۔
وہاں نومبر دسمبر میں ریہرسل شروع ہو گی، تو آپ وہیں کے ہو رہیں
گے۔ میں وسط اگست ۱۹۶۸ء تک یہاں ہوں۔ اس کے بعد نیویارک
کے قریب پہنچ جاؤں گا۔ اس کی تفصیل پھر کبھی بیان ہو گی۔ آپ سے
ملنے کی صورت ضرور نکلے گی انشاءاللہ چودھری صاحب مدظلہم کے حواریوں
سے آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ عقیدت کے مجسموں کے چہروں پر نظر
گاڑ کر بیٹھا کیجئے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ علو طبیعت والے لوگ ہی ہمیشہ
ملاقات کو ہوں۔ سب کچھ دیکھ کر دل بہلائیے، محمد شفیع صاحب کا بھلا
ہو، ان لمبے سلوٹ کے کالے سوٹ پر سلوٹ۔ سرور کو سلام۔ مینا
و ساغر کو دعا۔

آپ کا خاکسار
داؤد

ضیاء جی!

آپ کے ہم نام ہیں۔ ضیاء محی الدین ڈاگر، استاد ضیاء الدین ڈاگر کے فرزند ہیں، ڈاگر برادران جو جے پور کے دھرپد گھرانے کے لوگ ہیں اُسی خاندان سے ہیں۔ سرسوتی وینا بجاتے ہیں۔ ہولے ہولے آلاپ کرتے ہیں، تیزرے کو شیطانی کام جانتے ہیں، یہاں ہم نے بوسٹن یونیورسٹی یونین میں ان کو بلایا، انہوں نے جوگ اور چندر کونس کا آلاپ کیا۔ گیارہ بجے رات، ہارٹفورڈ کے قریب ایک قصبے میں ایک یونیورسٹی ہے۔ جہاں ہندوستانی سنگیت ودیا کی تعلیم ہوتی ہے۔ وہاں یہ بین کار صاحب مقیم ہیں۔

نزاکت علی سلامت علی نے آپ کو امریکہ کے لئے لکھا تھا، کیا وہ لوگ کبھی ادھر آئیں گے۔؟

اعجاز بٹالوی ادبیات کی ایک کانفرنس کے کرتا دھرتا تھے، اسلام آباد میں ہوئی، کفرستانوں کے مندوبین بھی اس میں شریک تھے۔ اعجاز نے مجھ سے بھی کہا لیکن جانا نہ ہوگا۔ آپ کو اس کی خبر کہاں تک ہے۔؟ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی ملتے رہتے ہیں۔؟ مینوس اور رشا دونوں کا نقشہ وہی ہے۔ جو کبھی آپ کا تھا۔ کراچی میں دیکھا، بہت محظوظ ہوا۔ کب ملیئے گا!

نگونسار

داؤد رہبر

نیویارک

HOTEL Meurice
145 WEST 58th STREET
NEW YORK 19, N. Y.

ہاں جی،

دو باتیں رات کی نشست کا تبصرہ ہیں،

نزاکت علی سلامت علی کی فصاحت و سلاست و صداقت کا میں قائل ہوں، صرصر، زناٹا، مردانہ چُہل، کلبل، نہم، شناوری، لہر، قہر اور ایسی ہی اور کیفیتیں اُنکے سحر کے مُظاہرے ہیں، غور فرمائیے تو ان میں اور عبدالکریم خاں میں وہی فرق ہے جو اقبال اور غالب میں علی الترتیب ہے، غالب اور عبدالکریم خاں دونوں میں معشوقیت زیادہ اور عاشقیت کم ہے، اس کیف سے اگر مجھ کو آرام ملے تو میری بے بسی ہے،

دوسری بات یہ کہ آپ کا کھیل مقبول ہوگا، ہجوم اُسکو دیکھیں گے اور آپ نیویارک میں چند ہینے ضرور رہیں گے، سرور آئیں گی، گرہست کی گرہ بندھے گی، رونق ہوگی! جب آپکو فراغت ہوگی آپ مل ~~سکتے~~ میٹنگ سن آئیں گے،

باجی غیر باجی
داؤد رہبر

نیویارک

ہاں جی،

دو باتیں رات کی نشست کا تبصرہ ہیں۔ نزاکت علی سلامت علی کی فصاحت وسلاست و صداقت کا میں قائل ہوں، صرصر، زناٹا، مردانہ چہل، کلیل، سہم، شناوری، لہر، قہر اور ایسی ہی اور کیفیتیں ان کے، سحر کے مظاہر سے ہیں۔ غور فرمائیے تو ان میں اور عبدالکریم خاں میں وہی فرق ہے۔ جو اقبال اور غالب میں علی الترتیب ہے، غالب اور عبدالکریم خاں دونوں میں معشوقیت زیادہ اور عاشقیت کم ہے، اس کیف سے اگر مجھ کو آرام ملے تو میری بے بسی ہے،

دوسری بات یہ کہ آپ کا کھیل مقبول ہوگا۔ ہجوم اس کو دیکھیں گے اور آپ نیویارک میں چند مہینے ضرور رہیں گے، سرور آئیں گی، گرہست کی گرہ بندھے گی، رونق ہوگی۔ جب آپ کو فراغت ہوگی۔ آپ مل کر میڈی سن آئیں گے۔

پاجی غیر ناجی
داؤد رہبر

بوسٹن (امریکہ)
۲۵ر فروری ۱۹۸۸ء

عزیزم

آپ کی بے تکلف فرمائش سر آنکھوں پر، اس کا پورا کرنا میرے لئے کیا مشکل ہے۔ آپ نے اپنے خط میں لکھا کہ ضیاء کی دوستی پر سطور لکھنے کو تمہیں ماضی کے ورق الٹنے پڑیں گے۔ برادرم! یہ کوئی تاریخ عالم کا ماضی تو ہے نہیں، اپنی حیاتِ مختصر ہی کا ماضی ہے، محبت کی حکایت دل نشین ہوتی ہے۔ چنانچہ حافظے میں اس طرح محفوظ رہتی ہے۔ جس طرح فلم میں کہانی سمٹ کر خوابیدہ، جونہی فلم کو عکس ریز مشین میں ڈال کر چلائیں کہانی جاگ اٹھتی ہے۔ اور متحرک ہو کر سامنے آجاتی ہے البتہ مشین روشنی پھینک ہوتی چاہیئے۔ بغیر اس اندر کی بتی کے متحرک تصویر کا طلوع نہ ہوگا۔ یہ روشن بتی ہمارا دل ہے اور اس محبت کی روشنی ہے جو ہم کو باغ و بہار بزرگوں، عزیزوں اور دوستوں سے ملی۔

آپ ضیاء کے ہم زلف ہیں۔ یہ ایسا رنگین رشتہ ہے جس کا جواب ہی نہیں، ہم ضیاء کے کیا ہیں؟ جواب سنیئے، ہم ضیاء کے ہم قلقے ہیں یعنی ہم نے مل کر بچپن میں قلفی فالودے کھائے (دلی اور لکھنؤ کے لوگ قلفی کو قفلی کہتے ہیں۔ لاحول ولا!) پھر ہم ضیاء کے ہم سلف ہوئے آپ جانتے ہی ہیں کہ سُلفہ اس چلم کو کہتے ہیں جو حقے سے بے نیاز ہوتی ہے اور جس کو دیہاتی لوگ مٹھی میں لے کر براہ راست پیتے ہیں، یہاں ہم سلف سے میری مراد ہم چرُٹ ہے یعنی مل کر سگریٹ پینے والے، مزید یہ کہ ہم برقی، ہم لڈو، ہم جلیبی، ہم ریوڑی، ہم گنڈیری، حتیٰ کہ ہم مچھلی بھی رہ چکے

ہیں۔ اور ہاں بھول نہ جاؤں، ہم کباب بھی، (خدا جانے لاہور میں خلیفہ کے کباب آج بھی میسر ہیں یا نہیں!)

ضیاء کے تعلق کے باب میں یہ بات آخر کتنے لوگ کہہ سکتے ہیں؟ اس لئے یاد رکھیئے کہ ہم ہم ہی ہیں، کسی سے کیا کم ہیں؟ خدا نے چاہا تو دس پندرہ روز میں آپ کی فرمائش کی تحریر مکمل ہوگی۔ فوراً ہوائی ڈاک سے بھیج دوں گا۔ کتاب میں میرے مضمون کے ساتھ یہ خط بھی شامل کیجئے گا۔

دُعاگو

داؤد رہبر

# انوکھا لاڈلا

حضرتِ ضیاء محی الدین مجھ سے چار سال چھوٹے ہیں، اللہ کا شکر ہے، اگر مجھ سے چار سال بڑے ہوتے تو صورت ہی اور ہوتی، یہ سوچ کر مزا لیتا ہوں۔ کہ ان کے آگے مجھ کو دب کر نہیں رہنا پڑا۔ یہ عالی ظرف مجھ کو زیادہ بناتا ہے، اور کیا چاہیئے، لطف آ گیا، ضیاء افقِ تمثیل کا ستارہ ہے، اوروں کی نظر میں بے تابی نمود کا پتلا یعنی پارہ پارہ ہے۔ لیکن جب اس کا اور راقم کا آمنا سامنا ہوتا ہے۔ تو ہم دونوں کو قرار آ جاتا ہے، یگانگی اسی کو کہتے ہیں۔

ضیاء اپنے فن کا منجھا ہوا استاد ہے۔ ایکٹر بنتے سے پہلے ہی ادائیں رکھتا تھا۔ اداکاری اختیار کر کے اس نے تپسیا کی، بحرِ احساس کی گہرائیوں میں غوطے لگائے، مشرق اور مغرب دونوں کی تہذیبوں کی لطافتوں کو چٹخارہ لے کر طبیعت کی ترنگ سے خوب خوب محسوس کیا۔ اور اداکاری سے اپنے احساس کی ضیافت میں ایک زمانے کو شریک کیا۔ اپنے میدان میں اس نے ایسی ایسی باتیں کر دکھائی ہیں کہ اس کو آج کی گُڑیا کہنا چاہیئے۔

۱۹۵۴ء میں جب ضیاء کی عمر چھبیس تھی۔ اور راقم کی اٹھائیس تو حسنِ اتفاق سے ہم دونوں لاہور میں یکجا ہوئے۔ ضیاء آسٹریلیا سے لوٹ کر آئے تھے۔ اور راقم انگلستان سے، دونوں بیقرار اور پھر سے آمادہ بہ فرار، ضیاء لندن کی اس اکیڈمی کا فیصلہ کیے ہوئے تھے۔ جہاں ایکٹروں کی تعلیم ہوتی ہے اور بندہ عازم تھا مانٹریال کا، ضیاء نے اپنے آبا (ہمارے تایا ابا) کو اپنے

ارادے سے آگاہ کر دیا تھا۔ تایا ابا ماڈل ٹاؤن (لاہور) میں ٹہلتے ہوئے
میرے ہاں پہنچے اور غمگین آواز سے بولے "ضیاء سٹیج کی تعلیم کے لئے
لندن کا تہیّہ کیئے ہوئے ہے، اس میدان میں کیا رکھا ہے۔ روزی کی
کوئی ضمانت اس فن میں نہیں ہے"۔ پھر فرمایا "یہ اپنے ارادے پر قائم
ہے"۔ ہماری کہاں سنے گا۔! اچھا جو اس کی مرضی"۔

چند برس بعد تایا ابا نے اسی میدان میں ضیاء کی کامرانیاں اپنی آنکھوں
سے دیکھیں، بیٹے نے اپنی اداکاری کے کمالات سے باپ کی اداسی دُور
کردی اور تایا ابا اپنے فرزند کے کارناموں پہ نازاں ہوئے۔

سچ تو یہ ہے کہ تایا ابا کی ۱۹۵۴ء والی اُداسی ایک طرح کی ستم
ظریفی تھی۔ اس لیئے کہ اداکاری کا چسکا بیٹے کو انہی سے ورثے میں ملا
تھا، تایا ابا کی ڈرامہ نوازی اور تھیٹر نوازی کے مشاغل کو لاہور کے
شائقین فن خوب جانتے تھے۔ لاہور کے سنٹرل ٹریننگ کالج میں
جن دنوں آپ پروفیسر تھے۔ ڈرامے سٹیج کرنے کا شوق آپ کا زوروں
پر تھا۔ چنخوف کا ڈراما منگنی کے عنوان سے آپنے سٹیج پر ترتیب دیا
دوسرا ڈرامہ چولہا ہا۔ ضیاء کو ایکٹ میں شریک کرنے کی غرض سے چھوٹے
چھوٹے پارٹ وضع کیئے۔ ضیاء میاں نہایت بانکی شیروانی ڈانٹے کر سٹیج
پر آئے۔ اس وقت آپ کی عمر دس سے کم ہی ہو گی۔

ان ڈراموں کی پیش کش کامیاب رہی تو خوشی میں کاسٹ کے گروپ
فوٹو کھینچے گئے۔ ہمارے افسانہ نگار دوست آغا بابر صاحب نے بھی ان
ڈراموں میں ایکٹ کیا۔ آپ کے پاس وہ فوٹو اب تک محفوظ ہیں

آپ نے مجھے دکھائے اور ساتھ ہی بتایا کہ ۱۹۶۰ء میں اخبار لیل و نہار کے کسی نمبر میں یہ فوٹو آپ نے ایک نوٹ کے ساتھ چھپوائے تھی۔

تایا آبا نے ڈرامے تصنیف بھی کئے، ان کے لکھے ہوئے ڈراموں کی ایک کتاب شائع ہوئی، اس کا عنوان مجھ کو یاد نہیں، سکول کے دنوں میں اول تا آخر میں نے پڑھی۔ اس کے ایک ڈرامے کا پلاٹ کچھ کچھ یاد ہے، یہ ایک مدرّس کے احوال کی تمثیل ہے۔ یہ مدرّس گیانی یعنی پنجابی کا سکول ماسٹر ہے۔ دنیاداری اس کو نہیں آئی، اس کی زندگی میں ایک بدنظمی ہے۔ عیار لوگوں سے نپٹنا اس کو نہیں آتا وہ لوگ اس سے برابر فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں۔

۱۹۵۴ء کے ذکر سے میں نے بات اس لئے شروع کی کہ اسی سال ضیاء لندن کو رخصت ہوئے اور میں کینیڈا کو، اس کے بعد امریکہ میں ملاقاتیں ہوئیں۔ نیویارک میں ان کی اداکاری براڈوے کے ایک تھیٹر میں دیکھی، مجمع کے ساتھ اٹھ کر کھڑی داد دی۔

ان کی فنکاری کے معرکے بیان کرنا ان سطور میں راقم کو منظور نہیں۔ یہ باتیں اہل وطن مجھ سے بہتر جانتے ہیں، بندہ تو ۱۹۵۴ء کے بعد سمندر پار ہی رہا۔ ضیاء کے ٹیلی ویژن کے کارناموں کی دید سے محروم رہا۔ میں تو ایک جھلک اس مقام کی دکھاؤں گا۔ جو ضیاء کو بچپن میں والدین اور بہنوں کے درمیان حاصل تھا۔

ضیاء کی اماں کا ذکر سب سے پہلے مناسب ہے، مرحومہ نے گزشتہ سال (۱۹۸۷ء) کے آخر میں وفات پائی۔ صبر و تحمل اور ایثار ان پر ختم

تھے، نہایت کم گو، اہل دنیا کے درمیان ہو کر بھی دنیا سے کچھ الگ تھلگ
شوہر اولاد پر جان چھڑکنے والی، صبر اور حوصلہ کا یہ عالم کہ تایا ابا پہ بڑا وقت
آئے تو بیوی کا پاک اور متحمل چہرہ دیکھ کر ان کو اپنی سراسیمگی پہ شرم آئے، دن
میں تین مرتبہ چولہا پھونکنا، ناشتہ سب کو کھلانا، ہنڈیا تیار رکھنا، آٹا
تھپ تھپا کر چپاتیاں تیار کرنا، یہ سب کام ہمیشہ اپنے ہاتھ سے کیا، لڑکا
جو نوکر رکھا۔ تو صرف اوپر کی بھاگ دوڑ کو، اواخر عمر میں جُز رسی کے خیال
سے نوکر بھی نہ رکھا، سودا بھی آپ ہی خرید کر لانا شروع کیا۔

ضیاء کی ماشاءاللہ پانچ بہنیں ہیں، ان سب کے جہیز کا سامان فراہم
کرنے کی ذمہ داری انہی پر تھی۔ تایا ابا اپنی تنخواہ ملتے ہی ان کو تھما دیتے
تھے۔ خرچ کو حالات کی اونچ نیچ سمجھ کر چلانے میں ان کو ایسا کمال حاصل
تھا۔ کہ اس معاملے میں تایا ابا نے ان کی استادی کو کبھی چیلنج نہ کیا۔ ہاتھ
روک کر روپیہ خرچنے کی صورت حال میں وہ بے بس ہو جاتی تھیں، وہ یہ
کہ ضیاء اپنے چھٹ پن کی کسی خواہش کے لئے آنکھ بچا کر ان سے کچھ روپے
مانگتا تو وہ پس انداز کئے ہوئے مال میں سے چپکے چپکے نہایت پھرتی سے
مطلوبہ رقم اس کے ہاتھ میں تھما دیتیں۔

تائی جی کو معلوم تھا کہ راقم اور ضیاء کے درمیان خاص قربت ہے، یہ
جاننے کی میں نے کبھی کوشش نہیں کی۔ کہ ضیاء نے تایا ابا اور تائی جی
سے راقم کے بارے میں کیا کچھ کہا۔ لیکن ان کو ضیاء اور داؤد کی محبت کا
علم تھا۔ چنانچہ جناب یہ سچ ہے کہ تائی جی مجھ سے ایک عجیب والہانہ
التفات سے پیش آتی تھیں۔ اور تایا ابا بھی اسی وجہ سے میری خاطر داری
پر مائل ہوتے تھے۔

تائی جی تو مجھ کو اس لئے خوش رکھتی تھیں۔ کہ میں ضیاء کو خوش رکھوں اور یہاں یہ حال تھا۔ کہ اس معاملے میں کسی کی ہدایت کی ضرورت ہی نہ تھی دن رات کا بھولی پن لڑکپن میں کسی کے کہنے سے تھوڑے ہی ہوتا ہے! یہ بات تو اپنے آپ ہوا کرتی ہے۔

اب تایا آبا کی کہانی سنیئے، ان کی زندگی کا سب سے بڑا ایچکولا انگریز کی سیاست سے متعلق ہے۔ ان کا شباب جذباتی اور جوشیلا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں ترکِ موالات کی آندھی آئی تو گاندھی جی اور مولانا محمد علی کے ساتھ لاکھوں لوگ اس تحریک میں شریک ہوئے۔ تایا آبا نے بھی اس تحریک کا علم ہاتھ میں لیا۔ گورنمنٹ کے محکمۂ تعلیم کی ملازمت سے اس سرگرمی کی پاداشں میں معطل کر دیئے گئے۔ تائی جی کا زیور رہن رکھ کے بمبئی کے ایک مہاجن سے قرض لیا۔ اور اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان کو روانہ ہوئے۔ وہاں لیڈز یونیورسٹی سے اصولِ تعلیم کے میدان میں ماسٹر آف ایجوکیشن کی ڈگری حاصل کی۔ اور پھر ہندوستان آکر نئے سرے سے اسی محکمے میں ملازمت شروع کی۔ تنخواہ کا گریڈ پھر سے نچلی سیڑھی سے شروع ہوا۔ اگر سیاست کی حماقت نہ کرتے۔ تو نوکری ہموار رہتی اور ترقی کرتے ہوئے بہت بڑی تنخواہ کو پہنچتے۔ تقدیر کو جو منظور تھا وہی ہوا۔

تایا آبا کی شخصیت کی دلکش باتوں میں ان کی ہنسی خاص چیز تھی، نہایت خوش رُو بزرگ تھے۔ اور متین اور باوقار بشرہ رکھتے تھے۔ لیکن لطیفہ سنتے تو ایسی ہنسی ہنستے کہ لطیفہ سنانے والے کو اپنی خوش طبعی کی پوری قیمت وصول ہو جاتی، قہقہے کا لفظ اس ہنسی کے لئے مناسب نہیں،

اس کے لیے تو کوئی نیا لفظ ہی گھڑنا پڑے گا۔ یہ ہنسی بلند بانگ ہنسی نہ تھی۔ اس کی آواز پرندے کے پر مارنے کی سی آواز تھی۔ تایا ابا بزرگ ہو کر بھی شریر بچوں کی طرح بے اختیار ہنستے تھے۔ جسے کھِل کھلا کہتے ہیں کھِل کھلا خموشی سے سینہ اور گردن جھٹک جھٹک کر مارا جاتا ہے کھِل کھلا مارنے والے کا کھِل کھلا جب ختم ہوتا ہے تو صاحب کھِل کھلا کے ذہن میں ایک چٹکلا تیار ہو جاتا ہے جسے کھِل کھلے کا شگوفہ کہنا چاہیئے۔

اس قسم کی ہنسی موسیقی کے استادوں کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے سے پیدا ہوتی ہے، میراثیوں کی حاضر جوابی اور ظرافت کے لطایف افسوس کہ اب تک جمع نہیں کئے گئے۔ ان لوگوں کی ظرافت کے کیا کہنے، تایا ابا کا بیسیوں استادوں سے میل جول تھا، آپ راگ رنگ کی محفلوں کی رونق تھے اس کے جلسوں کی صفِ اوّل میں ان کے لئے جگہ خالی کر دی جاتی تھی۔ ان ظریف و لطیف حلقوں میں برسوں اٹھ بیٹھ کر آپ نے مزاح، تفنن اور تمسخر کی چھوت میراثیوں سے حاصل کی تھی۔

موسیقی سے مرحوم کو جو عشق تھا اس کا کچھ بیان راقم کی ایک کتاب میں ہوا جو حال ہی میں دلّی کے مکتبہ جامعہ سے شائع ہوئی ہے[1] وہاں سے ایک عبارت یہاں نقل کی جاتی ہے۔

"ہمارے تایا ابا (پروفیسر شیخ خادم محی الدین) کا بیان ہے کہ ان کے تایا ابا کے شوق راگ کا آغاز جالندھر میں گشتی تھیٹر کمپنی کی آمد سے ہوا۔ تھیٹر کے گانے آج سے اسّی نوّے سال پہلے خاصے پکے راگ کے ڈھنگ

---

[1] اس کتاب کا عنوان ہے 'باتیں کچھ سُریلی سی'

سے بنائے اور گائے جاتے ہیں۔

تایا آبا کے ایام پیری میں میں نے ان کو انقرہ سے ایک خط لکھا اور اس میں اپنی اس آرزو کا اظہار کیا کہ اپنے مشاغل موسیقی کی یادیں قلمبند کریں۔ امید تو یہ تھی کہ کم سے کم ایک کتابچہ تو لکھ ہی دیں گے۔ میرے اصرار پر جب ذرا لکھنے بیٹھے تو ضعیفی کے باعث ایک مختصر مضمون سے زیادہ نہ لکھ سکے' یہ مضمون ادبی دنیا کے شمارۂ ششم میں چھپ گیا، عنوان اس کا یہ ہے، سنگیت کا گزشتہ دور، اختصار اتنا تھا کہ تشنگی اسی طرح رہی، جو بات سب سے مزے دار اور نوشتنی تھی۔ وہ اس مضمون میں بیان نہ ہوئی۔ یہ خوش قسمتی سے مجھ کو ضیاء محی الدین کی بہنوں سے معلوم ہوئی کہ طفلی کے دنوں میں تایا آبا گھر سے نکل جاتے اور دیر دیر تک غائب رہتے، دادا مرحوم کو تشویش کے ساتھ اس بات کی ٹوہ لگانی تھی کہ یہ لڑکا جاتا کہاں ہے' ان دنوں فیروز پور میں قیام تھا۔ چوری چوری شہر کے باہر تک تعاقب کیا، دیکھا کہ وہاں پہنچ کر فرزند ارجمند ایک تکیے کے مستوں کی بزم میں تلے آسمان کے شریک ہیں اور ایک مٹکا تھام کر اس پر تال دے رہے ہیں۔ دادا مرحوم ایک شیشم کے موٹے تنے کی آڑ میں کھڑے کچھ دیر تک دیکھا کیے اور سُنا کیے۔ پھر اوٹ سے نکل کر آگے بڑھے۔ اور نالیکار کا کان پکڑ کے اسے واپس گھر لائے۔ مگر یہ گت کی لت تھی۔ کچی نہ تھی اور نہ ہی وہ گھڑا کچا تھا۔

تایا آبا کو ہارمونیم کا شوق کیونکر ہوا اور اس پر راگ بجانے کی مہارت کیسے ہوئی یہ قصہ ادبی دُنیا والے مضمون میں درج ہے۔ لیکن ایک اور بات اس میں کسی وجہ سے بتائی نہیں گئی۔ وہ یہ کہ راگ رنگ میں تایا آبا بعہد جوانی اپنی پنجاب کی نوکری چھوڑ کر پونا جا پہنچے جہاں پنڈت وشنو دگمبر پلسکر کی

تحریک سے سنگیت کی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔ پنڈت جی کے چیلوں میں پنڈت ونایک راؤ پٹوردھن پیش پیش تھے۔ ایسے پائے کے پختہ کار گویوں کے حلقے میں تایا ابا نے چار سال گزارے اور ہارمونیم پر سنگت کرنے کی مشق جاری رکھی پٹوردھن جی کی سنگت پر ان کو خاص فخر تھا۔

ہمارے ایامِ طفلی میں تایا ابا ایک دفعہ لائل پور سے آئے دو چار روز کے قیام کے بعد بوقت رخصت والد مرحوم سے کہا کہ ہفتے بھر کو ایوب اور داؤد کو ساتھ کیوں نہ لے جاؤں۔ والد محترم بولے: "بہتر"۔ چنانچہ ایک ہفتہ لائل پور کی خوب سیر ہوئی۔ لائل پور کراچی کی طرح انگریزوں کا آباد ہوا غیر معمولی طور پر صاف ستھرا اور منظم شہر تھا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا، رات کو چھت پر چارپائیاں بچھتی تھیں۔ ضیاء محی الدین کی عمر چار سال تھی، خاکسار کی آٹھ برس، ایک شب لیٹے ہوئے تایا ابا نے ضیاء سے کہا، ہاں بلو! داتا ہے" والا گانا ہو جائے بلو (ضیاء) کا وجود ہی کیا تھا۔ چڑی برابر بدن تھا۔ لیکن بلو نے ایسے کڑکے کے ساتھ یہ گانا چھت پر لیٹے لیٹے گایا کہ دیسی اذان کا مزا آ گیا۔ ؎

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
جز نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

اب تک ضیاء کا یہ گانا یاد میں گونج رہا ہے۔ اس کے سُر راگ ضلع کافی کے ہیں اور بول یہ :-

داتا ہے ہمارا خدا، سب کا پالن ہارا
جگ بھر ہے محتاج اسی کا وہ ہے سب سے نیارا

ضیاء کو تایا ابا نے منہ سے بینڈ بجانے کا ایک طریقہ بھی سکھا رکھا تھا۔ بائیں ہتھیلی کو دائیں بغل میں دباؤ داہنے بازو کو تہہ کر کے بغل بجاتے

جاؤ اور ساتھ ساتھ یہ بول دہراتے جاؤ۔

ڈھوتو ڈھوتو ڈھو

ڈنگ ڈنگ ڈنگ

واقعی تن تنہا آدمی اس ترکیب سے پورے بینڈ کی اودھم مچا سکتا تھا۔

لائل پور میں سنگیت کے مربیّوں کی کمی نہ تھی۔ تایا ابا وہاں اس کا چرچا کرتے میں کسی سے پیچھے نہ تھا۔ استاد ملنگ خاں طبلہ نواز لائل پور کے ساکن تھے۔ اُس نسل میں ان کا مرتبہ طبلے کے فن میں سارے ہندوستان میں ایسا ہی تھا۔ جیسا کہ آج استاد اللہ رکھا کا ہے۔ فرق یہ ہے کہ استاد ملنگ خان کے باج میں نرمی زیادہ تھی۔ ہلکی ہلکی چوٹ سے میٹھی میٹھی نادھن دھن نا نکالتے تھے۔ کہ تال تھپکی ہی رہے ڈھول ڈھیّا نہ ہو جائے۔ یکھن جیسا نرم باج رکھتے تھے۔

لائل پور سے لاہور منتقل ہونے کے بعد تایا ابا نے لاہور میں سنگیت پر چار کا کام جاری رکھا۔ جہاں تک ممکن ہوا گانے بجانے کی بیٹھکوں میں پہنچے، ملازمت کے آخری دنوں میں پنجاب یونی ورسٹی کے شعبۂ موسیقی کی بنا ڈالنے میں شرکت کی اس شعبئے کے بانی چار بزرگ تھے۔

پنڈت جیون لال مٹو، آنجہانی ڈاکٹر ٹھاکر داس، آنجہانی سی۔ ایل۔ رلیا رام اور تایا ابا پروفیسر خادم محی الدین۔

جب آل انڈیا ریڈیو کی نشریات جاری ہوئیں تو تایا ابا نے فلپ ریڈیو خریدا، اس کا پوشش تائی جی سے سلوایا۔ ریڈیو کو پالتو جانور سے زیادہ عزیز رکھتے

تھے۔ رات چھن کر بمبئی اور دہلی اسٹیشنوں کے ٹھیٹ پروگرام تنہائی میں سنتے تھے۔ مرہٹہ پنڈتوں اور بائیوں کی بھگتی رس کی گائیگی ریڈیو پر سُن کر سوتے تھے۔

راقم نے چپکے چپکے کئی سال گانے کی مشق جاری رکھی۔ والد مرحوم کے انتقال کے بعد ایک روز اکیلا بیٹھا طنبورہ چھیڑ کر شدھ کلیان کی چیز "مندر باجو" گا رہا تھا۔ تایا ابا باہر کھڑے سنتے رہے۔ میں کچھ دیر بعد آنگن میں ان کے سامنے آیا تو بولے میں سمجھا۔ کوئی مرہٹہ ریڈیو پر گا رہا ہے۔ خوب ہمت افزائی فرمائی، چند روز بعد بارے دوپہر کے وقت میرے ساتھ بیٹھ کر ہارمونیم بجایا، مجھ سے پوریا کلیان سُنا، اس روز انبساط کے عالم میں تھے اور کشادہ دلی سے حوصلہ بڑھاتے رہے۔

ہمارے ابا جی سے تایا ابا ۶ برس بڑے تھے۔ دونوں کے تعلقات میں رکھ رکھاؤ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی تھا۔ یعنی جھجک بہت تھی، مزاج میں بھی فرق تھا۔ بعض بھائیوں کے درمیان باوجود عمر کے تفاوت کے اتحاد اور یار باشی کی بات ہوتی ہے ان کے درمیان یہ بات نہ تھی، دونوں اپنی اپنی جگہ اہل ذوق تھے۔ لیکن ہم بزم کبھی نہ ہوئے اپنی اپنی بزم رکھتے تھے۔"

تایا ابا کی عہدِ جوانی کی دو ایک تصویریں اتفاقاً دیکھنے میں آئیں اپنے یاروں کے ساتھ کرسی پر بیٹھ کر کھچوائی ہیں۔ کھلنڈرا پن ان سے صاف ظاہر ہوا۔ شوخی اور بانکپن کا انداز دیکھ کر جی خوش ہو گیا نہایت طرحدار شخصیت تھی۔ سرو قامت آدمی تھے۔

کلین شیو چہرے والے لوگوں کی ہندوستانی مسلمانوں میں یہ پہلی

نسل بھی ۔ تایا آبا کے والدِ ماجد یعنی ہمارے دادا فارسی کے استاد تھے اور ہمارے پردادا عربی کے تدریس، دونوں باریش بزرگ تھے۔ جب آبا نے جب ڈاڑھی منڈانے کا فیصلہ کیا ۔ تو خدا جانے دادا نے کیا کیا کہا۔ چپ ہو کر رہ گئے ہوں گے ۔ کلین شیو جلوہ آرائی آخر انگریز بہادر کے نمونے کے باعث دیکھتے دیکھتے عام ہو گئی ۔ استرے پھرنے لگے، حجاموں کے کاروبار کو فروغ ہوا۔

ضیاء محی الدین کے گھر کی فضا اب قارئین کے سامنے نمودار ہوتی جا رہی ہے، اس تصویر میں ایک رنگ اور بھرتا باقی تھا یہ بتا کر کہ ضیاء کی پانچ بہنیں ہیں اور سب ضیاء سے عمر میں بڑی، اور بھائی ضیاء کا ایک بھی نہیں ۔ بلا شبہ لاڈلا ہونے کی انتہائی صورت نظام فطرت میں یہی تو ہے، تعجب ہے کہ اتنا لاڈ کے باوجود یہ لاڈلا بگڑا نہیں، بالغ ہو کر ذمہ داری اور رکھ رکھاؤ والے اطوار کے ساتھ سوسائٹی میں داخل ہوا، یہ خدا کی دین ہے ۔

بچپن میں ضیاء میاں اپنے گھر میں ٹلّو کہلاتے تھے ۔ اس کو یاد کر کے پچھلے سال ہم نے ایک مصرعہ چسپت کیا ۔ ؎

جو اپنے گھر کا ٹلّو ہے وہ دنیا بھر کا ٹلّو ہے

اب ٹلّو کا ایک جلوہ ملاحظہ ہو، گرمیوں کا موسم ہے تایا ابا ماڈل ٹاؤن میں اپنا مکان بنوانے کی فکر میں ہیں ۔ اور وہیں جی بلاک میں ایک مکان کرائے پر لے کہ ہمارے گھر کے پاس ہی آ بسے ہیں ۔ ۔ اس گھر میں سب پچھلے پہر قیلولہ کر کے اٹھے ہیں ۔ اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر محمد اسحاق صاحب کے ہمراہ ہم بھی وہاں جا موجود ہوئے ہیں ۔ بہنوں کے درمیان ہمارا لاڈلا

ٹلّو اچھلتا کودتا پھرتا ہے اور تایا آیا سے سنی ہوئی ایک کہاوت کی اس نے رٹ لگا رکھی ہے "الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے"۔ لطف یہ کہ ٹلّو صاحب کہاوت کے معنی تو سمجھے ہی نہیں اور نہ سمجھنے کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں۔ کہاوت کا صوتی اثر ان کو بھایا ہے۔ بغیر معنی سمجھے اس کو بے تحاشا دہرائے جا رہے ہیں۔ بس انہی باتوں سے تو پنجاب کے دیہاتی لوگ بچپن کو بادشاہ عمر کہتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ٹلّو صاحب کہاوت کو یوں ادا کر رہے تھے۔ گویا کوئی چور ہے جو الٹا ہو گیا ہے۔ اور الٹا ہو کر کوتوال کو ڈانٹ رہا ہے۔ الٹے چور کے تصور سے ان کو برابر گدگدی ہوئی جا رہی تھی۔ اس وقت ان کی عمر دس برس سے کم ہی ہوگی۔ یہ ان کے قد آور ہونے سے پہلے کی باتیں ہیں۔

جب یہ چھٹی جماعت میں تھے اور راقم دسویں میں تو ایک دن گرمیوں کے آغاز میں یہ ہمارے ہاں آئے تو میں نے ان سے کہا چلو جامن کھائیں جامن کے ایک درجن درخت ہمارے احاطے کی حدوں پر استادہ تھے، اس گرم موسم میں جبکہ فاختہ کسی درخت کے پتوں میں چھپ کر گوگو کرتی ہے ضیاء سے خاکسار کی ایک عجیب گفتگو ہوئی ہیں یہ محسوس کر کے قدرے محظوظ ہوا کہ جو بات میں کہتا ہوں ٹلّو صاحب اس کو بالکل انجان معصوم کی طرح کان لگا کر ایسے سنتے ہیں گویا ارض و سما کے اسرار بیان ہو رہے ہیں۔ ان کے بھولے پن اور تحیر سے محظوظ ہو کر میں نے واقعی بے پر اڑائی اور من گھڑت انہونی باتیں بیان کرنی شروع کر دیں جو غالباً روحوں سے متعلق تھیں۔ چونکہ وہیں کھڑے کھڑے گھڑی گئیں اس لیے

حافظے میں نہیں رہیں۔ صاف یاد نہیں کہ یہ اوٹ پٹانگ ارشادات کیا تھے۔" اچھا ؟!" اس دن کے بعد راقم سے ان کا میل جول بڑھنے لگا۔ لیکن مساوات اور ہمجولی پن اُس سال شروع ہوا جب یہ چودہ یا پندرہ سال کی عمر میں ہائی سکول ختم کر کے لاہور کے گورنمنٹ کالج میں داخل ہوئے۔ بندہ اس وقت بی اے کا امتحان دے چکا تھا۔ کالج میں زندہ دل دوستوں کا ایک حلقہ رکھتا تھا۔ جن میں راجہ تجمل حسین (الطاف گوہر صاحب کے بھائی)، وجیہہ الدین احمد (مولانا صلاح الدین مرحوم ایڈیٹر ادبی دنیا کے فرزند) اور اعجاز حسین بٹالوی صاحب سے گہری الفت کا تعلق تھا۔

ضیاء کالج میں آتے ہی اس حلقے میں داخل ہو گئے ادھر حلقۂ ارباب ذوق کے ہفتہ وار اجلاس میں جانا بھی خاکسار کا معمول ہو چکا تھا وہاں بھی ضیاء ہمراہ ہوتے، پھر تو لاہور کی ہر سُو گردی (۔ یہ آوارہ گردی کے لئے روا دار لفظ ہے۔) روز کا معمول قرار پائی۔

ہم آہنگی اس حد تک پیدا ہو گئی کہ ہم دونوں کے اندازِ گفتگو اور خطابت بالکل ایک سے ہو گئے ۔ ہمارے بعض دوست کہا کرتے کہ اگر پس پردہ تم دونوں میں سے کوئی بولے تو پہچاننا مشکل ہو گا کہ یہ ضیاء محی الدین یا اس کا چچازاد برادر۔

آج ہم دونوں کے اسلوب الگ ہو گئے ہیں، کیوں نہ ہو۔ ضیاء نے اردو اور انگریزی دونوں کے لب ولہجہ کو ایسا درست کیا اور چمکایا کہ ان کے ہاں لوچ لچک اور تخلیقی کمال کو پہنچیں۔ بندہ قلندر آدمی ہے، انگریزی تو بے تکلف پنجابی اور امریکی لہجے کو ملا کر بولتا ہے، اردو

میں البتہ شین قاف درست رکھنے میں کوشاں رہتا ہے۔

۱۹۵۴ء کے ذکر سے یہ تذکرہ شروع ہوا تھا۔ ۱۹۵۴ء ہی کا ایک اور واقعہ آخر میں بیان کرتا ہوں۔ ضیاء ڈیڑھ سال آسٹریلیا میں رہ کر آئے تھے۔ اب انہیں ایکٹری کی ٹریننگ کے لئے انگلستان جانا تھا۔ مجھے کینیڈا کی ایک یونیورسٹی سے وظیفہ یاب ہونے کی امید تھی۔

آسٹریلیا میں جہاں یہ رہے وہاں گرمی خاصی پڑتی ہے۔ چنانچہ وہاں انہوں نے موسم کے مناسب ہلکے ہلکے چار پانچ سوٹ نہایت نستعلیق خریدے تھے جو بالکل نئی حالت میں تھے۔ اب ظاہر ہے کہ لندن کے سرد موسم کے لئے یہ سوٹ ان کو بے کار نظر آئے۔ مجھ سے انہوں نے اچانک کہا یہ سوٹ تم لے لو۔ میں ان دنوں کنگال آدمی تھا۔ یہ خلعت فاخرہ بر وقت مجھ کو عطا ہوئی۔ جھپٹ کر سوٹ قابو کئے، انگلستان کے ایک بنک میں کلھم سولہ پاؤنڈ اپنے حساب میں چھوڑ آیا تھا۔ ان کا چیک لکھ کر ضیاء کی نذر کیا۔ اور بنک کے مینیجر کو خط لکھا کہ حساب بند کر دیا جائے۔

مشہور اداکاروں کی اُترن حاصل کرنے کو لوگ مرے جاتے ہیں کوئی کسی اداکار کا استعمال کیا ہوا رومال لئے پھرتا ہے۔ کوئی مفلر، کوئی اس کی واسکٹ بڑی قیمت دے کر خریدتا ہے۔ ہماری قسمت کی یاوری دیکھئے کہ ضیاء کی نفیس اور نازک اُترن کس آسانی سے اپنے آپ ہمارے قبضے میں آئی، وہ سوٹ ایسے فٹ آئے کہ سبحان اللہ لاہور کی گرمیوں میں ان کو پہن کر کافی ہاؤس میں جا بیٹھا۔ اپنی جامہ زیبی پر دوستوں کی واہ

وابستگی ہماری خالی جیبی پر اس جامہ زیبی سے یوں پردہ پڑا رہا۔

ضیاء کے کردار کی ایک خاص بات دھیان میں آئی ہے۔ جس کا ذکر لطف سے خالی نہ ہوگا۔ اس کے فن کا وقار اور اس کی شان اس کو سوچ کر بہتر سمجھ میں آئیں گے۔ ہمارے لاڈلے نے ڈراموں اور فلموں میں جو پارٹ ادا کیے ہیں۔ ان میں مغربی اطوار کی جو دو حرکتیں کبھی شامل نہیں ہوئیں۔ اول بوس و کنار، دوم مغربی رقص۔ اپنی تہذیب کی حد سے باہر نکل کر دوسروں کی تہذیب کی باتیں اپنانے کے مسائل کا مزا لینا ہو تو مولوی نذیر احمد کے ناول ابن الوقت کا وہ باب پڑھیے جس میں ابن الوقت کے ہاں اس کے بھائی حجۃ الاسلام صاحب کی آمد کا بیان ہے۔ یہ بڑے نازک مرحلے ہیں۔ ایک شائستہ اور حساس آدمی جو اپنی رچی ہوئی تہذیب رکھتا ہے دوسروں کی تہذیب سے کچھ باتیں اخذ کرتا ہے تو جانچ سے کام لیتا ہے۔ مثلاً مولوی عبدالحق مرحوم (بابائے اردو) سفارت چین کے ایک بوفے ڈنر میں پہنچ کر بے حد پریشان ہوئے اور انہوں نے سفیر چین کو جتا دیا کہ کھڑے ہو کر کھانا سراسر بدتہذیبی ہے اور ان کو کرسی پیش کی گئی۔ ہماری پرانی تہذیب میں تو کھانا سب جوتا اتار کر ہاتھ دھو کر زمین پر بیٹھ کر کھاتے تھے۔ مولوی صاحب نے سر سید کی رہنمائی سے انگریزی کی تہذیب یہاں تک تو اختیار کر لی کہ کرسی میز پہ بیٹھ کر کھانے لگے۔ لیکن جب ان سے یہ توقع کی گئی۔ کہ کھڑے کھڑے منہ چلائیں تو آپ نے اس کو اپنے وقار کے منافی سمجھا اور صاف جتا دیا کہ یہاں پہنچ کر بات سمجھوتے کی حد سے باہر نکل گئی۔

مشرقی اور مغربی تہذیب کی آمیزش میں ایک نازک رکھ رکھاؤ کی

رہنمائی نہ ہو تو نہایت پھوہڑ شخصیت پیدا ہوتی ہے۔

ضیاء کی انگریزی اداکاری میں مغربی رقص اور بوس و کنار سے جو احتراز ہے اس سے ظاہر ہے کہ اس کے ہاں اپنے معاشرے کے جذبات کا پورا احترام ہے۔ بلکہ اس کو یہ بھی معلوم ہے کہ اس معاملے میں اگر اس نے ایک بار بھی سمجھوتا کر لیا تو اس کی طبیعت میں تہذیب کا جو صاف اور ملائم دودھ ہے وہ پھٹ جائے گا۔ ضیاء کے فن کا خاص وصف وضعداری ہے۔

بوسٹن　　　　　　　　　　داؤد رہبر

۲۷ر مارچ ۱۹۸۸ء

ساعتِ سفر کا پیام

# ضیاء محی الدین اور پاکستان ٹی وی

پاکستان میں ٹی وی کا آغاز ۱۹۶۴ء میں ہوا۔ پاکستان ٹی وی کا منصوبہ بہت بڑا منصوبہ تھا۔ ٹی وی کی نشریات کا آغاز تو کر دیا گیا تھا۔ مگر ایسے فنکار اور ماہرین موجود نہ تھے جو کام کو آگے بڑھاتے۔ اسی سوچ کے پیش نظر حکومت پاکستان نے بیرون ملک اپنے فن کار اور ماہرین کو آواز دی اور یہ ان فنکاروں اور ماہرین کی عظمت ہے کہ انہوں نے قوم کی آواز پر لبیک کہا۔ اُن میں ضیاء محی الدین بھی ایک ہیں۔ منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ اور ضیاء محی الدین کی خط و کتابت ملاحظہ فرمائیے۔

104

TELEGRAMS: "INBRO

GOVERNMENT OF PAKISTAN
MINISTRY OF INFORMATION & BROADCASTING

Rawalpindi, February 20, 1965.

D.O.No: 159/65-OSD(TV).

My dear Zia,

I am sorry I could not reply to your letter of 22nd January earlier. The Television Promoters Company was registered on 10th February and the first meeting of the Board of Directors was held on the 15th.

The Board agreed to your appointment on the staff of the Television Promoters Company on the following terms and conditions:

(i) consolidated salary of Rs.3,500/- per month or monthly emoluments as under:

| | | |
|---|---|---|
| Salary | - | Rs.2,500 |
| House rent including furniture | - | Rs. 750 |
| Car allowance | - | Rs. 250 |
| | | Rs.3,500 |

(ii) you would be entrusted with field work for improving programme-fare of the Television Stations operated by the Company; and

(iii) the initial contract would be for one year with two months notice on either side for termination of contract.

I shall be grateful to have your reactions to this offer as early as possible to enable me to assist the Company to proceed with their plans for employment of personnel of various categories.

With kind regards,

Yours sincerely,
Abdul Qayyum
(ABDUL QAYYUM)

Zia Mohyeddin Esquire,
C/O Christopher Mann Ltd.,
140 Park Lane,
London W 1.

حکومت پاکستان

وزارتِ اطلاعات و نشریات

راولپنڈی

۲۰ فروری ۱۹۶۵ء

مائی ڈیر ضیا !

مجھے افسوس ہے کہ مَیں آپ کے خط مورخہ ۲۲ جنوری کا جلدی جواب نہیں دے سکا۔
ٹیلیوژن پروموٹرز کمپنی ۱۰ فروری کو رجسٹرڈ ہوئی۔ اور اس کمپنی کے ڈائریکٹران کی پہلی میٹنگ ۱۵ فروری کو منعقد ہوئی۔

بورڈ نے ٹیلی وژن پروموٹرز کمپنی کے سٹاف میں آپ کی تعیناتی کی منظوری مندرجہ ذیل تصریحات اور شرائط پر دی ہے۔

۱ کل تنخواہ (کنسالیڈیٹیڈ) ۳۵۰۰ روپے ماہوار ہوگی۔

تفصیل یوں ہوگی:

| | | |
|---|---|---|
| تنخواہ | ۲۵۰۰ | روپے |
| کرایہ مکان بمعہ فرنیچر | ۷۵۰ | " |
| کار الاؤنس | ۲۵۰ | " |
| کُل میزان | ۳۵۰۰ | " |

۲ آپ کے ذمہ کمپنی کے ٹیلی وژن سٹیشنوں کے پروگرام کی ترقی کا کام ہوگا۔

۳ یہ معاہدہ پہلے ایک سال کے لئے ہوگا اور اس معاہدہ کو ختم کرنے کے لئے ہر دو

پارٹی کو دو ماہ کا نوٹس دینا ہوگا۔

مجھے آپ کے جواب کا جلد سے جلد انتظار رہے تاکہ میں کمپنی کو سٹاف کی تعیناتی میں ضروری مدد مہیا کر سکوں۔

آپ کا مخلص
عبدالقیوم

لندن

۶ مارچ

مائی ڈیئر قیوم !

آپ کے خط مورخہ ۲۰ فروری ، جو مجھے آکسفورڈ سے واپسی پر ، پرسوں رات موصول ہوا ، کا بہت شکریہ ۔

آپ کے ٹیلی ویژن کے لئے کچھ کرنے کے خیال نے مجھے محظوظ کیا تھا جس کے بارے میں پچھلے سال بات ہوئی تھی ۔ اور مجھے اب بھی یاد ہے ، لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا محظوظ ہونے کو بورڈ نے میرے "لالچی" ہونے کے معنی پہنائے ۔ اور مجھے ایک سال کے لئے آنا ہے ۔ ٹھیک ہے ۔ لیکن یہ میری پوزیشن کے مطابق تو ہو ۔

میں مکان اور فرنیچر کرایہ پر لینے کے سودا بازی یا بحث میں نہیں پڑنا چاہتا ۔ بورڈ کو یہ ذمہ داری خود اٹھانا پڑے گی اور یہ میرے آنے سے پہلے ہو گی ۔ ایک اچھے فرنیچر سے آراستہ ۔ صاف ستھرا مکان ، ٹیلی فون ، بجلی ، میری ذمہ داری نہیں ہو گی ۔ ان ضروریات کا خرچ سے میرا تعلق نہیں ہو گا ۔ یقیناً یہ بات ہماری پچھلی ملاقات پر طے ہوئی تھی ۔

کچھ اور باتیں ذرا وضاحت طلب ہیں ۔ کار کا خرچ ۲۵۰ روپے ماہانہ سے یقیناً زائد ہو گا میں خرچ ۳۰۰ روپے رکھتا ہوں یا اگر بورڈ مجھے ڈرائیور ، پٹرول اور گاڑی کی سروسنگ (یعنی کار کے علاوہ) تو یہ زیادہ بہتر اور آسان ہو گا ۔ متفرق اخراجات کے لئے ایک رقم ( EXPENSE ) جو ۲۵۰ روپے ماہانہ ضروری ہوں گے ۔

جب میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جاؤں گا ، تو آپ نے اس کے متعلق کچھ نہیں لکھا ، کیا

آپ سفر خرچ کی صراحت کریں گے۔ جب میں پچھلی دفعہ آپ کے ہاں تھا، تو مجھے ہوٹل خطرناک حد تک مہنگے لگے۔

میں بتاتا چلوں کہ میں نے کوئی ایسا مطالبہ نہیں کیا، جو متفق طور پر طے شدہ نہیں تھا سوائے ( EXPENSE ACCOUNT ) کے۔ سوچنے کے بعد میرا خیال ہے کہ یہ اکاؤنٹ بہت ضروری ہے۔

اگر "فیلڈ ورک" کی تصریح کر دیں، تو میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔ "امپروومنٹ" ایک عام سی بات ہے۔ میرے خیال میں سب سے فوری چیز یہ ہے کہ پروگرام کو نئے سرے سے ترتیب دوں اور موجودہ پروگرام کی حیثیت دیکھوں۔ نئی سوچ سے ان کو سنواروں اور بہت ہی اہم پروگرام، یعنی فنکاروں کی ٹریننگ سے معاونت پیدا کروں۔ مجھے امید ہے کہ ان چیزوں میں اپنی مرضی سے کام کرنے کی آزادی ہوگی۔

آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔

مخلص

ضیا محی الدین

پوسٹ بکس ۲۳۰
راولپنڈی
۱۰ اپریل ۱۹۶۵ء

مائی ڈیر ضیا!

مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے خط کا جلدی جواب نہ دے سکا۔ مجھے بیماری نے ہسپتال میں داخل ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور یقین جانیئے، یہ خط میں ہسپتال کے بستر سے لکھ رہا ہوں۔

مجھے آپ کا ۲ مارچ ۱۹۶۵ء کا خط موصول ہوا۔ اس میں آپ نے بجا طور پر فرنیچر سے آراستہ فلیٹ کا کہا تھا۔ مجھے آپ کو مطلع کرتے ہوئے خوشی ہے کہ ٹیلی وژن پروموٹرز کمپنی نے آپ کو فرنیچر سے آراستہ فلیٹ مہیا کرنے سے اتفاق کیا ہے۔ اسی طرح آپ کا کار کا معاملہ بھی حل کرنا ہو گا۔

شاید میں اس وقت آپ کو وضاحت سے بتا نہ سکا ہوں گا۔ جب میں نے آپ کے "فیلڈ ورک" کے متعلق بات کی تھی۔

آپ کی اوّلین ڈیوٹی یہ ہو گی کہ آپ لاہور، ڈھاکہ اور دوسرے ٹیلی وژن سٹیشنوں پر موجود ہوں۔ تاکہ آپ پروگراموں کی بہتری کے لئے عملی راہنمائی کر سکیں۔ اصل میں مقصد یہ ہے کہ آپ کی "جینئس" سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکے (میں لفظ "جینئس" کو کوٹیشن میں لکھتے ہوئے اپنی مسرت کو تسکین دیتا ہوں) تاکہ آپ ہمارے کارکن لڑکوں کو

عملی تربیت دیں، کہ پروگرام کس طرح کیئے جاتے ہیں، پروڈیوس اور ہدایات اور پیش کیسے کیئے جاتے ہیں، باوجودیکہ سٹوڈیوز میں بہت سی سہولتوں کی کمی ہے۔ تاوقتیکہ نئے سٹوڈیوز نہ بن جائیں اور نئی مشینری نہ لگ جائے۔ آپکے جواب کا انتظار ہے۔

نیک خواہشات کے ساتھ !

آپ کا مخلص
عبدالقیوم

**PAKISTAN TELEVISION**
**KARACHI CENTRE**
**Cordially invites you to**

# The Zia Mohyeddin Show

8.00 P.M. ON Wed, 30/8/72

**AT THE FLEET CLUB**
NAPIER BARRACKS KARACHI

YOU ARE REQUESTED TO BE IN YOUR SEAT BY 7.30 P.M. THE GATES WILL BE CLOSED AT 7.45 P.M., AND THE SHOW WILL GO ON CAMERA SHORTLY THEREAFTER

آپ سے درخواست ہے کہ آپ ہال میں ساڑھے سات بجے تک تشریف لے آئیں۔ پونے آٹھ بجے دروازے بند ہو جائینگے اور پروگرام کی عکس بندی شروع ہو جائیگی

ONE CARD FOR ONE PERSON.

## ضیاء محی الدین شو

ضیاء محی الدین نے اپنے شو ضیاء محی الدین شو کا آغاز ۱۹۷۱ء میں کراچی سے کیا۔ ۱۹۷۲ء میں یہ شو لاہور سے شروع ہوا۔ یہ ہفتہ وار پروگرام تھا۔ اور اس کے EPISODES 7 اوپن ایر تھیٹر اور واپڈا آڈیٹوریم میں ہوئے۔ اس شو میں ملک کے ایک ناول نگار اور نوجوان نسل کے درمیان تلخی پیدا ہو جانے کی وجہ سے وقتی طور پر شو کو بند کر دیا گیا۔ لیکن وسط ۱۹۷۲ء میں پھر اسے کراچی سے پیش کیا گیا۔ اس شو میں جن شخصیات نے شرکت کی ان کے اسمائے گرامی کچھ یوں ہیں

بیگم نصرت بھٹو، رفیق سہگل، مشتاق یوسفی، جوش ملیح آبادی، زاہدہ سلطانہ معین اختر، خوش بخت شجاعت، حسنہ، حفیظ جالندھری، صبیحہ خانم، ایم اسلم، وحید مراد، شمیم آراء، محمد علی، رونا لیلی، تیر سلطانہ، نیلو، دیبا، سلطان محمود آشفتہ، منور ظریف، مینا داؤد، خالد عباس ڈار، پروفیسر غلام حسین کھٹک، مسز زا ے جے، ناہید صدیقی مہاراج کتھک، اعجاز حسین بٹالوی، نیا، اشفاق احمد، صفدر میر، سب رنگ پان والا، نشو، تصور خانم، ارجمند شیخ، منیر حسین، ریحانہ صدیقی، طاہرہ مسعود چودھری ظہور الہی، عابد حسن منٹو، الیتق احمد، غلام علی، اس شو نے پاکستان ٹی وی میں اسٹیج شو کی روایت کی بنیاد رکھی۔

''یعنی اب جب کہ میں وہ زمانہ یاد کر رہا ہوں تو ضیاء محی الدین کی شخصیت کے بہت سے پہلو میرے سامنے آرہے ہیں لاہور میں جو شو ہوا تو اس کی پیشکش میرے ذمے تھی۔ تم جانتے ہو کہ ایسے پروگرام جس میں مختلف النوع کی شخصیات کو بلایا جاتا ہے۔ خاصا مشکل کام ہے ہر شخص کی اپنی طبیعت

مزاج اور آنے یا نہ آنے کی اپنی وجوہات ہوتی ہیں۔ ضیاء نے یوں تو سب پروگرام کی شخصیات کو خود ہی اٹھا لیا۔ اور بڑی آسانی سے لے آیا۔ مگر ایک شخصیت کا واقعہ یاد آ رہا ہے۔ اُسے پروگرام میں لانا گویا جوئے شیر لانا تھا۔ ہماری فلم انڈسٹری کی معروف ترین شخصیت میڈم نور جہاں کو بلانے کا مرحلہ درپیش آیا۔ میں اور ضیا ان کے ساتھ دو چار ملاقاتیں کر چکے۔ مگر وہ مکمل طور سے حامی نہیں بھر رہی تھیں۔ خیر فیصلہ یہ ہوا کہ وہ پروگرام میں اس شرط پر آئیں گی کہ ان کا کہا ہوا ایک لفظ بھی نہیں کاٹا جائے گا۔

میں نے اور ضیاء نے ایک ساتھ ایک دوسرے کو دیکھا اور دل ہی دل میں بے شمار باتیں سوچنے لگے مگر چونکہ انہیں پروگرام میں لانا تھا لہٰذا ان کی اس بات کو مان لیا۔ اور کہا جیسا آپ کہتی ہیں ہمیں منظور ہے اب میں یہاں ضیاء محی الدین کے اس کمال کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ کہ اس نے اس قسم کا سوالنامہ تیار کیا کہ جس میں کوئی ٹی وی کی پالیسی کے خلاف جواب کی توقع نہ رہی۔ ریکارڈنگ وائڈرا آڈیٹوریم میں انجام کو پہنچی۔ لوگ جانے لگے ہال تقریباً خالی ہو گیا۔ میں "او بی وین" سے اتر کر ہال میں آیا ضیا اسٹیج پر کھڑا تھا مجھے دیکھتے ہی اس نے ڈھائی فٹ اونچے اسٹیج سے چھلانگ لگائی اور مجھ سے آ کر لپٹ گیا۔

"کیسا رہا؟"

"کمال کر دیا تم نے"، میں نے کہا کیونکہ ہمیں امید تھی کہ اب کوئی ایسی بات ہے ہی نہیں جو پالیسی کی ضد میں آتی ہو ...... مگر میڈم نے ہمیں نہ چھوڑا۔ اس پروگرام کی ایڈیٹنگ میں ان کا بڑا صاحبزادہ اکبر شوکت ہمارے ساتھ رہا۔

(یادِ رحیات سے گفتگو مارچ ۸۸ء)

## پائل

ضیاء محی الدین شو کے بعد ضیاء محی الدین نے ۱۹۷۴ء میں پائل کے نام سے پروگرام پیش کیا اس میں ناہید صدیقی رقص پیش کرتی تھیں اور سکرپٹ اور کمپیئرنگ کے فرائض ضیاء محی الدین دیا کرتے تھے ۔ یہ پروگرام کس قدر بھرپور تھا ۔ اس کا اندازہ ہمیں اس زمانے کے اخبارات سے ہو جاتا ہے ۔ یہاں قارئین کے لئے اس زمانے کا لکھا ہوا ضیاء محی الدین کا ایک "سکرپٹ" پیش کیا جا رہا ہے جس سے معلوم ہو سکے گا کہ کلاسیکی رقص اور موسیقی پر ضیا کتنی دسترس رکھتے ہیں ۔

"مختلف کلاسیکی ناچوں میں کہانی بیان کرنے کا طریقہ اور اس کا اسلوب بھی مختلف ہے یعنی "بغیر الفاظ کے بغیر ہونٹ ہلائے" اظہار کا بیان جس کا ہمارے ہاں اچھا خاصا لفظ ہے نرت ۔

اب بعض اس قسم کے کلاسیکی ناچ ہیں جن میں نرت کے خطوط ذرا موٹے ہوتے ہیں ۔ لیکن کتھک میں نرت کے ذریعے جذبات کا ایک ایسا احاطہ بنانا ہوتا ہے جو کہانی کی فضا کو قائم کرے یہ نہیں کہ پوری کہانی بیان کی جائے ۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ کہانی کی لفظی ترجمانی نہیں کی جاتی ۔ بڑے بڑے رقص کرنے والے عام طور پر کہانی یا گائیکی کی ایک سطر پکڑ لیتے ہیں اور پوری کہانی کا متن اسی ایک ٹکڑے کی ادائیگی سے بیان کرتے ہیں ٹھمری انداز کی نرت میں تو پاؤں کو بھی حرکت میں نہیں لایا جاتا ۔ صرف چہرے اور آنکھوں کا سہارا لیا جاتا ہے ۔ آنکھوں کا خاص طور پر، ہاتھ اور

جسم کے خم کی اہمیت بھی نسبتاً کم ہو جاتی ہے۔ بھاؤ بتانے کا محاورہ
تو آپ نے سنا ہوگا۔ اب ترجمانی کا کمال یہ ہے کہ ایک ہی ٹکڑے
کو ان گنت معنی دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً کون گلی گیو شام۔ اب صرف
گلی کا مفہوم ہی بیان کرنے کے کیسے کیسے طریقے ہیں۔

سرمہ لگانا بہت عام سی چیز ہے لیکن آنکھ میں سرمہ کی لکیر
کو اگر لمبا کھینچا جائے تو یہ اشارہ گلی کا تصور پیش کرتا ہے۔ بال۔
زلفیں بھی ہیں۔ اور گہری اندھیری رات بھی ہے اس طرح کی
بے شمار مثالیں ہیں۔ نرت کا جو نمونہ ناہید صدیقی آپ کے سامنے پیش
کریں گی۔ اس میں جان بوجھ کر صرف ایک بھول پہ ایک پتی پر
ساری توجہ مرکوز نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ وہ تصور چند گھرانوں
تک محدود ہے اس لئے مبہم ہوگا، آپ کے سامنے اس وقت
چار یا پانچ موسیقی کی بندشوں کی ترجمانی کریں گی۔

کت دیس گیو سیاں رے

کت دیس گیو۔ کت دیس گیو

کتھک میں کہانی کا نقشہ گت سے شروع ہوتا ہے اور بڑے
دھیمے اور لطیف طریقے سے یوں سمجھ لیجئے کہ جاپانی مصوری کی

طرح کتھک میں نرت کی لکیریں اور بیانیہ حصہ بڑی کفایت
شعاری سے کھینچی جاتی ہیں۔

اس سے پہلے میں نے ذکر کیا تھا۔ کہ نرت میں اشارے
اور کنایے کو بہت دخل ہے مقصد تفصیل سے بتانا نہیں ہوتا۔ دیکھنے
والوں کو صرف اسی قدر بتایا جاتا ہے کہ اس کی مدد سے تصویر

کے باقی کے رنگ وہ خود بھر سکیں۔

عشق، ہجر اور فرقت مدقص میں اگر فنکار کو اپنی تڑپ کا اظہار یوں کرنا ہے۔ کہ وہ سینے کو تھامے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ قدرے بھونڈا انداز ہو گا۔ لیکن اگر اسے یوں بیان کیا جائے کہ ایک مہجور چکور چاند کی طرف اُڑا جا رہا ہے تو یہ زیادہ تاثر پیدا کرے گا۔ اس کو رقص پیش کرنے والا اپنے ہاتھوں سے بیان کرے گا۔ جو علامت ہے پرندوں کی پھڑ پھڑاہٹ کی۔

بیان کی اتنی بات ہوئی ہے تو ذرا گت نکاس کی گفتگو بھی کر لوں۔ بندھا ہوا طریقہ یہ ہے کہ کہانی کا نقشہ جونہی گت کے ساتھ شروع ہوتا ہے فنکار تال کے ان تین چار ماتروں کا استعمال کرتے ہوئے آگے آتا ہے جو خالی سے پہلے ہوتے ہیں۔ یہاں وہ کتھک کے مخصوص انگ میں کھڑا ہو گا۔ اور پھر جیسے ہی سم آتا ہے چال یا گت شروع ہو جاتی ہے۔ مختصر سی خاموشی کے بعد گھنگھروؤں کی جھنکار بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔

گتیں معنی خیز یوں ہوتی ہیں کہ ان سے دیکھنے والوں کو اس کردار اور کہانی کا اشارہ ملتا ہے جس کی تصویر پیش کی جا رہی ہو چالوں میں تو مور چال، ہرن چال، ہنس چال وغیرہ بھی شامل ہیں جان عالم واجد علی شاہ کی دو کتابیں صوت المبارک اور غنچہ رنگ میں گتوں سے متعلق بہت دلچسپ بیان ملتا ہے۔

ناہید صدیقی اس وقت جو ناچ پیش کر رہی ہیں۔ اس میں کتھک کی چند ایسی امتیازی باتیں آپ کو ملیں گی۔ جن کا میں

نے ابھی ذکر کیا ہے یہ ناپ ایک بار روایتی انداز میں فنکار پہ ختم ہوگا۔"

## مارخیم

ضیا محی الدین ٹی وی کے ساتھ ساتھ پاکستانی عوام کو ڈرامہ اور اسٹیج شو کے پروگراموں سے بھی محظوظ فرماتے رہے۔ راولپنڈی سے آپ نے ایک فنکار کے نام سے آغا ناصر کا ترجمہ کردہ مارخیم پیش کیا جسے بے حد پسند کیا گیا۔

"MORNING NEWS," MONDAY OCTOBER 19, 1970.

TV REVIEW

### *Zia thrills viewers in "Markhem"*

**THE opening play in the series "Aik Khail Aik Fankaar" turned out to be an eminently successful presentation of the Rawalpindi-Islamabad TV. On the surface, an ordinary crime story with the most ordinary of motives, "Markhem" bared the inner-most desires, turmoils and aspirations of the stereotyped underdog in a manner that was more true to life than any of the previous presentations of the Pakistan Television Corporation.**

The formidable Zia Mohyedin needs no introduction to Pakistani audiences and he easily carried off the palm in "Markham". Had it been another "Fankaar" of a lesser calibre, he would have certainly bored the daylights out of any sensible TV audience because the new series proposes to cover almost an hour for each play.

As it turned out, Zia not only succeeded in capturing the attention and interest of the audience almost single handedly, he also maintained a fair degree of suspense right through to the end.

"Markhem" was the story of a man, who, after receiving a few hard knocks from life, decides to grab "the sorry scheme of things entire" in his own hands and remould it by force he achieves what he never could hope to otherwise—wealth which is regarded as a passport to comfortable and secure existence.

He murders the owner of a curio shop, a little old man whom he believes to be vulgarly wealthy. His first reaction is to find the old man's ill-gotten wealth and bolt. But he is in no mental state to think clearly; he finds a cigarette butt goes all over the place looking for a match box.

By the time he finds one, his senses are jarred by the appearance of a customer who

12.

asks for the old man but finally leaves

**BIZARRE IMAGES**

Markhem begins to hunt wildly around for the old men's key bunch but, in the process, he comes up against all sorts of accusing merchandise—a multitude of statues whose eyes glare at him till they turn into the very eyes of the murdered man; musical instruments that seem to raise an alarm; a roomful of trick mirrors from which the many bizzarre images of his form laugh back at him.

Eventually, he runs into an old phonograph with the record of a lullaby on it which awakens in him a tender nostalgia of his mother. His mind wanders back through the sands of time uncovering the various images of his unfortunate childhood.

He ends up examining these images, evaluating them and trying to exonerate himself of the crime—a process called "justification" in the parlance of psychologists.

He ends up examining these was society that, forced him into murder but finally ends up chiding himself for being what he is—a coward.

"Let me tell you where the key is and get out of here before the old man's maid servant gets here with his lunch," urges commonsense. But a strange listlessness has descended on him by now and somehow escape doesn't seem to matter any more.

The important thing, he feels, is to convince his conscience that he is not guilty. But he realises with shame that he has never done anything which he can truly be proud of.

It is at this cruicial moment—when he is standing on the crossroads of a great psychological crisis—that the maid arrives and Markhem experiences a moment of sheer panic.

What should he do? asks his consciousness. "Kill her too!"

mocks his conscience at him.

"All right, I'll show you that I can be brave; I'll do something I can truly be proud of," he retorts .... and surrenders himself.

**FULL MARKS**

One significant feature of "Markhem" which made it truly outstanding was that throughout it brought into full play the various stage props which, in other plays, are often used merely as decorative pieces. The gimmick was calculated to break the monotony and it proved eminently successful. Never before has the technique been used effectively in a Pakistani production.

Full marks to "Markhem". If the Rawalpindi-Islamabad TV keeps up the good beginning it has made, it will not only force the standard of the Pakistani plays up but will also help improve acting standards.

In the sports repertoire of the KTV, "Maharat" last week proved to be an improvement on the previous ones. It provided interesting historical facts for the benefit of young hockey fans together with an interesting interview with Mr. Firoz Khan.

Quite the contrary, however, was the "Studio Theatre" which was more like a study in torture than anything else. Must the KTV be perpetually ruining our Friday nights for us?

If all those beggars thought they were great thespians, they were mistaken. So was the producer of "Kashkole". Or, was it that the KTV was trying to discourage begging among its viewers? Dishing out a beggars' galore for entertainment is anything but reasonable.

Incidentally, what was Kori Shah anyway, a saint or a beggar? Or can't the KTV producer distinguish one from the other?

Funny thing. Beggars have been quite in the focus lately. There was the remark in "Aankh jo kutch dekhti hai" about the affluent not patronising beggars. "Aankh . . . " had better watch out lest it should get too sharp to cut itself beyond repair. The programme has great potential if only it is wisely handled.

**RIP VAN WINKLE**

"Tasveer-i Shehr" was commendable last week in that it definitely aimed at making this city a better place to live it. Its programme "Milawat" (adulteration) really touched upon one of the major problems of this city. It unearthed a number of shocking facts to wake up the Rip Van Winkles responsible for stamping out adulteration. But the Tasveer's compering can still be improved.

"Roz-o-Shab" seems to be constantly on the decline ever since its present compere and producer have taken over. For one thing, it has grossly reduced the coverage of social and cultural events in the city and for the other, the selection of events leaves much to be desired.

In fact, watching Roz-o-Shah, one gets the feeling that pretty little is happening in the city in the social and cultural fields. And what is more, there is no sense of proportion in the selection and treatment of these events.

As for "Bachchon Ka Akhbar", one feels that if the KTV wants to get the kids interested in everyday affairs, there is nothing wrong with it. But why not limit their new bulletin to affairs that are most likely to interest them.

The B.A. results are hardly the thing that would arouse any interest among children. In fact, they seemed even a little above the head of the little news reader.

What is needed is to limit the range of the news coverage to the activities of children keeping in view the age limit the KTV authorities have defined for this programme

## ضیاء محی الدین کے ساتھ

پاکستان ٹی وی سے آپ نے "ضیاء محی الدین کے ساتھ" ایک نیا پروگرام ۱۹۷۵ء میں پیش کیا۔ یہ ادبی سماجی مسائل کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح سے بھرپور پروگرام تھا اس پروگرام کے عنوانات حسب ذیل تھے

تماشش

ٹیلی فون

نظیر اکبر آبادی عوامی شاعر

بس اور رکشاؤں پر اشعار

اشتہارات

جولیس سیزر کی تقاریر

ادیبوں کے خطوط

آخری فیتہ (سیموئل بیکیٹ کا کھیل)

"ضیاء محی الدین کے ساتھ" کے سلسلہ کا آخری پروگرام مشہور اور منفرد ڈرامہ نگار سموئیل بیکیٹ کے کھیل سے ماخوذ تھا۔ اس کھیل کا نام "آخری فیتہ" تھا اس میں ضیاء محی الدین نے ایک ستر سال کے بوڑھے شخص کا رول اتنی مہارت اور ہنرمندی سے ادا کیا کہ اس سلسلے میں ذوالفقار احمد بخاری جو اس زمانے میں کراچی ہی میں مقیم تھے۔ اسی شب انہیں خط لکھا۔

"عزیزِ من دعا۔ کل ہی رات کو سوا دس بجے جی چاہا کہ بھاگ کر جاؤں اور تم کو گلے لگا لوں پھر خیال آیا کہ پروگرام ریکارڈ کیا ہوا ہو گا۔ گلے کس کو لگاؤں گا۔ آج دن بھر لفظ ڈھونڈھتا رہا۔ کہ تمہارے کل کے پروگرام کی تعریف کس طرح کروں۔ مگر عاجز رہا۔ مقاماتِ عقل تو کسی کی نقل کر کے طے کر لیتا ہوں۔ لیکن مقام عشق میں کھویا گیا یہ دیوانہ۔ تم نے کل جو پروگرام کیا اس کی حرکات سکنات توقف میں وہ کفایت شعاری تھی کہ آج تک تو میں نے نہ یہاں دیکھی نہ سمندر پار۔ اللہ تم کو جیتا رکھے۔ جی بہت خوش ہوا بہت ہی خوش۔ کبھی ملو تو تم کو گلے لگا لوں۔ تم کو اور تمہاری بیگم کو دعائیں۔

خاکسار

ذوالفقار　　　　یکم جون ۷۵ء

ضیاء محی الدین نے متفرق پروگراموں کے کمپیئرنگ اور میزبانی کے فرائض بھی ادا کئے۔ ان میں

امریکن جاز نواز کے پروگرام کی میزبانی اور
ٹیبل ٹینس کی کمنٹری بھی شامل ہے

اس کے علاوہ ٹیلی وژن لاہور سنٹر سے نوید شہزاد کی میزبانی میں ہوتے

والے پروگرام "محفل" میں بھی مہمان کے طور پہ آئے۔ اس پروگرام میں جس کا ذیلی عنوان "محبت" تھا۔ انہوں نے بے شمار اشعار سنائے اور ناظرین اور تماشائیوں سے بے پناہ داد پائی۔ اس پروگرام کے پروڈیوسر غالباً اختر وقار عظیم تھے۔

# تجھے یادگار بنا دیا
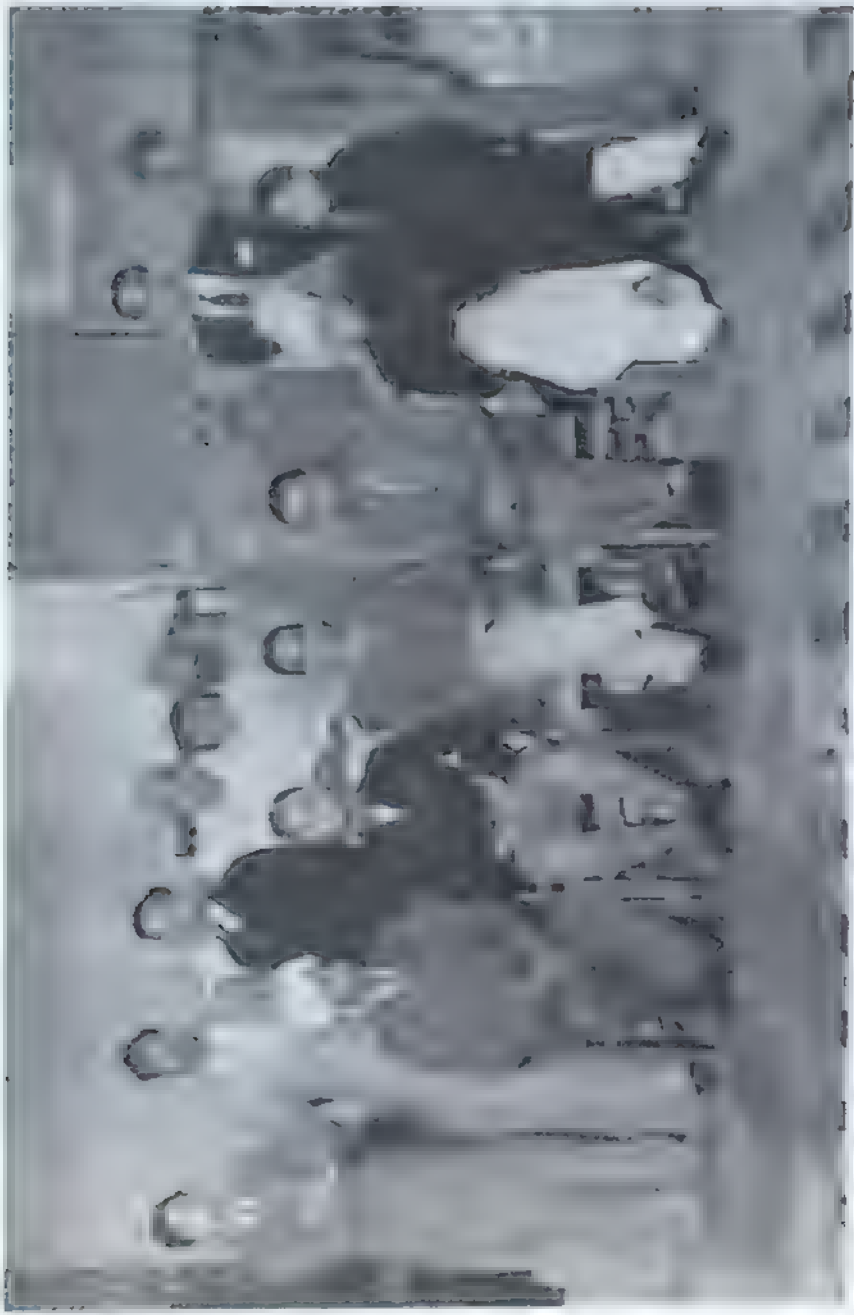
اسٹیج پر پہلا ڈرامہ "دیوتا" کی کاسٹ اور منتظمین کے ہمراہ

مصنف اور ہدایت کار خادم محی الدین کرسی پر درمیان میں بیٹھے ہیں (۱۹۴۱).

آرٹس اکیڈمی کا دورۂ جاپان

شادی کے موقع پر آرٹس اکیڈمی کے فنکاروں کی طرف سے دی گئی ضیافت

زمانۂ طالب علمی کی چند یادگار تصاویر

داؤد رہبر کے ساتھ ایک یادگار تصویر (دائیں سے دوسرے)

پاکستان ٹیلی ویژن کے پروگرام "محمل" میں۔ نوید شہزاد اور ضیاء محی الدین

اکلوتے بھائی (ضیاء محی الدین) کی پانچ بہنیں
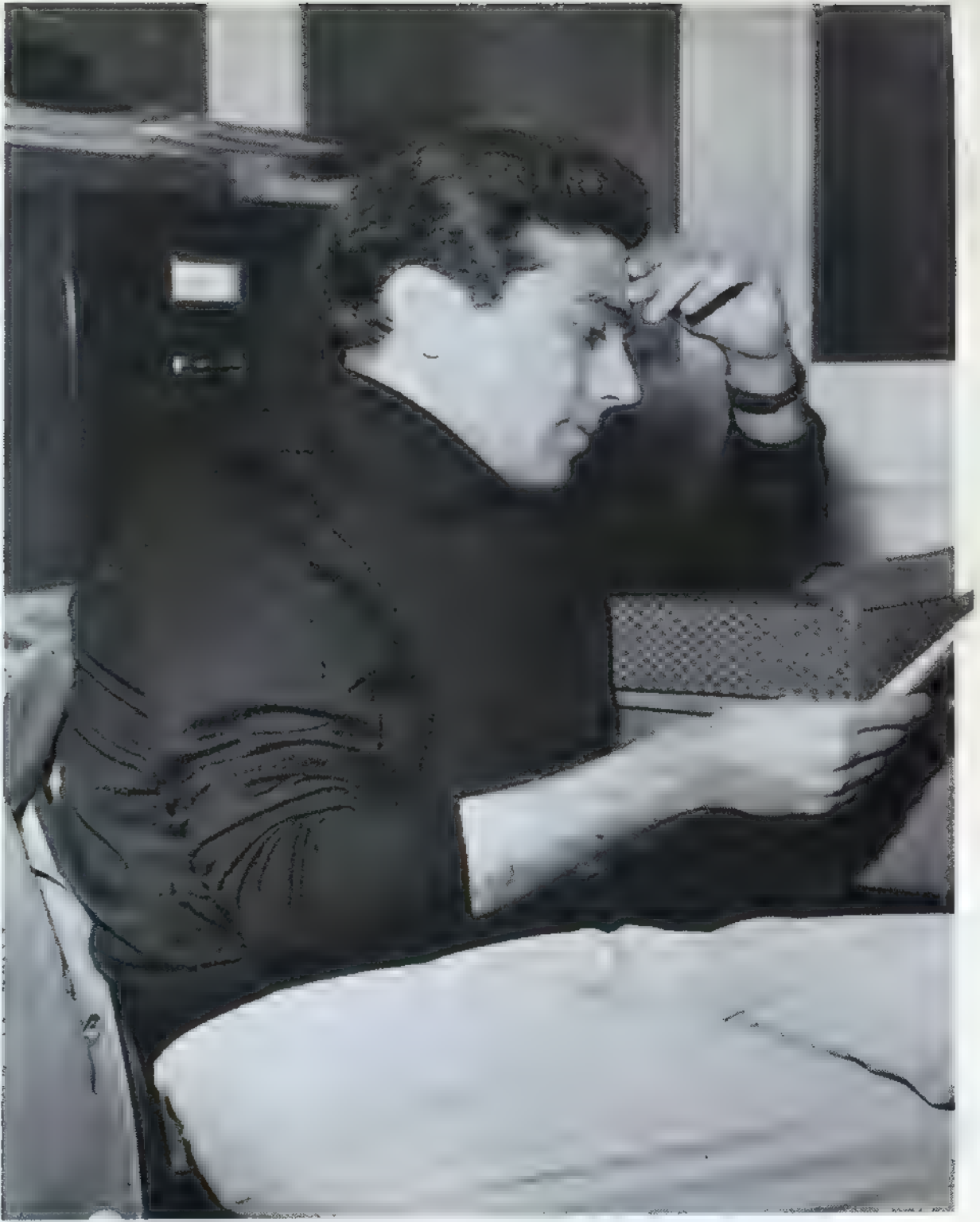
ضیاء محی الدین سکرپٹ پڑھتے ہوئے

۱۹۶۲ء کی ایک تصویر، نیویارک میں

ضیاء محی الدین اور اداکار پیٹر وٹول فلم

LAWRENCE OF ARABIA میں (۱۹۶۱ء)

۹۶۲ء میں ایک ون مین شو کے دوران۔ یہ شو امریکہ میں پیش کیا گیا

فلم BOMBAY TALKIE' میں۔ پہلے اس فلم کا نام AN IDLE MIND رکھا گیا تھا

شملہ شوٹنگ کے دوران فلم "STAYING ON" میں (۱۹۸۰ء)

۱۹۶۴ء میں FRED ZINNEMAN کے ہمراہ فلم BEHOLD A PALE HORSE کی فلم بندی کے دوران

# پی آئی اے۔ آرٹس اکیڈمی

پاکستان واپسی پر ضیاء محی الدین کو پی آئی اے آرٹس اکیڈمی کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔ پاکستان ۱۹۴۷ء میں وجود میں آیا۔ پاکستان جن علاقوں پر مشتمل ہے اس کی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے۔ یہ علاقے ایک ہی قسم کی تہذیب کے حامل ہیں اور اسے وادی سندھ کی تہذیب کہا جاتا ہے۔

آج کی دنیا کے لوگوں کی یہ خواہش ہے کہ وہ دوسرے علاقوں کے لوگوں کی تہذیب اور کلچر سے واقف ہوں تاکہ ان کے درمیان بھائی چارے کا احساس بڑھے پی آئی اے (پاکستان ایرلائنز) چونکہ دوسرے ممالک میں پاکستانیوں کو لے کر جاتی ہے۔ اس لیئے ۱۹۶۶ء میں یہ خیال کیا گیا کہ اس کے ذریعے پاکستانی تہذیب اور کلچر سے دوسرے ممالک کو بھی متعارف کرایا جائے۔ چنانچہ ۱۹۶۶ء میں پی آئی اے آرٹس اکیڈمی کی بنیاد رکھی گئی۔ "پاکستان وہاں تک ہی جاتا ہے جہاں تک پی آئی اے کے جہاز جاتے ہیں" کے مقولا کے پیش نظر پاکستانی تہذیب اور کلچر کو دوسرے ممالک سے متعارف کرانے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ ویسے بھی پی آئی اے ایک عوامی ادارہ ہے اور یہ عوام ہی کی نمائندگی کرتا ہے اس لیئے یہ فرض بھی اس کا تھا کہ وہ پاکستان کی زبان اور تہذیب دوسرے

ملکوں میں لے کر پاکستان کا بول بالا کرے اس زاویہ نگاہ سے اکیڈمی کا قیام پی آئی اے کی ایک سنجیدہ کوشش تھی۔ ویسے تو پاکستان کو دوسرے ممالک میں متعارف کرانے کی اور بہت سی کوششیں کی گئی تھیں۔ مگر اکیڈمی کا قیام ایک کاروباری ادارے کی کاروباری کوشش بھی تھا چنانچہ اکیڈمی کے قیام ہی سے بے شمار اچھے فنکاروں کا ٹروپ وجود میں آ گیا اس ٹروپ نے جینوا میں جشن پاکستان میں حصہ لیا اچھی پرفارمنس دی گئی۔ اور ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ کہ یورپ کے لوگوں نے پاکستانی موسیقی لوک گیت اور رقص دیکھے۔

ملکہ برطانیہ ہر مجیسٹی الزبتھ دوئم نے رائل فیملی کے ساتھ پاکستانی ٹروپے کا مظاہرہ کامن ویلتھ انسٹی ٹیوٹ میں ملاحظہ کیا۔ پاکستانی ٹروپے نے اپنے دو گھنٹے کے پروگرام میں اپنا مشہور بیلے "دریاؤں کے بیٹے" پیش کیا جسے بہت زیادہ پسند کیا گیا۔ انگلش کے اخبارات "ڈیلی ٹیلی گراف" اور "ٹائمز" نے اس پر خوب صورت اداریے تحریر کئے۔

بعد میں پاکستانی ٹروپے نے مانچسٹر، برمنگھم اور دوسرے مقامات پر بھی اہم پروگرام پیش کئے۔ تقریباً ۱۲ پرفارمنس دی گئیں جسے برطانیہ کے عوام نے بہت پسند کیا THE SUN نے لکھا کہ یہ غیر معمولی قسم کی پیش کش تھی۔ جس میں خوبصورت فنکاروں نے اپنی متناسب جسمانی خوبصورتی اور اعلیٰ لباس سے تماشائیوں کے دل لوٹ لئے۔

پی آئی اے کی پرواز کا سلسلہ جب مشرقِ بعید سے جوڑا گیا تو پی آئی اے

ٹروپے نے تھائی لینڈ کے شہر بنکاک میں دو پرفارمنس دیں اگلے سال پی آئی اے ٹروپ پاکستان اور روس کے درمیان ہونے والے تہذیبی اور کلچر معاہدے کے مطابق روس روانہ ہوا۔ اپنے ۱۲ روزہ قیام کے دوران پاکستانی ٹروپے نے ماسکو، لینن گراڈ، تاشقند وغیرہ میں ۱۰ پرفارمنس دیں۔ ریڈیو ماسکو، روس کے ٹیلی ویژن اور پریس نے پی آئی اے ٹروپے کے پروگرام کو بے حد پسند کیا یونین ریڈیو اور ٹی وی نٹ ورک نے بے شمار پبلسٹی دی۔

پاکستانی ٹروپے یو اے ای (عرب امارات) بھی گیا۔ اس کے علاوہ ٹروپے نے مصر میں بھی اپنا مظاہرہ کیا۔ جسے عرب عوام نے بے حد پسند کیا۔

ایران میں شیراز کے انٹرنیشنل آرٹس فیسٹیول میں بھی پی آئی اے ٹروپے نے شرکت کی۔ بعد میں تہران میں بھی اس نے مظاہرہ کیا۔ جسے بیحد پسند کیا گیا۔

پی آئی اے ٹروپے کے ڈائریکٹر ضیا محی الدین ہی تھے۔ وہ یورپ اور امریکہ میں اپنی اداکاری کا جوہر دکھا چکے تھے۔ اور ایک انٹرنیشنل اداکار اور ہدایتکار کی حیثیت میں اپنا مقام رکھتے تھے آپ نے کوشش کی کہ پی آئی اے کے ڈانس ٹروپے کو اسی انداز میں منظم کیا جائے۔ جس طرح یہ روس، چین اور امریکہ میں ہے۔ گویا اس کی جڑیں عوام میں ہوں چنانچہ کلچرل ایکسچینج پروگرام CULTURAL EXCHANGE PROGRAMME کے تحت ٹروپے ایران، کوریا۔ چین، سپین، الجزائر مراکو، تیونس، اردن، یو ایس ایس آر، مالٹا، فرانس، جاپان گیا اور اپنی پرفارمنس سے وہاں کے لوگوں کو بے حد متاثر کیا۔ اور پاکستانی تہذیب اور کلچر سے متعارف کرایا امریکہ میں ٹروپے نے U.N.O کے لئے "یوم حقوق انسانی" کے سلسلہ میں پروگرام پیش کیا U.N.O. کے جنرل سیکرٹری کرٹ والڈ ہائیم نے ضیا محی الدین اور پاکستان ٹروپے کو ایک گراں قدر سند سے نوازا۔

THE SECRETARY-GENERAL                12 December 1973

Dear Mr. Mohyeddin,

All of us who were present at the Human Rights Day Concert on 10 December are deeply in your debt not only for bringing us your unusually talented company of dancers and mucicians from Pakistan, but also for the resonant and perceptive manner in which you spoke the words of the Preamble to the Declaration.

The National Dance Ensemble of Pakistan offered us a delightful hour of sights and sounds. Your own reading of the Preamble reminded us of the true nature of the occasion.

For all these good things we are most appreciative.

YOURS SINCERELY,

Kurt Waldheim

KURT WALDHEIM

Mr. Zia Mohyeddin,
c/o Mr. Mel Howard,
Mel Howard Productions Inc.,
143 EAST 27th. STREET,
New York, N.Y.10016

cc. H.E. Mr. Iqbal A. Akhund

شو بزنس کی دنیا بڑی ہی عجیب دنیا ہے۔ اگر فنکار لوگوں کے سامنے ہے تو لاکھوں کے دلوں کی دھڑکن ہے اسکی تصاویر سے پبلک تے درد بام سجا رکھے ہیں۔ نوجوان اسی کے انداز میں فیشن کرتے ہیں۔ اس لئے ہر ایک کی کوشش ہوتی ہے۔ کہ کسی کو اتنا نمایاں نہ ہونے دیا جائے۔ کہ وہ LEGEND بن جائے۔ ٹروپ میں بھی ایسا ہوا۔ ضیاء محی الدین کی شہرت اور انتظامی قابلیت کچھ لوگوں کو پسند نہ آئی۔ کہ اس سے ان کے VESTED INTEREST پر حملہ ہوتا تھا۔ ضیا محی الدین نے بھی تو ایک نیا کام کیا۔ اس نے ترقی کے لئے سینئر ہونے کی بجائے پرفارمنس بہتر ہونا قرار دیا۔ بھلا پاکستان میں کبھی ایسا ہوا ہے چنانچہ سینئر لوگوں نے سازشوں کا جال پھیلانا شروع کر دیا۔ اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ حکومت کو مداخلت کرنا پڑی اور پی آئی اے اکیڈمی کو بند کر دیا گیا۔ چنانچہ ایک دوسرے کو موردالزام ٹھہرانے کا سلسلہ شروع ہو گیا اخبارات نے حقائق کو جانے بغیر ٹروپے کی خبروں کو خوب اچھالا

" آرٹس اکیڈمی جن افراد کی وجہ سے بند ہوئی
انہیں برطرف کیا جائے۔ متحارب گروپ کا مطالبہ"

"کراچی ۳ر اگست (اسٹاف رپورٹر) پی آئی اے اکیڈمی کے فنکاروں کے متحارب گروپ کے سربراہ امتیاز احمد، میوزک سپروائزر نے مطالبہ کیا ہے کہ پی آئی اے آرٹس اکیڈمی تین روز قبل جس حالت میں بند ہوئی تھی اسی حالت میں اسے دوبارہ کھولا جائے انہوں نے یہ مطالبہ آج یہاں کراچی پریس کلب میں ایک پریس کانفرنس کے دوران کیا۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ اکیڈمی کے ۳۵ فنکاران کے ساتھ ہیں جب کہ چالیس فنکار مس ریحانہ بیگم، رفیع انور اور مس پروین

قاسم کے ساتھ ہیں جب کہ امتیاز نے کہا کہ آرٹس اکیڈمی، ڈانس ڈائریکٹر نذیر احمد، ساحرہ شاہجہان، مس پروین قاسم، احمد حسین اور ثریا نور کی وجہ سے بند ہوئی تھی۔ لہٰذا ان لوگوں کو ملازمتوں سے برطرف کر دیا جائے تو اکیڈمی میں امن کی فضا بحال ہو جائے گی۔ مسٹر امتیاز نے انکشاف کیا کہ ان کی قیادت میں فنکاروں کا ایک وفد عنقریب وزیر تعلیم و صوبائی رابطہ مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ سے مل کر اپنی معروضات پیش کرے گا۔"

"روزنامہ جنگ، ۴ اگست ۱۹۷۵ء"

## پی آئی اے آرٹس اکیڈمی کے مسائل صحیح طریقہ سے حل کئے جا سکتے ہیں

کراچی ۴ اگست

(سٹاف رپورٹر) پی آئی اے آرٹس اکیڈمی کے فنکاروں کے دوسرے گروپ نے جو ضیاء محی الدین کا حامی بتایا جاتا ہے آج اپنی جوابی پریس کانفرنس میں الزام لگایا ہے کہ اکیڈمی میں جو ہنگامہ کیا گیا اس کے پس پشت سیاسی مقصد کار فرما ہے۔ مسٹر امتیاز نے گروپ کے ترجمانی کرتے ہوئے کہا کہ اکیڈمی کے فن کاروں کو ایسے مسائل درپیش نہیں تھے کہ انہیں صحیح طریقے سے حل نہ کیا جا سکتا ہو۔ انہوں نے کہا کہ وہ درحقیقت ایمانداری سے کام کرنے کی بجائے وہ کچھ اور سرگرمیوں میں مصروف رہے اور وہ کچھ کام کئے بغیر تمام سہولتیں حاصل کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ان فنکاروں پر کام سے دل چرانے، ہدایات پر پابندی نہ کرنے اور بغیر اطلاع کے غائب

ہو جانے کے الزامات لگائے۔ انہوں نے یہ بھی الزام لگایا کہ اس
سارے ڈرامے کے ذمہ دار وہ افسر ہیں جو غیر ملکی دوروں کے حساب
کتاب اور تخمینے بنانے کے ذمہ دار تھے۔ اور اس سلسلے میں خصوصی
الاؤنس بھی وصول کرتے تھے۔ ان کی بعض سرگرمیاں جب سامنے
آئیں تو انہیں اکیڈمی سے نکال دیا گیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ عجیب
بات ہے کہ ان کی علیحدگی کے چار روز بعد ہی بعض افسروں نے
مشترکہ دستخطوں سے مطالبات پیش کر دیئے۔ انہوں نے کہا کہ
ان میں بیشتر لوگوں کو ڈرا دھمکا کر دستخط کرنے پر مجبور کیا گیا تھا۔
انہوں نے کہا کہ اکیڈمی نے قومی اور بین الاقوامی سطح پر شہرت حاصل
کی ہے لیکن چند افراد نے جو اس پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں سازشیں
کر کے صورت حال کو اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ اکیڈمی بند کر دی
گئی ہے۔"

(روزنامہ مشرق ۴ر اگست ۱۹۷۵ء)

## "فنکاروں کو بے روزگاری سے بچایا جائے"

آرٹ اکیڈمی کو بند کرانے میں کئی افسروں کا ہاتھ ہے فنکاروں کا الزام
کراچی ۴ر اگست (سٹاف رپورٹر) پی آئی اے آرٹس اکیڈمی کے
سابق میوزک سپروائزر سید امتیاز احمد نے مطالبہ کیا ہے کہ آرٹس اکیڈمی
جس حالت میں بند کی گئی تھی۔ اسی حالت میں دوبارہ کھول کر ستر خاندانوں
کو بے روزگاری سے نجات دلائی جائے۔ وہ آج شام کراچی پریس
کلب میں اکیڈمی بند ہونے سے پیدا شدہ صورتحال اور اس کے

پس منظر کے بارے میں صحافیوں سے بات چیت کر رہے تھے انہوں
نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ اکیڈمی کی بحالی کے ساتھ ان چار افسروں کو جن
میں نذیر احمد، ساحرہ شاہجہان، احمد حسین اور پروین قاسم شامل ہیں
کو علیحدہ کیا جائے کیونکہ انہوں نے شخصیت کے چکر میں پھنس کر ستر
خاندانوں کو بے روزگار کروایا ہے۔ انہوں نے یہ بھی مطالبہ کیا ہے
کہ باہر کی مداخلت بند کرائی جائے انہوں نے اس سلسلہ میں ایک
سابق ڈائریکٹر اور ایک میوزک ڈائریکٹر پر الزام لگایا کہ ان کی
سازش کے نتیجہ میں اکیڈمی بند ہوئی ہے۔ ایک سوال کے جواب
میں کہ پیپلز ہی نے کیا مدد کی ہے۔ انہوں نے پیپلز ہی کے بارے
میں انکشاف کیا کہ وہ ورکروں کے ساتھ دینے کی بجائے انتظامیہ
کا ساتھ دے رہی ہے۔ ابھی تک اس مسئلہ پر اس کی جانب
سے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا گیا ہے۔ انہوں نے الزام لگایا
ہے کہ اکیڈمی کے چند افسران نے اقربا پروری کی حد کر رکھی ہے انہوں
نے اکیڈمی کی انتظامیہ سے اپیل کی کہ وہ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرے
سید امتیاز احمد نے گزشتہ روز اکیڈمی کے افسران کی جانب سے کی
جانے والی پریس کانفرنس کے سلسلہ میں کہا کہ اس پریس کانفرنس کے
ذریعہ عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آخر میں انہوں نے
اکیڈمی کے سابق ملازموں کو مشورہ دیا ہے۔ کہ وہ حالات کو مزید
خراب ہونے سے گریز کریں۔

(حریت ۴ اگست ۱۹۷۵ء)

## "ضیا محی الدین کی مخالفت ڈسپلن پر ان کے اصرار کا نتیجہ ہے"

پی آئی اے اکیڈمی کے بند کئے جانے سے ۵۰ خاندان متاثر ہوئے ہیں، امتیاز احمد کی پریس کانفرنس

کراچی ۲۸ اگست (کمرشل رپورٹر) سابقہ پی آئی اے آرٹس اکیڈمی کے فنکاروں کے دو گروپوں کے اختلافات اور کھل کر سامنے آگئے ہیں جن کی وجہ سے اکیڈمی کے بند کئے جانے کے انتہائی اقدام اور نتائج پس منظر میں چلے گئے ہیں جبکہ دونوں گروپوں کی طرف سے ایک دوسرے پر الزامات عائد کرنے کا سلسلہ جاری ہے سابقہ اکیڈمی کے فنکاروں کے ایک گروپ نے آج یہاں ایک پریس کانفرنس میں کل کی پریس کانفرنس سے خطاب کرتے والے فنکاروں کو حمید نسیم گروپ قرار دیتے ہوئے مطالبہ کیا ہے کہ اکیڈمی دوبارہ کھولی جائے۔ اور اس کے بند کئے جانے کے ذمہ دار افسران اور فنکاروں کے خلاف سخت ترین تادیبی کارروائی کی جائے۔ اکیڈمی کے میوزک سپروائزر سید امتیاز احمد نے پریس کانفرنس میں بتایا کہ اکیڈمی کے چار افسران کو پیشہ وارانہ ضابطوں کی خلاف ورزی اور اخلاقی طور پر غیر ذمہ دارانہ رویّے کی وجہ سے چارج شیٹ دی جا چکی ہے انہوں نے مذکورہ افراد پر یہ الزام بھی عائد کیا کہ وہ اکیڈمی کے سابق دو اعلیٰ افسروں کی شہ پر مسٹر ضیا محی الدین کو اکیڈمی کے ڈائریکٹر کے عہدے سے ہٹانا چاہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اکیڈمی بند کرنا پڑی ہے۔ اس کے ساتھ ہی

مسٹر امتیاز نے کہا کہ نظم و ضبط کی خلاف ورزی بغیر اجازت
غیر حاضری اور تاخیر سے آنے والے بعض فنکاروں کے خلاف
مسٹر ضیا محی الدین سخت تادیبی کارروائیاں کرتے رہے ہیں
جس کی وجہ سے فنکاروں کا ایک گروپ انہیں ڈائریکٹر کے
عہدے سے ہر صورت ہٹانا چاہتا ہے تاہم انہوں نے یہ
دعویٰ کیا ہے کہ اکیڈمی کے ۳۵ فنکاروں کا دوسرا گروپ
ان کے ساتھ ہے جو مسٹر ضیا محی الدین یا پی آئی اے کے
مقررہ کردہ کسی بھی دوسرے ڈائریکٹر کے تحت کام کرنا چاہتا
ہے۔ چنانچہ انہوں نے انتظامیہ پر پھر ایک بار زور دیا کہ اکیڈمی
دوبارہ کھولی جائے کیونکہ بند کئے جانے کے نتیجے میں ستر خاندان
کا ذریعہ معاش متاثر ہوا ہے دریں اثنا فنکاروں کے دوسرے
گروپ کی ایک ترجمانی میں ریحانہ حکیم نے آج کی پریس کانفرنس
سے خطاب کرنے والوں کو انتظامیہ کا آلہ کار اور غیر فنکار افراد پر
مشتمل گروپ قرار دیا ہے۔"

(روزنامہ مساوات ۴ راگست ۱۹۷۵ء)

سبھی اختیار چلے گئے

اکیڈمی کے بند ہونے پر جن "مذہب پرستوں" اور "اسلام پسندوں" نے خوشی کا اظہار کیا۔ ان کا تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے البتہ چند خطوط درج کئے جارہے ہیں جن سے ان حالات پر روشنی پڑتی ہے۔

" بخدمت جناب ضیا محی الدین
ڈائریکٹر پی آئی اے۔ آرٹس اکیڈمی
کراچی

جناب عالی

مجھے بڑے افسوس کے ساتھ یہ لکھنا پڑ رہا ہے کہ کچھ لوگوں کی ملی بھگت نے ہماری پیاری اکیڈمی کو بند کروا دیا۔ اور ہم اچھے ڈائریکٹر سے محروم ہو گئے۔ آپ پر جو بھی الزامات ان لوگوں نے لگائے ہیں۔ بالکل بے بنیاد ہیں اور قطعی طور پر غلط ہیں دراصل یہ وہ لوگ ہیں جو کہ کام سے جی چراتے تھے اور آفس بھی نہیں آتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ دوسرے کو بھی کام نہ کرنے پر اکساتے تھے۔ آپ نے کبھی بھی ہمارے ساتھ کسی قسم کا سلوک نہیں کیا اور ہمیشہ ہمارے ساتھ اچھے اخلاق کا مظاہرہ کیا مجھے آپ کی لیڈر شپ پر پورا پورا بھروسہ ہے کیونکہ آپ نے ہمیشہ محنت سے کام کیا ہے۔ اور دوسرے ملکوں میں ہمارے ملک کا نام روشن کیا ہے۔ جتنی عزت ہمیں اور ہمارے ملک کو آپ کی قیادت میں ملی ہے اتنی شاید کسی اور قیادت میں

نہ مل سکے۔ میری یہ دلی دعا ہے کہ آپ کو خدا اپنے مقصد میں ہمیشہ کامیاب کرے اور ان لوگوں کو ان کے کئے کی حقیقی معنوں میں سزا ملے۔

میری دعا ہے کہ اکیڈمی دوبارہ کھلے اور آپ ہماری سرپرستی کریں۔ کیونکہ آپ نہ صرف ہماری آرٹس اکیڈمی کے لئے اچھے ہیں بلکہ آپ کی وجہ سے ہمارے ملک کا نام بھی روشن ہوا اور انشاء اللہ آپ کی قیادت میں اور بھی اچھے فن کا مظاہرہ ہو سکتا ہے۔

اگر ہم صحیح معنوں میں دیکھیں تو ہمیں یقین نہیں آتا کہ آپ کے اکیڈمی آنے سے اتنی جلدی ترقی ہوئی ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ آپ کے آنے کے بعد آپ نے نئے لوگوں کو CHANCE دیا جو کہ بہت ہی کامیاب ثابت ہوئے ان میں سرپرست میرا نام بھی آتا ہے۔ میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ جن لوگوں نے اکیڈمی میں MONOPLY بنا رکھی ہے ان لوگوں کو جلد سے جلد اکیڈمی سے نکال دیا جائے۔ کیونکہ وہ لوگ بہت زیادہ عمر کے ہو چکے ہیں اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ پیشہ صرف جوان لوگوں سے بخوبی انجام ہو سکتا ہے یہ زیادہ عمر کے سینئر سٹاف اسٹیج پر بھی اچھے معلوم نہیں ہوتے اور ان لوگوں کی دھاندلی ختم کروائی جائے کیونکہ ان کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ اور آپ نئے لوگوں کو موقعہ دیں اور خدا آپ کو ہماری

اکیڈمی میں آپ کی سرپرستی میں اوربھی زیادہ اچھا کرے۔ (آمین)

آپ کی خادمہ

انجم صدیقی ۹-۸-۷۵

" جناب ضیا محی الدین صاحب

میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں اور مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میں نے بن سوچے غلط لوگوں کا ساتھ دیا تھا میں نہیں جانتی تھی کہ وہ کیا چاہتے تھے میں سیاست سے ناواقف ہوں۔ میں ان لوگوں کی سیاست نہ سمجھ سکی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے اپنی نوکری سے ہاتھ دھونا پڑا۔ میں امید کرتی ہوں کہ میری سابقہ غلطیوں کو درگزر فرمائیں گے۔

شکریہ

نرگس اختر

۲۰-۶-۷۶ "

فنکاروں کی طرف سے ضیا محی الدین کی اکیڈمی کے لئے خدمات اور اکیڈمی کو دوبارہ کھولنے کے متعلق جو درخواست وزیر اعظم پاکستان کو دی گئی اس کی نقل یہاں درج کی جا رہی ہے جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ پی آئی اے کی اکیڈمی کے بند ہو جانے سے فنکاروں کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

Karachi, August 6, 1975.

Honourable Prime Minister,
Prime Minister House,
Rawalpindi.

Respected Sir,

We, the workers of the disbanded PIA Arts Academy, crave your indulgence towards our plight and suffering as a result of the closing down of our Academy. We are victims of the melo-drama engineered and directed by a few ambitious officers of the Academy and some of their henchmen, each of whom had his own axe to grind. We lost our bread and butter for no fault of ours. We along with our wives and children have been thrown into the streets as a result of misdeeds of some of our self-seeking officers and the unpardonable and lawless behaviour of their relatives and henchmen. The following officers of the Academy, who demanded the removal of the Director Arts Academy, Mr. Zia Mohyeddin, are mainly responsible for the closure of the Academy:-

1. Miss Sahira Shahjehan, Dance Artiste.
2. Mr. Nazir Ahmed, Choreographer.
3. Mr. Raffi Anwar, Choreographer.
4. Mrs. Shelly Rizvi, Dance Artiste.
5. Miss Perveen Qasim, Dance Artiste.

The PIA Management made every conceivable effort to resolve this uncalled for situation, but these selfish people had left no alternative and the Management was compelled to close down this 10-year old institution. These perons were interested in everything but honest work. They wanted to enjoy all their benefits without giving anything in return. They would stay away from work, come late whenever they pleased, remain absent without prior permission or even intimation. When the Management tried to set them right and started taking disciplinary action against some of them, they resented it and, in order to cover up their misdeeds, they chose to take law into their own hands. They found a convenient scapegoat in the person of the Director Arts Academy. This was a plot of the officers to divert the attention of the authorities and the workers from the real misdeeds of the main culprits. We know for a fact that Mr. Ahmed Hussain, who was until recently the Production Manager of the Academy and subsequently transferred to PIA Head Office for his misdeeds, is the main string puller of the whole dirty drama. It is notable that four days after his transfer to the Head Office, the other officers produced a memorandum listing a whole lot of slanderous accusations against the Management.

We consider ourselves to be professional people. Professionalism demands not only integrity but pride in one's work. We feel that the kind of creative work we are involved in demands long and hard hours of arduous practice. When those (who happened to be officers) were charge-sheeted

Contd.......

for gross neglect of professional ethics, they did not only laugh it off but began to exert their influence and brazenly made those under them refuse to work. Some of us are victims of that. They began to swear that as no power on earth could dislodge them from their comfortable positions, they would do whatever they pleased.

While we do not question the PIA Management's decision to close down the Academy, one wonders who should have been removed — these professional trouble-makers or us? We have been driven to abject misery entirely on account of these vicious and treacherous officers.

As regards the working of the Academy under the direction of Mr. Zia Mohyeddin, needless to say that we have made tremendous progress. We have come to be recognised as the premier performing company of the country. In 1973 alone we toured countries and gave 102 performances. It was for the first time that a Pakistani company was invited by the United Nations to give a performance on the occasion of Human Rights Day in December 1973 and it goes to the credit of our worthy director that he read the UN citation on this occasion. Our performance and our director's reading of the citation were praised by no less a person than the Secretary General, Dr. Kurt Waldhiem. A photo-copy of his letter addressed to our director is enclosed herewith for your perusal In 1974 we visited 20 countries and gave approximately a 100 performances.

We had genuine hopes of being the National Performing Company. It is such a pity that the miscreants hatched a plot to take over the Academy. They made their own shadow cabinet, bypassed all laid down channels and so succeeded in achieving their dastardly end—that is closing down the Academy.

We appeal to you, Sir, to order re-opening of the Arts Academy under the prestigeous direction of Mr. Zia Mohyeddin, so that justice can be done and our families can be saved from starvation. You as well as your government have always stood for the cause of workers and labourers, and we are sure that justice will be done to us.

Yours obedient servants,

پی آئی اے ٹروپے نے بیرون ملک جو شو کئے اور جس قسم کی پرفارمنس دی ہیں۔ ان کے لئے ان ممالک کے اخبارات کے تراشے ہیں یا پھر بروشر اس لئے یہاں چند بروشر کے فوٹو پیش کئے جا رہے ہیں۔ اخبار مساوات کے فلم ایڈیشن میں ضیا محی الدین کا ایک انٹرویو شمیم عالم نے مرتب کیا تھا۔

"ضیا محی الدین آج کل پی آئی اے آرٹ اکیڈمی کے ڈائریکٹر ہیں اور جب ہم ان کے خوبصورت دفتر میں ان کا انٹرویو لینے پہنچے تو بند کمروں میں سے سازوں کی صداؤں نے چند لمحوں کے لئے کراچی کے مشینی ہنگاموں اور ٹریفک کے شور کو ذہن سے محو کر دیا۔ ضیا محی الدین حال میں غیر ممالک کے دورے سے واپس آئے ہیں انہوں نے ہمیں بتایا کہ پاکستان واپس آنے کے بعد یہ ان کا پہلا انٹرویو ہے۔ ضیاء نے ہمارے ہاتھ قلم کاغذ دیکھ کر کہا کہ غیر ممالک کے صحافی انٹرویو لینے کے لئے ٹیپ ریکارڈ کا استعمال کرتے ہیں جو واقعی اچھی چیز ہے۔ لیکن ہم بچارے پاکستانی صحافیوں کے اتنے وسائل کہاں۔

ضیا حالیہ دورے میں فرانس، اسپین، الجزائر، تیونس، اردن اور ایران گئے تھے اور اس سے پہلے انہوں نے چین اور کوریا کا دورہ کیا تھا۔ جب ہم نے ان کے تاثرات جاننے چاہے تو انہوں نے بتایا کہ میرے ساتھ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو پہلی مرتبہ باہر گئے تھے۔ اور وہ یہ دیکھ کر بہت حیران ہوئے کہ وہاں تھیٹر کا فن کتنا مقدس اور خوب صورت سمجھا جاتا ہے ہمارے

یہاں جن لوگوں کو معمولی فنکار سمجھا جاتا ہے وہاں انہیں بہت سراہا جاتا ہے۔ جیسے ہمارے یہاں فیض محمد بلوچ جو بوڑھے ہیں لیکن ان کے اندر جواں روح ہے لوگ انہیں معمولی فنکار سمجھتے ہیں لیکن انہیں اسٹیج پہ چھا جانا آتا ہے۔ اور انہیں اپنے فن پر ملکہ حاصل ہے۔

ضیا محی الدین نے ہمیں بتایا کہ یورپ میں تھیٹر بہت ترقی یافتہ شکل میں موجود ہے جبکہ پاکستان میں صرف ایک آدھ تھیٹر ہے یہ دیکھ کر اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے۔ ضیا سترہ اٹھارہ برس انگلستان میں رہے جو تھیٹر کا گڑھ ہے انگلستان تو خیر بڑا ملک ہے لیکن الجزائر جس کی آبادی تقریباً ۵۰ لاکھ ہے وہاں بھی نہایت خوب صورت اور مناسب تھیٹر موجود ہیں اچھے تھیٹر سے مراد عمارت یا باغات اور کرسیاں نہیں بلکہ اسٹیج اور اس کے لوازمات ہیں ہمارے ہاں تھیٹر سے مراد ایک ہال لیا جاتا ہے جس میں اگلی صفوں میں افسروں اور بڑے لوگوں کے لئے صوفہ سیٹ لگے ہوتے ہیں۔ پیچھے خواہ ٹین کی کرسیاں ہوں یہاں اسٹیج پر کام کرنے والے کے لئے تکنیکی لوازمات کا بالکل خیال نہیں رکھا جاتا۔ ڈریسنگ روم نہیں ہوتے روشنیوں کا صحیح انتظام نہیں ہوتا۔"

اس موقع پر ضیا نے ہمیں اسٹیج کا ماڈل دکھایا یہ تین طرف سے بند تھا اور چوتھی دیوار کھلی ہوئی اس میں جتنی جگہ نیچے ہے اتنی ہی اوپر ہوتی ہے۔ دوسرے ممالک میں اگر سینری بدلنی ہو تو آہستہ آہستہ بلیک آؤٹ کر کے سارا سامان اوپر اٹھ جاتا ہے اور دوسرا سامان آجاتا ہے اس میں صرف چند سکینڈ لگتے ہیں اور

ڈرامے کا سحر ٹوٹنے نہیں پاتا۔ جب کہ ہمارے یہاں ابھی تک ایک صدی پہلے کا طریقہ رائج ہے کہ پردہ گرا کر منظر بدلا جاتا ہے۔

ضیا کا کہنا ہے کہ کوریا اور چین میں بہت بڑے عالی شان تھیٹر موجود ہیں۔ چین تو خیر بڑا ملک ہے لیکن اردن جیسے چھوٹے ملک میں بھی ہر طرح کے سازو سامان سے مزین تھیٹر موجود ہیں معمولی تھیٹر میں بھی ساڑھے تین چار سو لائٹس ہوتی ہیں۔

جب ہم نے ضیاء سے پوچھا کہ پاکستان میں تھیٹر کے ارتقاء کے لئے انہوں نے کیا کیا ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ میں نے صاحب اثر اور صاحب استعداد لوگوں سے اصرار کیا ہے کہ وہ تھیٹر کا خیال رکھیں ورنہ یہ بالکل ختم ہو جائے گا جیسے چھاپے خانے کے بغیر اخبار نہیں چھپ سکتا۔ پبلشنگ ہاؤس کے بغیر مصنف کچھ نہیں کر سکتا۔

جب ہم نے ان سے کہا کہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان جیسے غریب ملک میں ان چیزوں کی گنجائش نہیں تو انہوں نے کہا کہ پاکستان سے بھی زیادہ غریب ممالک میں تھیٹر موجود ہے۔۔۔

جب ہم نے پی آئی اے آرٹ اکیڈمی میں ان کی مصروفیات کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا۔ یہاں تو خوب جکڑا گیا ہوں۔ چاہتا ہوں یہ ایک ایسی کمپنی بن جائے جو ملک کے اندر اور باہر جب بھی کوئی چیز پیش کرے تو اسی مہارت سے کرے جیسے دوسرے ممالک کی کمپنیاں کرتی ہیں۔ بس یہی کوشش ہے اور اس میں اتنی زیادہ ناکامیابی بھی نہیں ہو رہی۔

فنکارانہ انانیت خاصی مشہور ہے جب ہم نے ضیا محی الدین کی اس بارے میں رائے جاننا چاہی تو وہ بولے کہ خود میں اور دنیا کا ہر اداکار

میری ذاتی رائے میں دو چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے، سخت شرمیلاپن اور نمود و نمائش کی خواہش، ہمارے یہاں اداکار اور شرمیلاپن دو متضاد چیزیں سمجھی جاتی ہیں حالانکہ شرمیلاپن ہی انسان کو اظہار کے لئے دوسری چیزوں کا سہارا لینے پر مجبور کرتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر اداکار شرمیلا ہوتا ہے تو پھر وہ میکبتھ جیسا کردار کیسے ادا کر لیتا ہے یہ کھیل چار سو برس سے ہو رہا ہے پھر آپ کیسے ہمت کر لیتے ہیں۔ اگر آپ اپنی انا کو سامنے نہ رکھیں تو یہ ہمت نہیں ہو سکتی۔ ویسے ہمارے یہاں بھی رواج ہے کہ نئے فنکار پرانے اور بزرگ فنکاروں کو اوپر سے بڑا کہتے ہیں اور اندر سے نہیں مانتے، یہ ریاکاری ہے۔ لیکن اگر آپ واقعی کسی کو بڑا سمجھتے ہیں اور پھر وہی کام کرنا چاہتے ہیں۔ تو اس میں صرف آپ کی انا آپ کی مدد کرتی ہے۔ انا پسندی کے بغیر کوئی کردار ادا نہیں کیا جا سکتا کامیاب اداکاری کے لئے ارتکاز توجہ بے حد ضروری ہے۔ اداکاری بھی ایک سائنس ہے کیمیا کی طرح جہاں آپ سہل پسندی کا شکار ہوئے تو تماشائیوں کی توجہ بھی ہٹ جاتی ہے۔ سب کی تعریف حاصل کرنا فنکار کا کام ہے شو بزنس کا سارا مقصد ہی یہ ہے کہ اس دوران لوگ وہی سوچیں جو آپ دکھا رہے ہیں اس کے لئے فنکار کو بڑا کام کرنا پڑتا ہے۔ انا کا ہی سہارا لینا پڑتا ہے انا سے مراد اعتماد اور وہ جذبہ ہے جو انسان کو تقویت دیتا ہے۔

ضیاء سے ہمارا آخری سوال آدرش کے بارے میں تھا کہ کیا وہ آدرش میں یقین رکھتے ہیں۔ ضیاء نے کہا میرا آدرش سیاسی نہیں ہے۔ کیونکہ آج تک سیاست کے بارے میں سنجیدگی سے نہیں سوچا میرا آدرش سماجی بھی نہیں ہے۔ کیونکہ آدرش اگر سماجی ہو اور آپ اس کے لئے کچھ نہ کریں تو یہ ریاکاری

ہے اتنا کہہ کر ضیا کچھ سوچنے لگے وہ بہت کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن کہہ نہیں رہے تھے کچھ سوچتے ہوئے بولے مجھے کام کے علاوہ بہت کم چیزوں میں دلچسپی ہے۔ کام ہی میرے لئے اہمیت رکھتا ہے۔ پتہ نہیں یہ آدرش ہے یا نہیں۔ اکثر گریبان میں جھانکتا ہوں کہ کیا کام کر رہا ہوں بہرحال جو ذمہ داری ہے اسے سنبھال رہا ہوں۔ اتنا کہہ کے ضیاء پھر سوچ میں گم ہو گئے اور پھر پرخیال انداز میں بولے۔

I WANT TO DIRECT SO MUCH
I WANT TO ACT SO MUCH

میں اکثر تصورات میں اپنے آپ کو ہدایت کاری کرتے ہوئے پاتا ہوں۔ بہت سے آدرش بنائے۔ بہت سے پورے نہیں ہوئے۔ ایک بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ایک باقاعدہ تھیٹر بن جائے۔ تو پھر آدرش یہ ہے کہ اس میں ڈرامے پیش کروں۔ نہایت لطیف نہایت اعلیٰ۔ ایسا ڈرامہ جو عوام کے ذوق کی پرورش کرے۔

ضیا محی الدین ایک پیدائشی فنکار ہیں ان کی آنکھوں کی غیر معمولی چمک اس ذہانت کی غماز ہے جس کی نموان کا جدت پسند متنوع مزاج کر رہا ہے

---

پی آئی اے آرٹس اکیڈمی دوبارہ کھلی یا نہیں؟ وزیر اعظم پاکستان نے فنکاروں کی درخواست پر کیا حکم دیا۔؟ ہمیں اس کہانی سے کچھ مطلب نہیں۔ البتہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ ضیا محی الدین کو نمبر دو بن کر رہنا منظور نہ تھا اس لئے انہیں پھر ملک سے باہر جانا پڑا۔ جانے سے پہلے انہوں نے ن م راشد سے خط و کتابت کی جو ان دنوں انگلستان میں تھے۔ اس کے بعد ضیاء محی الدین نے انگلستان کا سفر اختیار کیا کوئی تین چار ماہ تک ناہید محی الدین کراچی میں مقیم

رہیں۔ پھر ضیاء محی الدین نے انہیں لکھا کہ "گھر کی ساری چیزیں جن کا اٹھانا مشکل ہے۔ بیچ دو۔ کتابیں کسی ایسے شخص کے پاس رکھوا دو۔ کہ بعد میں حاصل کی جا سکیں یہ ان دنوں کی بات ہے۔ جب میں بھی کراچی میں ملازمت کرتا تھا۔ سو ان کی کتابوں کے تین ٹرنک میرے پاس بطور امانت رہے۔ تقریباً سال بعد برمنگھم میں باقاعدہ گھر لے لیا تو ان کی کتابوں کو بحری جہاز کے راستے انگلستان بھجوا دیا گیا۔

جب کتابیں بھیج رہا تھا۔ تو اس وقت کیفی اعظمی کا وہ شعر بہت یاد آ رہا تھا جو انہوں نے ۱۹۷۴ء میں ضیا محی الدین کے کراچی والے مکان میں سنایا تھا اور سناتے ہوئے ضیاء محی الدین کو خاص طور سے متوجہ کیا تھا۔

یہاں سے جلد گزر جاؤ قافلے والو
ہیں میری پیاس کے پھونکے ہوئے یہ ویرانے

MADISON SQUARE GARDEN
THE FELT FORUM
EXPOSITION ROTUNDA
CENTER CINEMA
BOWLING CENTER
GALLERY OF ART
HALL OF FAME

**MADISON SQUARE GARDEN CENTER**
FOUR PENNSYLVANIA PLAZA · NEW YORK, N.Y. 10001 · 594-6600

NATIONAL FOLK ENSEMBLE OF PAKISTAN FOR RELEASE: WEDNESDAY, NOV. 28
Dec. 4-9

ACTOR-DIRECTOR ZIA MOHYEDDIN BRINGS

'FOLK ENSEMBLE OF PAKISTAN' TO FELT FORUM

NEW YORK--Internationally-known stage and screen personality Zia Mohyeddin, perhaps best remembered for his role as Dr. Aziz in the Broadway hit "A Passage to India," returns to the U.S. on Tuesday, December 4 as director of the explosive National Folk Ensemble of Pakistan. This troupe will be making its American debut in The Felt Forum on that date, and will run through Sunday, December 9.

Mohyeddin, who is largely responsible for the folk company's success in Europe, Asia, Latin America and other parts of the world, is looking forward to introducing New Yorkers to the cultural history of Pakistan, which is "an old and fascinating one." He adds that he inherited his love of music and his interest in regional art and customs from "my father, who was a Professor at Punjab University."

A slender, handsome man who speaks perfect English, Zia Mohyeddin grows increasingly enthusiastic as he describes the company's 50 dancers, singers and musicians. "The costumes are authentic and colorful, the dancing is exquisite and the exotic music alone is worth the trip to The Felt Forum."

Tickets for the National Folk Ensemble of Pakistan are priced at $7.50, $6.00 and $4.50 and can be purchased at the Madison Square Garden Center box office and the over 150 Ticketron outlets.

* * * * * * * * * *

11/26/73

صفِ دشمناں کو خبر کرو

پی آئی اے آرٹس اکیڈمی کے بند ہو جانے کے بعد ضیا محی الدین دوبارہ انگلستان گئے اور اپنی زندگی کو ایک نئے سرے سے بنانے لگے۔ اس مرتبہ ان میں کپڑے پہننے کا وہ برطانوی انداز نہ دیکھا گیا جو پیسیج ٹو انڈیا کے زمانے میں تھا انہوں نے ایک عام شخص کی طرح چین میں گزارا کیا۔ برمنگھم میں انہوں نے کچھ دستاویزی فلمیں بنائیں۔ ٹی وی پر "ٹاک شو" کئے۔ جولائی ۱۹۷۹ء میں تقریباً ایک سال بعد وہ پاکستان آئے اور ۱۰ جولائی ۱۹۷۹ء کو رات ساڑھے سات بجے پروین شاکر اور مہتاب چنا کے ساتھ ان کی گفتگو کا یہ پروگرام پاکستان ٹیلی ویژن کراچی سے نشر ہوا۔

**مہتاب چنا:**۔ ضیا محی الدین صاحب، بدلنے کے بعد گفتگو بھی بدلے، فضا بھی کچھ بدلے، سوال نہ کچھ ہو جائیں آپ سے

سوال یہ ہے کہ ہماری نسل آپ سے متعارف یوں ہوئی کہ آپ
نے ایک پروگرام کیا "ضیا محی الدین شو"۔
پروین شاکر :۔ بہت بڑا شو تھا۔
مہتاب :۔ یقیناً جو نہیں جانتے تھے انہوں نے جاننا چاہا،
غالباً آپ بھی ہماری یہی کوشش ہے کہ تھوڑا بہت آپ کو
جان لیں۔ تو پہلی چیز جو میں جاننا چاہوں گی وہ یہ "ضیاء محی الدین
شو" میں خود کے علاوہ کون سی چیز آپ کی اپنی تھی۔
ضیاء محی الدین :۔ (مسکرا کر) اس سلسلے میں سب سے
پہلی بات یہ ہے کہ مجھے واقعی اس دن یہ معلوم ہوا کہ لوگ اس
شو کو بہت چاؤ سے دیکھتے ہیں جب لاہور میں شاید ایک بچے
نے کہا امی امی وہ دیکھئے ضیاء محی الدین شو جا رہے ہیں۔ بغیر مبالغے
کے۔ تو مجھے شاید وہ تخلص رکھ لینا چاہیئے تھا۔ کون سی چیز میری
اپنی تھی اس میں ؟
مہتاب :۔ آپ کے خود کے علاوہ!
پروین شاکر :۔ کہا یہ جاتا ہے یا مراد یہ ہے کہ آپ یہ آئیڈیا
باہر سے لے کر آئے تھے۔ کیونکہ یورپ یا امریکہ میں تو شوز،
بالکل عام سی بات ہے۔ پاکستان میں یہ بالکل نئی چیز تھی۔
ضیاء محی الدین :۔ جی ہاں! بات یہ ہے کہ ٹیلیویژن کے
سلسلے میں، ٹیلی ویژن بھی ہم لوگ باہر سے لے کر آئے ہیں یعنی یہ
ہماری اپنی اختراع نہیں ہے۔ ٹیلی ویژن میں گفتگو کے ذریعے
سے تفریح پہنچانا ایک ایسی روایت ہے جو بہت دنوں سے

باہر چل رہی ہے۔ تو مختلف لوگ ایسے ہیں جنہیں سمجھا یہ جاتا ہے کہ نسبتاً دوسرے لوگوں سے بہتر گفتگو کرتے ہیں، یا یہ ہے کہ ان کی ذات کی وجہ سے بہت سے لوگ ٹیلی ویژن پر آ سکتے ہیں یوں اور بہت سی وجوہات ہوتی ہیں ..... ! ان کو CHAT SHOW "TALK SHOWS" کہا جاتا ہے ... ۔ اس لحاظ سے میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میرا اپنا تھا... TALK SHOW یا CHAT SHOWS بالکل ٹیلی ویژن کا اسی طرح حصہ ہیں جیسے ٹیلی ویژن کی خبریں یا کھیل حصہ ہوتے ہیں۔ چونکہ لوگوں نے یہاں مجھ سے کہا۔ اصرار کیا، تو میں نے سوچا کہ یہ ایک خاصا چیلنج ہے۔ کیونکہ میں نے اس انداز میں ٹیلیوژن پر کبھی کام نہیں کیا تھا۔ یوں میں نے باہر ٹیلی ویژن پر کام کیا۔ یہاں کیا، مگر یہ ایک بہت بڑی ذمہ داری تھی۔ کیونکہ اس میں نہ صرف لوگوں کو متعارف کروانا تھا۔ اس میں دلچسپی کا عنصر اور ان لوگوں کے معیار کو برقرار رکھنا تھا.... اور دیکھنے والوں کے ذوق کی تسکین کرنا .....

مہتاب چنا :۔ ایک اور سوال۔

ضیاء محی الدین :۔ جی !

مہتاب چنا :۔ آپ جن لوگوں کو اپنے شو میں متعارف کروا رہے تھے میرا خیال ہے کہ پہلے سے وہ لوگ متعارف ہو چکے تھے۔ بڑی بڑی شخصیتیں آتی تھیں۔ لوگ ان کو جانتے تھے آپ نے سوچا چلو انہیں ایک اور موقع دے دیا جائے ....

میرے خیال میں تو آپ بڑے لوگوں کو اس لئے لاتے تھے کہ آگے چل کر ان کی جان پہچان کو CASH کیا جاسکے۔

ضیا محی الدین (دکھ بھرے اظہار کے ساتھ) آ:... اگر ایسا تھا تو کم از کم یہ آپ نے اچھا بتایا کیونکہ اگر اب میں ایسا کروں گا۔ تو اس بات کو بھی یقیناً سامنے رکھوں گا۔

(اس کے بعد ضیا محی الدین شو کے اس قسط کے چند ٹکڑے دکھائے گئے جس میں مشتاق احمد یوسفی معروف مزاح نگار اور ایک ڈرائیونگ اسکول کو چلانے والی لڑکی مدعو تھی۔ نمونے کے طور پر مشتاق احمد یوسفی کے ساتھ ضیاء محی الدین کے چند مکالمے)

ضیاء محی الدین :۔ تشریف لاتے ہیں...... جناب مشتاق احمد یوسفی۔ یوسفی صاحب آپ نے اپنے بارے میں یہ مشہور کر رکھا ہے کہ آپ صبح صبح بغیر آئینے میں دیکھے شیو کرتے ہیں تو یہاں آنے میں آپ کو اس قدر اعتراض تھا۔ کیوں ؟

مشتاق یوسفی :۔ صاحب آپ تو جانتے ہیں کہ میں ایک گوشہ نشین، بلکہ پردہ نشین آدمی ہوں اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ لایا ہے تیرا شوق مجھے پردے سے باہر تو آپ کے شو پر میرا پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ آپ اپنے پروگرام میں جن مردوں کو چھانٹ چھانٹ کر لاتے ہیں ان سب کی صورت شکل آپ سے بھی گئی گزری ہوتی ہے۔

ضیاء محی الدین :۔ خیر یہ..... یہ زیادتی ہے کیونکہ یہاں

پر تو وحید مراد صاحب اور محمد علی صاحب بھی آ چکے ہیں!

مشتاق یوسفی : صاحب! یہ تو ہیرو ہیں، مَیں تو بندوں کی بات کر رہا ہوں۔

(قہقہوں کا ایک سیلاب)

ضیاء محی الدین :۔ نہیں میرا خیال ہے کہ اس شو میں بڑی بڑی شخصیتیں ہی نہیں آتی تھیں۔

پروین شاکر :۔ جانی پہچانی!

ضیاء محی الدین :۔ جی ہاں جانی پہچانی بلکہ عام لوگ بھی اس میں۔۔

پروین شاکر :۔ لیکن پروگرام زیادہ انہی بڑے لوگوں یا جانے پہچانے لوگوں کے نام کی وجہ سے جانا تھا۔۔۔

مہتاب چنا :۔ کہ یہ آرہے ہیں وہ آرہے ہیں۔

ضیاء محی الدین :۔ لیکن اس میں بہت سی چیزیں تھیں جو باہر کے دوسرے پروگراموں سے مختلف تھیں۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ وہ اچھی تھیں یا بری تھیں وہ یہ کہ باہر جو معروف لوگ شو کرتے ہیں وہ ایک یا دو ہفتے پہلے یہ بتا دیتے ہیں کہ پروگرام میں۔۔۔۔ فلاں شخص فلاں شخص آرہا ہے جب میں متعارف کروانے کی بات کرتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس جانی پہچانی شخصیت کو ایک اور انداز سے بھی دیکھا جائے جیسے فلمی لوگ ہیں لوگ انہیں فلم میں ایک خاص انداز میں اسکرپٹڈ طریقے سے دیکھتے ہیں اس پروگرام کی وساطت سے مطلب یہ ہے کہ آئیے بیٹھیے بات کیجیے۔ بنیادی طور سے میرا مطلب یہ تھا کہ ان کا تعارف کروانا میری وساطت سے کہ ان کے خیالات، ان کے

نظریات ان کی گفتگو، یا ان کی بذلہ سنجی کہہ لیجئے ________
یا ان کی ظرافت کہہ لیجئے۔ ان کی اچھائیاں ان کی برائیاں۔ جو
کچھ بھی لوگوں تک پہنچایا جائے۔ بہت سے لوگ آئے خوب
چمکے۔ بڑی اچھی بات کی، اور جب لوگ نہیں چمکتے تھے تو شو
بہت پھیکا رہتا تھا۔ بس یہ سمجھئے میں نے اپنی ذمہ داری
پیشہ وارانہ طریقے سے نبھائی تھی۔ یہ نہیں کہتا کہ میں نے کوئی بہت
بڑا کام کیا تھا.... میہاں آپ کا یہ کہنا کہ ایک پوری پود ہے
ایک پوری نسل ہے۔ جن کا تعارف مجھ سے اس ایک پروگرام
کی نسبت سے ہوا..... یہ صحیح ہے..... بلکہ.....
مہتاب چنا :۔ آپ اختلاف کیجیے گا...
ضیا محی الدین :۔ جی نہیں۔ میں کہہ رہا ہوں یہ صحیح ہے۔ بلکہ میرا
نام بھی وہ نام ہی رہا جو تھا۔
پروین :۔ آپ نے اس شو کے حوالے سے ایک اور بات جو
بالکل نئی تھی وہ اردو شاعری کا پڑھنا۔ آپ نے نئے انداز سے
فیض صاحب اور ن۔م راشد کو پڑھا.... یہ آپ نے ایک
نئی روایت کی بنیاد رکھی۔ اور اس شاعرے کی روایت کی نفی کی
جو اُردو شاعری میں چلی آ رہی تھی۔

(یہاں ضیاء محی الدین نے ن۔م راشد کی نظم 'میرے خدایا'
میں زندگی کے عذاب لکھوں کہ خواب لکھوں سنائی)

ضیاء محی الدین :۔ اکثر لوگوں کو یہ تاثر ہے کہ میں نظمیں گا کر
پڑھتا تھا۔ میں گانا وانا تو جانتا نہیں.....

مہتاب :- ہاں اس سے آپ کیوں محروم رہ گئے۔

پروین :- یہ فیلڈ بچا گئے آپ۔ ڈرامہ آپ نے کیا ......
شاعری، افسانہ ......

ضیا محی الدین :- نہیں بہت بچپن میں اس قدر شوق تھا کہ نہ صرف گا پاؤں بلکہ استاد ہتو ہستو خان صاحب کے پائے کا گانا گاؤں مگر خیر ایک زمانے میں یہ خواہش بھی تھی کہ انجن ڈرائیور بھی بنوں۔ وہ تو بچپن کی باتیں ...... خیر ہمارے یہاں۔ ہماری شاعری کو لوگ بہت اچھے طریقے سے گاتے ہیں۔ غزل گانے والیاں بہت اچھی سے اچھی ہیں۔ البتہ نظم بہت کم لوگ گاتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ اس کی بحر، اس کا وزن ...... ہاں مقفیٰ نظمیں گائی گئی ہیں۔ مگر آزاد نظم ...... شاید وہ گائی نہیں جاسکتیں ...... پھر ہمارے یہاں شاعری کا ایک خاص انداز ہے ..... جیسے خطابت اور مقرری کا۔ تقریر کے شروع ہوتے ہی شعروں کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ ہمارے ہاں شعر پڑھنے والے کو بہت عالم یا فاضل شخص مانا جاتا ہے۔ شعر اس قدر لطیف اور حسین چیز ہے کہ اگر آواز کو چھوڑ دیں۔ محض ایک لفظ کو دبانے یا ابھارنے سے اس شعر یا نظم میں جان پڑ سکتی ہے۔ مقصد نظم پڑھنے کا یہ تھا کہ اس میں نظم کا متن زیادہ نکلے۔ سو لفظ کے دبانے سے اس کے معنی واضح ہوجاتے ہیں۔

پروین :- یعنی آپ کا مطلب ہے۔ ڈراماٹائیز کرنے سے نظم زیادہ ......

ضیاء محی الدین :۔ جی نہیں! ڈرامہ ٹائیز اور چیز ہے لفظ کا انفلکشن، دباؤ یا ابھارنا اس سے نظم یا شعر میں زیادہ کیفیت واضح ہو جاتی ہے۔

پروین :۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ آپ نے جس طرح نظمیں پڑھی ہیں لگتا ہے کہ نظم پوری مجسم ہو کر سامنے آگئی ہے اور ہم آپ کے ساتھ SHARE کر رہے ہیں۔ مگر ایک بات بتائیں لوگوں نے آپ کو ہر معاملے میں FOLLOW کیا، حتیٰ کہ فرل لگانے میں مگر اس میں یعنی نظم پڑھنے میں کیوں FOLLOW نہ کر سکے۔

ضیاء محی الدین :۔ میں نے کہہ سکتا اس سلسلے میں کچھ۔۔۔۔۔ ہاں ہو سکتا ہے کہ لوگوں کو خیال آیا ہو کہ جس طرح وہ پڑھتے ہیں بہتر ہے۔ یا جس طرح وہ کرتے ہیں ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔ میرا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ جو میں کروں وہ چیز لوگوں کے لیئے زندگی بھر کے لیئے مثال بن کر رہ جائے۔ بس میں نے یہ کوشش کی ہے کہ نظم کی کیفیت کو بھرپور طریقے سے بیان کر سکوں۔

مہتاب چنا :۔ آپ نے اپنے پروگرام میں ایک عدالت لگائی تھی خود ہی سوال کیئے خود ہی جواب دیئے اس کا مطلب کونسی پوزیشن واضح کرنا تھا۔

ضیاء محی الدین :۔ پوزیشن یہ تھی کہ لوگوں کا خیال تھا کہ اس پروگرام میں ایک بزرگ ادیب کی بے حرمتی ہوئی ہے۔ حالانکہ میرا خیال ہے کہ ہر جوان طالب علم کو یہ حق حاصل ہے کہ شائستگی کے دائرے

میں رہتے ہوئے اپنا نکتہ نظر بیان کرے۔ مگر جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہماری قوم کا مزاج، بڑا احساس ہے۔ یعنی اگر 'پولیس' کا لفظ استعمال کر دیا تو سارے پولیس والے ہڑتال کر دیں گے۔۔۔۔ یا حجام کا لفظ آتے ہی حجام کا احتجاج شروع ہوتا ہے کہ ان کی توہین کر دی۔

پروین شاکر :- کیا اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ ہم میں تحمل کی کمی ہے۔

ضیاء محی الدین :- نہ صرف تحمل کی کمی ہے۔ ظرافت کی بھی کمی ہے اپنے اوپر ہم کوئی تنقید سننا گوارا نہیں کرتے۔

پروین :- آپ کے ساتھ قسمت بہت مہربانی رہی آپ نے بیرونِ ملک تھیٹر میں تربیت حاصل کی۔ پھر شہرت پائی مگر یہ بتائیں کہ یہ فن، یہ ہنر، یہ تربیت آپ کے ملک کے لئے کیا کام آرہا ہے؟

ضیاء محی الدین :- بات یہ ہے کہ آپ کا ایک مصرع ہے کہ (آپ ریزہ ریزہ ہونے لگی تھیں)۔ تو ایک وقت ایسا آیا کہ میں نے محسوس کیا کہ "آئے مجھے میرا فن سمیٹے"۔۔۔۔ اگر میں سرکار کا ملازم ہوتا۔ یا میرا تعلق زراعت یا تجارت سے ہوتا تو میں ایک پیشہ چھوڑ کر دوسرا پیشہ اختیار کرتا۔ اپنے حالات کو بہتر بنانے کے لئے لیکن جب وہ آئے مجھے میرا فن سمیٹے والی بات کی توجب میں نے یہ محسوس کیا کہ کیا جو مجھے کرنا چاہیئے وہ کر رہا ہوں۔۔۔۔ یا جو میں کرنا چاہتا ہوں اس سے میرے علاوہ کسی اور کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔۔۔۔ مجھے محسوس ہوا خاص فائدہ نہیں پہنچ رہا۔

پروین شاکر :۔ یہ اندازہ لگانے میں آپ نے جلد بازی نہیں کی۔
ضیاء محی الدین :۔ جی نہیں میں نے اپنے حساب سے پانچ چھ برس دیکھ لیا۔
پروین شاکر :۔ لیکن اب تو تھیٹر اور اسٹیج میں ترقی ہو رہی ہے
ضیاء محی الدین :۔ کون سے اسٹیج کی بات کر رہی ہیں آپ!
پروین شاکر :۔ لاہور اور کراچی میں جو ڈرامے ہو رہے ہیں۔
ضیا محی الدین :۔ جی نہیں وہ ..... دراصل میں نے جو اپنے لئے معیار مقرر کئے ہیں یا کر رکھے ہیں ان سے نیچے نہیں آسکتا۔
پروین شاکر :۔ مگر آپ فلم میں بھی تو گئے۔
ضیاء محی الدین :۔ ہاں میں نے کوشش کی مگر اپنے آپ کو ایڈجسٹ نہ کر سکا۔ اور دیکھا کہ کیا میں اس ماحول کے معیار پر پورا اتر سکتا ہوں یا نہیں ...... ظاہر ہے کہ میں نہیں اترا۔
مہتاب :۔ ایسا تو نہیں کہ وہاں آپ کو وہ آسانیاں نہ مل سکیں۔ جو آپ چاہتے ہیں۔
ضیاء محی الدین :۔ نہیں میرا خیال ہے کہ میں نے پورے خلوص سے کوشش کی ہے کہ مجھے ان کے معیار پر پورا اترنا ہے۔ کیونکہ ابھی اس معاشرے میں اس ماحول میں اس طرح کا کام ہوتا ہے۔ لہذا میں نے اپنا کوئی معیار نہیں بنایا بلکہ ان کے معیار کے مطابق خود کو ڈھالا مفاہمت کی کوشش کی۔ آپ جانتی ہیں انسان زندگی میں ہزاروں مفاہمتیں کرتا ہے۔ مگر ایک وقت وہ آتا ہے جب آپ کو اپنے آپ سے سوال کرنا ہوتا ہے۔ کہ کیا جو میں کر رہا ہوں

وہ میرے اپنے ذاتی معیار پر پورا اتر رہا ہے یا نہیں - یہ میں اپنی ایک کمزوری آپ کو بتا رہا ہوں - میں نے محسوس کیا کہ میرے معیار اتنے کمزور ہو گئے ہیں کہ میرا اپنا کوئی معیار ہی نہیں رہا اور اگر مجھے کچھ کرنا ہے تو مجھے اپنا معیار پھر سے بڑھانا چاہیئے -

( اس جگہ راولپنڈی سے کھیلا جانے والا ڈرامہ مارخیم کا منظر دکھایا گیا جہاں مارخیم چوری کرنے کے بعد اپنے آپ کو آئینہ میں دیکھتا ہے اور خود کلامی کرتا ہے )

---

پروین شاکر :- جب آپ نے پاکستان چھوڑا تو اس وقت آپ اپنی مقبولیت کی انتہا پر تھے پوری نسل آپ سے متاثر تھی آپ کی چال ڈھال - لباس ، بات چیت ہر لحاظ سے آپ ہر دلعزیز اور مقبول تھے پھر شو بزنس سے تعلق کے حوالے سے آپ کا اس جگہ کو چھوڑ کر جانا مناسب تھا -

ضیاء محی الدین :- میرا خیال ہے کہ زندگی میں اگر کوئی دانشمندی کا کام کیا ہے تو وہ یہ ہی کہ آدمی کو اسی وقت جانا چاہیئے جب لوگ اس کی تھوڑی بہت قدر کر رہے ہوں - اور میرے خیال میں یہی ٹرینڈ سیٹر ( TREND SETTER ) کا کام ہوتا ہے -

" HE SETS THE TREND AND OFF GOES THE TREND "

پروین شاکر :- اچھا یہ بتائیں آپ نے کیرئیر ریڈیو سے شروع کیا - بطور نیوز ریڈر اب بھی وہ فیلڈ کبھی آپ کو یاد آتا ہے -

ضیاء محی الدین :- بالکل یاد آتا ہے اب جبکہ میں خود وہاں

( DRAMATIC DOCUMENTRY ) پروڈیوس کر رہا ہوں۔ ان میں یہ بہت کام آ رہا ہے اگر نیوز ریڈنگ نہ کی ہوتی تو شاید صحافت وغیرہ پڑھنا پڑتی...... تو وہ تربیت بہت کام آ رہی ہے۔

**پروین شاکر** :۔ پھر نیوز ریڈنگ کے بعد آپ نے اناؤنسمنٹ کی ؟

**ضیاء محی الدین** :۔ جی ! بہت پاپڑ بیلے ہیں زندگی میں۔

**مہتاب چینا** :۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ کی اردو انگریزی زدہ ہے۔

**پروین شاکر** :۔ حالانکہ آپ نستعلیق قسم کی اردو بولتے ہیں۔

**ضیاء محی الدین** :۔ وہ اس لئے کہ لوگوں کو پہلے سے یہ تاثر دیا دیا جاتا ہے کہ یہ وہ شخص ہے۔ جو باہر مغرب میں رہتا ہے تو وہ پہلے سے ایک تاثر قائم کر لیتے ہیں۔ حالانکہ میں وہ شخص ہوں جو اپنی زبان میں انگریزی کو داخل کرنا گھٹیا پن سمجھتا ہوں۔ لیکن اگر آپ کے کہنے کے مطابق میری اُردو میں مغرب کا اثر ہے تو بتایئے میں کیا کروں۔ کیونکہ یہ آپ نے مجھے آج ہی بتایا ہے۔ ویسے میں یہی عرض کر سکتا ہوں کہ بھائیو میں تو اپنی زبان کو بہت عزیز جانتا ہوں۔ ویسے ہم لوگ یہ بہت کہتے ہیں کہ دیکھو اس کا لہجہ کیا ہے۔ یہ ہم لہجے پر اتنا کیوں جاتے ہیں۔ دراصل لہجے کا نہ ہونا ہی تقریر کی اصل لذت ہے۔ ہمیں لہجے کی بجائے زبان کی صفائی کا خیال رکھنا چاہیئے یعنی

لفظ دوسروں کو آسانی سے سمجھ میں آنے چاہئیں۔

---

" ضیاء محی الدین شو کے حوالے سے یہ ضرور کہوں گا کہ اس میں میں نے کمپیئرنگ اس انداز سے نہیں کی۔ جیسا کہ عام طور سے یہاں ہوتا ہے۔ کہ کمپیئر اپنے آپ کو بہت عالم، فاضل اور ایک قابل شخصیت کے طور سے پیش کرتا ہے۔ اور ہر آن ہر لمحے وہ دیکھنے والوں کو یہ احساس دلاتا ہے کہ اس سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ "ضیاء محی الدین شو" میں، میں نے ایک میزبان کے طور سے اپنے فرائض نبھائے ہیں۔ یعنی کوشش یہ کی کہ ضیاء محی الدین بطور ایکٹر کہیں نظر نہ آئے۔ بلکہ ایک ایسا میزبان نظر آئے۔ جس نے گھر کے سے ماحول میں چند مہمانوں کو مدعو کیا ہے۔ اور ان کی اچھائیاں لوگوں کو بتانا چاہتا ہے۔ ان کی تعریف، ان کی شخصیت کو ابھارنا میرا اصل مقصد تھا۔ جبکہ اب کمپیئرنگ کا انداز بالکل بدل گیا ہے یہ شخص خود بولتا ہے۔ اور دوسرے کو بولنے کا کم موقع دیتا ہے یا پھر ایک مہمان کے بعد دوسرے مہمان کو بلانے کے درمیانی وقفے میں بے تحاشا بولتا چلا جاتا ہے۔"

(گفتگو دسمبر ۱۹۸۶ء لاہور کینٹ)

# تجھ کو چاہا تو اور چاہ نہ کی

# NAHID SIDDIQUI

# KATHAK DANCER

**KATHAK DANCE**

Kathak is the classical dance style of Northern India. It is a dance form in which gesture, movement, posture and pace are determined by the unceasing flow of rhythm and its patterns. The essential rapport and unity between dancer and drummer must be maintained without a single lapse

Nahid Siddiqui has been described as the most eminent classical dancer to have emerged from Pakistan

A virtuoso dancer in the art of Kathak, Nahid Siddiqui was trained by Maharaj Ghulam Hussain, a pupil of Achhan Maharaj and one of the finest exponents of the Lucknow School of Kathak dance

Nahid Siddiqui began her training at the age of 15, unlike many classical dancers who start serious training in early childhood She was, however, soon marked out as a star pupil and after initial training joined Pakistan's PIA Academy (then the country's National Academy of Dance)

She travelled widely performing in ensemble dancing as well as making solo appearances in pieces created for her. A further period of intensive training with her teacher followed and her reputation as a dancer of rare distinction began to grow

She has worked in many parts of the world, including New York, Tokyo and Moscow and she has had her own television series on Pakistan Television

Nahid arrived in London in 1978 and soon initiated classes in Kathak dance at the Indian Cultural Centre (Bharatiya Vidya Bhavan) After a year she returned to India and worked with the great Kathak dancer, choreographer and teacher Brijju Maharaj, whose distinguished career has been directed towards adapting Kathak dance for the modern stage Under Brijju Maharaj's influence, Nahid has herself proved, with her contemporary interpretations of the Kathak dance style, that experimentation and innovation are essential not only to the survival of a tradition, but also to its creative development

Nahid now lives in Birmingham with her husband Zia Mohyeddin and their small son She teaches a weekly class at the Midlands Arts Centre and undertakes a busy schedule of performances throughout the country She works closely with her musicians on a daily routine of practice and improvisation

# Zia Moheyuddin weds

**By Our Staff Reporter**

Mr Zia Moheyuddin, Director of PIA Arts Academy, has married Academy's dancer Miss Naheed Siddiqi, daughter of film star Talat Siddiqi, it is learnt.

The Nikah was performed on Sunday at a ceremony attended only by family members.

پی آئی اے ٹروپے کا قیام ضیاء محی الدین میں ایک نئی تبدیلی لایا اور وہ ناہید صدیقی اور ضیاء محی الدین کی دوسری شادی ہے۔ ضیاء محی الدین کی اس شادی پر بے شمار قیاس آرائیاں کی گئیں۔ ایک اخبار نے لکھا "کہ ضیاء محی الدین اور ناہید کی شادی کے بعد یہ امکان ہے کہ اب پی آئی اے کی آرٹ اکیڈمی سے ان کا تعلق ختم ہو جائے گا۔ اس لئے کہ ضیاء اس اکیڈمی کے ڈائریکٹر ہیں اور ناہید وہاں رقاصہ ہیں دوسری رقاصاؤں کو یہ شکایت ہو سکتی ہے کہ ناہید کے مقابلہ میں ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ خود ضیاء نے اس سلسلے میں پی آئی اے کے سربراہ جناب نور خان سے بات کی تھی اور کہا تھا۔ کہ ہم دونوں اکیڈمی میں کام کر سکتے ہیں جناب نور خان نے ان کی رائے سے اتفاق کیا

لیکن اگر کچھ عرصہ بعد کوئی شکایت ہوئی تو ممکن ہے کہ ناہید علیحدگی اختیار کر لیں مگر ایسی صورت میں اکیڈمی ایک اچھی فنکارہ سے محروم ہو جائے گی۔ ان کی شادی ان کی بہن کے گھر (کراچی) میں سادگی سے ہوئی ہے حد یہ ہے کہ نکاح کے وقت پھول بھی نہ تھے اور نکاح کے فوراً بعد ضیاء اپنی ڈیوٹی پر چلے گئے دونوں نے ہنی مون منانے کے لیئے چھٹی کی درخواست بھی نہیں دی۔

ناہید صدیقی مشہور فلم اسٹار طلعت صدیقی کی بڑی صاحب زادی ہیں انہوں نے مہاراج غلام حسین کتھک سے رقص کی تعلیم لی اور پھر پی آئی اے کی اکیڈمی سے منسلک ہو گئیں۔ یہیں ان کی ملاقات ضیا محی الدین سے ہوئی

اوران دونوں نے شادی کرلی۔

ان کا گھرانہ ہندوستان کے کپور خاندان کی طرح فنکار گھرانہ ہے۔ جس میں ہر عمر اور ہر شعبے کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ طلعت اوران بہن ریحانہ صدیقی اور ان کے میاں اورنگ زیب ٹیلی ویژن اور ڈرامہ اور فلم سے متعلق ہیں ان کے بھائی ظہیر انجم افسانے اور ڈرامے لکھتے ہیں۔ طلعت صدیقی کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے ندیم صدیقی پیٹرولیم اور گیس انجینئر ہیں اور الاسکا میں مقیم ہیں ناہید صدیقی سے چھوٹی نزہت صدیقی اسٹیج اور ٹیلی ویژن کی اداکارہ ہونے کے ساتھ ساتھ لوک رقص اور کلاسیکی رقص میں اپنے فن کا لوہا منوا چکی ہیں اور عارفہ صدیقی جو سب سے چھوٹی ہیں اس کی صفاتِ فن سے کون بے خبر ہے۔

ناہید نے یوں تو راولپنڈی میں جنم لیا۔ مگر ان کی پرورش زیادہ تر کراچی میں ہوئی جہاں ان کے والد بشیر صدیقی ملازم تھے۔ ناہید نے ہپی ہوم سکول۔ شہید ملت روڈ کراچی میں آٹھویں جماعت تک پڑھا پھر انہیں لاہور آنا پڑا۔ یہاں ناہید نے لنز رڈے سکول میں داخلہ لیا اور میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ہوم اکنامکس میں داخلہ کے ساتھ ساتھ رقص کا ریاض بھی جاری رکھا۔ پی آئی اے آرٹس اکیڈمی میں دنیا گھومنے کا موقع ملا۔ اور آج ناہید بین الاقوامی شہرت کی حامل کتھک ڈانسر ہیں۔ ناہید بھارت کے علاوہ امریکہ، روس، کینیڈا، مالٹا، فرانس، بلجیئم، جرمنی، چین، جاپان، کوریا، ایران، برطانیہ، کابل، سپین، اٹلی، اردن اور مونٹی کارلو میں اپنے فن مظاہرہ کر کے پاکستان کا نام روشن کر چکی ہیں۔

خطوط ویسے تو بجی ہوا کرتے ہیں لیکن یہی نجی خطوط کسی بڑے انسان

کی زندگی کے بے شمار گوشے بھی بے نقاب کرتے ہیں۔ غالب کے خطوط دراصل ایک ایسے انسان کے ہیں جو فقدان راحت پر احتجاج کرتا نظر آتا ہے حالانکہ اپنی شاعری میں غالب کہیں بھی سبک سر نہیں ہوتے۔ اس لئے خطوں میں ہمارے لئے وہی کشش ہوتی ہے جو ہمارے لئے ہمارے دوستوں میں ہوتی ہے اگر آپ کسی کی سرگوشیاں سننا چاہتے ہیں۔ یا اسے برہنہ دیکھ کر قہقہہ لگانا چاہتے ہیں تو ادبی کارناموں کی بجائے خطوں کا روحانی سفر کرنا ہوگا کیونکہ خطوں میں بیمار بعض اوقات تندرست، غم پسند انتہائی خوش نظر آتے ہیں جنہیں آپ مغرور خیال کرتے ہیں انہیں آپ عاجز پائیں گے۔ جنہوں نے میدان سر کئے ہیں ان میں گہری نسائیت نظر آئے گی۔ خاک کے تودوں میں جذبہ اور مردم بیزاروں میں نرمی، نزاکت اور خلوص کی آنچ ملے گی۔ گلاب کے تختے مصنوعی نظر آئیں گے۔ اور بید مجنوں میں بہار کار فرما ہوگی۔ خطوط ادبی کارنامہ ہیں جن کی بدولت لکھنے والا ان چند لمحوں میں لازوال ہو جاتا ہے۔ جنہیں جنبش قلم نے محفوظ کر لیا ہے۔

ضیاء کے خطوط ناہید کے نام ضیاء کی امنگوں اور آرزوؤں کا اظہار ہیں۔ ان خطوں میں ضیا کی وہ تمام ناآسودہ تمنائیں بے قرار نظر آتی ہیں جنہیں ضیاء کبھی بھی اسٹیج پر پیش نہ کر سکے۔ خطوط زیر لب ایک ہندوستانی عورت کا مرد کے لئے چاہت کا اظہار ہیں تو ضیا کے خطوط ایک مرد کا عورت کے لئے دیوانگی، بے قراری اور چاہت کا منہ بولتا ثبوت۔ اس لئے ان خطوں میں ضیاء ایک نئے سے انداز میں نظر آتے ہیں۔ ضیاء شوہر کی بجائے دوست اور ناہید بیوی کی بجائے محبوب ہیں جیسے ضیاء ٹوٹ کر محبت کر رہے ہیں ضیاء کا گھر بسانے کی آرزو اور ناہید کے ملاپ کی خواہش میں آدم کی حوا کے لئے

وہی تڑپ نظر آتی ہے۔ جو جنت سے نکال دینے کے بعد حوا کی جدائی میں آدم نے محسوس کی تھی۔ اس لئے ان خطوں میں ہم ضیا کو ایک ایسا دوست خیال کریں گے۔ جس کے لئے ہم بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ضیاء کی بجی باتیں ہمیں غیر معمولی نظر آتی ہیں۔ ان خطوں میں ضیاء کے اسلوب میں وہی بات ملتی ہے۔ جو گرمیوں کی چاندنی میں ہوتی ہے۔ جدائی نے ضیاءؔ کے اندر ایک ہلکی سی افسردگی پیدا کر دی ہے۔ ضیاء کا اسلوب دھیما ہے لیکن اس کی تہوں میں جذبات کی وہ گرم رو رواں دواں ہے جس میں روحانیت ہے۔ اور جو دنیا کو پراسرار بنا دیتی ہے ان خطوں میں تنہائی کے مزے بھی ہیں اور وصل کی لطافتیں بھی اور یہی وجہ ہے کہ ضیاء ان خطوں میں خود بھی برف کی طرح پگھلتا نظر آتا ہے۔

# صبح کا راگ

استھائی :۔ اس سمے ہلکی ہلکی ٹھنڈ ہے، چاروں اور چپ ہی چپ ہے، شانتی ہے، پرنتو میرے من میں کسی انجانے ایشور نے نیلی پیلی گھٹائیں کھڑی کر دی ہیں، چین نہیں، ایسا اکیلاپن ہے، اور ایسا سونا پن ہے۔ مانو جیسے جیون ایک اتھاہ بن باس ہو۔

انترہ :۔ ہردے، ہردے، تم اس وقت کیا کر رہی ہو، ابھی تک رات کے کپڑوں میں بدر بدر بکھر رہی ہو۔؟ باسی روٹی کے ساتھ اچار کھا رہی ہو۔ اپنی پلکوں کو اکھاڑ سنوار رہی ہو۔ سر نہوڑائے، ننگے پاؤں چائے دانی کو پیالی میں انڈیل رہی ہو ...... یا کھلی آنکھوں سے گاڑی کی پچھلی سیٹ پہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی ہو ..... بہت یاد آ رہی ہو۔

ضیاء محی الدین

یہ راگ مدھوونتی نہیں، رام کلی نہیں گن کلی نہیں۔

یہاں اس وقت صبح کے سات بجے ہیں تمہارے ہاں دن کے گیارہ بجے ہوں گے۔

ایک گمنام ہوائی اڈہ،

صبح سویرے گاڑی میں بیٹھ

کر جب ہوائی اڈہ کا رخ کیا تو ڈرائیور میلوں دور نیروبی کے بین الاقوامی اڈے
کی طرف چلا گیا۔ جب کہ اسے ایسی جگہ جانا تھا جہاں سے پرائیویٹ چھوٹے ایک
یا دو انجن والے جہاز چلتے ہیں میرا ماتھا وہیں ٹھنکا جب وہاں پہنچ کر میں نے
دیکھا کہ اپنوں میں سے کوئی شخص موجود نہیں ہے۔ تب میں نے اسے کہا
واپس چلو، راستے میں مجھے خیال آیا کہ شاید ہمیں وہاں جانا تھا۔ جہاں پہلے
دن سیسنا جہاز میں ہم لوگ اڑ کر جھیل بے رنگو گئے تھے۔ میرا خیال ٹھیک
تھا لیکن جب یہاں پہنچا تو جہاز انتظار کر کے اڑ چکا تھا۔ اب وہی جہاز
لوگوں کو اتار کر میلنڈی سے واپس آئے گا۔ تو مجھے لے کے جائے گا۔ ایک
چھوٹے سے کمرے میں بیٹھا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ کافی بھی پینے کو مل
گئی اور کاغذ اور لفافہ بھی، ایک دراز میں رکھا تھا میں نے نکال لیا ہے آس
پاس کوئی نہیں، باہر بارش ہو رہی ہے آسمان کا رنگ آدھا کاسنی آدھا
فاختئی ہے۔

آج سویرے سویرے جو ایک لڑکی امریکہ سے اس فلم میں سٹار پارٹ
کرنے آئی تھی اسے بھی جواب مل گیا ہے۔ کل دوسری لڑکی امریکہ سے
آئے گی۔ نئے ڈائرکیٹر سے میری ابھی تک ملاقات نہیں ہوئی ممکن ہے وہ
میرے بارے میں بھی یہی سوچے۔ کہ جس پارٹ کے لئے پچھلے ڈائرکیٹر نے مجھے ہی
منتخب کیا تھا۔ وہ میری بجائے کسی اور کو کرنا چاہیئے۔ کاسٹنگ بہر حال ڈائرکیٹر
کو کرنی ہوتی ہے، مجھے قطعی کوئی گھبراہٹ نہیں نہ ہی تشویش، ایسا ہوا تو خدا
حافظ کہ کرایہ سمجھ کر کہ دو ہفتوں کی چھٹی اچھی رہی، آرام سے تمہیں تار دارے

کر گھر کا رخ کروں گا۔ یہاں صرف لفظ گھر غلط ہے۔ گھر کہاں ؟
وہ تمام کام جواب تک ہو چکا ہے اب دوبارہ فلمایا جائے گا لیکن بغیر توسیع کے، یعنی اتنے ہی ہفتوں میں جو ان کا پہلے سے پلان تھا۔
کل نیروبی کے اخباروں میں میرے بارے میں خاصی بڑی خبر چھپی تھی حسب معمول میں تنازعہ سیاسی ختم ہو رہی ہے۔ دوسرا قلم جیب میں ہے) وہ پرچہ خریدا نہ کسی سے مانگا۔ ایک زمانے میں کس قدر چاؤ سے میں ایک ایک تراشہ رکھا کرتا تھا۔
مجھے کوئی فکر نہیں، خط تمہیں ملے گا یا نہیں اگر تمہارے چلنے سے پہلے نہ ملا تو کیا نزہت ہمارے خط جمع رکھے گی یا نہیں۔ اگر اتفاق سے یہ خط مل جائے تو اپنے ساتھ کوئی ایسا جوتا ضرور لانا جو بیڈا اور بوٹ نما ہو۔ اگر اتفاق سے تم لوکیشن پہ گئیں تو زمین سخت ناہموار اور کانٹے دار اور پتھریلی ہو گی۔ جینیز بہت ضروری ہیں لیکن نیچے پہننے کے لئے یا تو کینوس کے سینڈل یا پھر کسی طرح کے بوٹ۔
نیروبی کا موسم اس قدر خوشگوار ہے کہ شام کو (بلکہ دن میں بھی) ہلکا سا کوٹ پہننا اچھا لگتا ہے۔ لیکن میلنڈی جہاں ہم تقریباً تمام وقت ہوں گے۔ بہت مرطوب اور گرم جگہ ہے بس ایک چادر یا وہ سوٹ جو تم نے خریدا تھا۔ دو یا تین پاؤنڈ میں وہ بہت کافی ہو گا۔
سوچا تھا نیروبی پہنچوں گا تو تمہارے کئی خط میرے منتظر ہوں گے۔
پر ایسا نصیب کہاں ؟

ضیاء محی الدین

تم ہر وقت میرے ساتھ ہو صبح سے پانچ بجے تک، اس کے بعد بڑے مضبوط ارادے سے ہیں کرسی پر بیٹھا ہاتھ میں کتاب تھما جو مجھے معلوم ہے تم نہیں پڑھو گی۔ تھیٹر چلا جاتا ہوں۔ رات تک پھر میرا دھیان کھیل پہ رہتا ہے، ایسا نہ کر پاؤں۔ تو ان لوگوں سے اور اپنے آپ سے دھوکا کروں گا، اگر کہیں سیر کو جاتا ہوں۔ ٹہلنے، تو تمہیں ساتھ لئے تمہاری انگلیاں دیکھتا ہوں۔ کبھی کبھی رنگ نہ اتار نے پہ ڈانٹتا ہوں۔ لیکن تصور کے اس قدر وفور کے باوجود تمہارے لمس کو ترستا ہوں۔

تو اب میری سنو، کام میں اور کاسٹ میں کچھ کچھ رچاؤ پیدا ہونا شروع ہو گیا ہے، مراد اس سے یہ ہے کہ کہیں کہیں گھڑی دو گھڑی کو لوگوں میں اپنے اپنے کردار کا ہلکا سا پرتو نظر آتا ہے (پرتو نظر آتا ہے یا ملتا ہے؟ میرے خیال میں ملتا ہے کہنا صحیح ہے) میں بیچ میں، کہیں نہیں گیا۔ کہیں جانے کو دل نہیں چاہتا ایک آدھ بار حرمت بیگ کے گھر روٹی کھائی، پہلے دن کے بعد سے اب تک کبھی ریہرسل کے بعد نہ اپنے اداکاروں کے ساتھ مل بیٹھنا ہوا، نہ رت جگا، ایک شام ایک ضیافت میں گیا جہاں پاکستان کے سب سے بڑے پادری مدعو تھے۔ ان کی کچھ "پت" اتاری۔ یونہی جی چاہا کہ یہ سارے مرد جو اس قدر تکلیف کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ بہت بناوٹی باتیں کر رہے ہیں ان کی تھوڑی سی بچکاری کی جائے، بہتر ہوتا اپنی بیزاری کو اپنے اوپر تسلط رکھتا۔ خیر۔

معمول یہ ہے کہ ریہرسل سے واپس اپنے کمرے میں چلا آتا ہوں۔ کھانا کھاتے کے بعد کتاب، ایک ضخیم کتاب البسن پہ ختم کی ہے کوئی گیارہ سو صفحے کی چودہ نہیں تو گیارہ طبق تو روشن ہوئے، باقی وقت ہلکی پھلکی کتابیں، اور پھر رات، اور پندرہ پندرہ منٹ بعد گھڑیال کی آوازیں، کل رات پہلی بار نیند کی گولی لی۔

بازار کا رخ نہیں کیا، ہاں کتابوں کی دکانوں پہ کچھ گھنٹے صرف کئے گاڑی میرے پاس ہے لیکن کہیں چکر لگانے کو ابھی تک نہیں گیا۔ بس بھٹیر جاتا ہوں۔ وہ ایسا دور بھی نہیں پیدل ہی جا سکتا ہوں۔ گاڑی واپس نہیں کرنا چاہتا۔ کہ اگر ضرورت پڑی تو کوفت ہو گی۔

مینوس میاں کی ۲۶ر اکتوبر کو سالگرہ ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں کیوں صاحب یہ خوب یاد ہے، خوب دل ناشاد ہے۔ کہاں کی بیزاری کیسی آہ وزاری، یہ ٹھکانہ ہے۔ آپ کی چاہت کا، یا بہانہ ہے میری آفت کا، دن آج اکتوبر کا نواں ہے، بس ہر شئے مجھ پہ عیاں ہے.....

[کبھی مقفٰے عبارت پڑھی؛ عبدالحلیم شرر کے زمانے تک تقریباً سبھی دوسرے درجے کے لکھنے والے قصے کہانیوں میں ایسی نثر لکھتے تھے۔ مقفٰے کا لفظ اگر نہیں سنا تو اپنے ابا میاں سے پوچھو!!]

کپڑا لتّا تو خیر جاتے وقت لے لوں گا۔ لیکن سالگرہ کے لئے اسے کسی خاص چیز کی امید ہے تمہی بتاؤ، ابھی تو یہی سوچا ہے کہ ثریا کو لکھے دیتا ہوں۔ کہ کرکٹ کا ایک بلّا خرید کے اسے دے دیں۔ کرکٹ کا وہ جنون کی حد تک شیدائی ہے۔

مگر جناب صاحب، ۲۶ کو کیا کیا؟ اور ۲۷ کو ۲۸ کو، ۲۹، ۳۰ کو؟ پہلی اکتوبر کو خط لکھا ہے۔ جھانیٹر کا جھنپوڑا، بڑی آئیں انگریز کی بچی!

"اے دل نواز دل فریب سحر انگیز حسینہ تیرے حسن کا غرور ایک نہ ایک دن پاش پاش ہو گا۔"

آسکا رام لگری

چمپا وتی

میری ہدایات کام آئیں، ہر روز پوچھتا تھا ہر روز بتاتا تھا کہ جس دن میرے نام کوئی خط آئے، قاصد بھیجو، فوراً بتاؤ۔ سویرے سویرے اطلاع ملی کہ ایک خط آپ کے نام آیا ہے۔ بھاگا گیا۔ پڑھا، پھر پڑھا، مجھے معلوم ہوتا کہ تم چھ تک کراچی ہو تو میں وہیں لکھتا، کم از کم نو دن لگتے ہیں خط کو یہاں سے وہاں پہنچنے میں اس لئے میں شروع سے اب تک لاہور ہی کے پتے پہ لکھتا رہا ہوں، اب تک تمہیں میری کئی اوٹ پٹانگ داستانیں مل چکی ہوں گی۔

فیروز سنز جانے کی ضرورت نہیں، کاغذ، خط لکھنے کا کاغذ، تو آج کل پنساری کی دکان پہ بھی مل جاتا ہے۔

ایک خط مجھے ایسا "چاہیئے"، جس میں یہ بتاؤ کہ اٹھنے سے سونے تک کے اوقات کس طرح بسر کر رہی ہو۔

ایک نصیحت۔ فسانۂ آزاد مشہور قصہ ہے، کئی سو صفحے کی کتاب ہے میں یہ نہیں کہتا کہ پوری پڑھو لیکن کہیں کہیں سے، ٹاتواں ٹاتواں دیکھو، زبان کی چاشنی ہے۔ عصمت چغتائی کی کہانیاں ضرور مل جائیں گی۔ وہ ضرور پڑھ لو اور دیہ بہت ضروری ہے، میرے آنے تک شیکسپیئر کے دو کھیل، کوئی دو کھیل، چیخوف کا ایک کھیل، سر کے اوپر سے گزر جائے۔ کچھ مضائقہ نہیں،

بہت بوجھ ڈال رہا ہوں بھئی بیچاری کیا کچھ کرے۔ "سوکھ کے کانٹا ہو گئی ہے" ہاتھ پاؤں کی خشکی دور کرے، بالوں کو گھنا کرے۔ جوڑوں کا درد مٹائے، آشا بھوسلے کے گانے سنے، درزی کے چکر لگائے اب اوپر سے ارشاد کرتے ہیں کہ بیٹھ کے موٹی موٹی اللہ ماری کتابیں کھنگالو ......

اپنی اماں کو میرا بہت سا پیار دو۔ وہ جو کچھ تم پہ نچھاور کرتی ہیں اس اکہتر سے

ضرب دو۔ میری کیفیت کا کچھ اندازہ ہو جائے گا۔

ضیاء محی الدین

---

میری ہنڈول بہار، میری مدھ ونتی، آج اتوار کا دن ہے، میلی میلی دھوپ ہے۔ یہ میری دوسری اتوار ہے، اس سے پہلے کہ کام میں جُت جاؤں تمہیں دیکھنے کو جی چاہ رہا ہے، کل شام سے میرے پاس ہو۔ رات تم سے غضب کا سوانگ رچایا، پانچ سال کی بچی بن کر میرے پاس آگئیں میں لوگوں سے یہ کہہ رہا ہوں کہ تمہیں کوئی ایسی دوا ملی ہے جس سے تمہارا جُثّہ کم ہوگیا ہے، کسی کو یقین نہیں آتا، بس صرف تمہیں معلوم ہے اور مجھے، تم چپ چاپ بیٹھی ہو جیسے تمہیں اعتبار نہیں ہے دوا کا اثر زائل ہونے کے بعد تم اپنے اصلی رُوپ میں واپس آجاؤ گی۔

یاد نہیں پڑتا کہ کب اس طرح کی کیفیت تھی۔ کہ دن میں کم از کم دو مرتبہ دنوں کو انگلیوں پہ گنتا ہوں۔ یوں تو گنا کہ واپس جانے میں صرف دس دن باقی رہ گئے ہیں۔ یُوں کبھی نہیں گنا کہ ابھی واپس پہنچنے میں اتنے دن باقی ہیں؟ یہ سب تمہارا کیا کرایا ہے اس کی سزا کبھی نہ کبھی بھگتو گی۔

ساڑھے دس بجے مشق شروع ہو گی۔ دوپہر میں ڈیڑھ گھنٹے کے وقفے کے بعد پھر شام تک، ختم کرنے کا وقت میں تعین کرتا ہوں۔ جب لوگوں کی توجہ میں شکن پیدا ہو جاتی ہے تو ختم کر دیتا ہوں۔ اس کمپنی کی ایک پلیٹن ایک اور کھیل کی تیاری کر رہی ہے، وہ کھیل اگلے ہفتے شروع ہو گا۔ کل شام بڑا سانحہ ہوا، اس کھیل میں جو عورت مرکزی کردار کر رہی ہے اس کے گردے میں بے پناہ تکلیف ہوئی۔ اسے

ہسپتال لے جایا گیا۔ معلوم ہوا اس کا فوری آپریشن ہو گا۔ یہی ہی کھیل منسوخ کریں کیا کریں؟ آخر کو ان لوگوں نے فیصلہ کیا کہ وہ کردار کسی اور سے کرایا جائے۔ پانچ چھ دن میں نئی لڑکی کیا کرے گی؟ اور کیسا کرے گی؟ مجھ پہ ایسا مرحلہ آن پڑے تو میری پریشانی کا کیا عالم ہو؟ اور میرا کھیل ایسا ہے کہ کرداروں کو نفسیاتی سمجھ بوجھ کے لئے کئی ہفتے چاہئیں، انگریزی میں کہتے ہیں لکڑی کو چھوڑو اور ایک انگلی کو دوسری پہ موڑ لو۔

اب کوئی خاص ضرورت نہیں کہ موٹر چلاتی پھرو، پہلے قانونی پروانہ حاصل کرو۔ بانو بازار کے چکر لگانے کی کیا ضرورت ہے؟ آرام سے پیر پسارو، سر میں تیل چڑھواؤ اور اس (غلط) خیال میں مگن رہو۔ کہ تمہارے بال لمبے ہو رہے ہوں۔ مائی صدوں سے مالش کراؤ۔ [اب تو لاہور کی تپش کچھ کم ہو گئی ہو گی۔] امرتسر کے تماشے دیکھو۔ اور سکھوں سمیت، کوئی ایسی فلم دیکھو جس کے عنوان میں غیرت کا لفظ ہو!!!

جان عزیز اب تک جو کچھ بھی لکھا اس امید میں کہ اس کا متن پا جاؤ گی۔ یا تفتیش کر کے۔ ڈھونڈھ پاؤ گی۔ مجھ میں سکت نہیں کہ میں "تم خیریت سے ہو گی۔ مجھ پہ اللہ کا کرم ہے" قسم کی باتیں کروں۔ خط لکھنے کا مطلب گنٹھیا کا مرض بیان کرنا ہو جائے۔ (جو اکثر ہوتا ہے) تو ہم تم کسی خانقاہ میں بیٹھ کر "اللہ دیاں قدرتاں" کی باتیں کیوں نہ کریں۔

کبھی سوچتا ہوں تمہیں "اپنی" زبان میں خط لکھوں۔ مجھے ابھی تک اردو پہ وہ عبور نہیں۔ گو جب بھی کوئی چیز پڑھتا ہوں۔ (انگریزی میں) تو یہ احساس ہوتا ہے۔ کہ مجھے انگریزی زبان پہ بھی کوئی قابو نہیں، تمہارے چھوٹے موٹے فقرے، کچھ انگریزی زبان میں کچھ اردو میں بہت دل پذیر تھے، بس سوچتا ہوں یہی

کیا کروں ۔ ایک جملہ اپنی زبان میں لکھ دیا، ایک بدیسی زبان میں ۔۔۔ مگر وہ تو تنبیہ تھی ۔ حکم تھا ۔ التجا تھی، ارشاد تھا ۔ میں ابھی تک انہی کے سہارے پہ ہوں ۔ انہی کاغذوں کی تہہ کو ہاتھ سے استری کرتا ہوں کبھی الٹا کبھی سیدھا کر کے دیکھتا ہوں ۔ لو اب ساڑھے دس بجنے کو ہیں ۔ یہ لوگ میری طرح وقت کے بہت پابند ہیں ۔

" ۶ر اکتوبر" اور اس ۷ر اکتوبر کی صبح کو زندہ رہنے کی بے پناہ خواہش کے ساتھ اپنا آپ تمہیں سونپتا ہوں "۔

ضیاء محی الدین

مالٹا

تار کا جواب یہ آیا ہے مارہ مینین کہ کام اُدھورا چھوڑ کے آنے کی ضرورت نہیں، شکر ہے کسی جگہ سے تو ہوشمندی کی جھلک نظر آئی

کھیل آج کل اس مرحلے پر ہے کہ ایک دن اُڑان اور دوسرے دن چاروں شانے چت ایک دن محسوس ہوتا ہے کہ کردار بڑی آسانی سے تیر لیں گے اور دوسرے دن خیال ہوتا ہے کہ ابھی تک ہاتھ پاؤں چلانے نہیں آئے۔ یہ سب سے بُرا وقت ہوتا ہے جب ہر طرف دلدل نظر آتی ہے اور اس سے باہر نکلنے کی راہ نامعلوم ہے۔ ہدایت کرنے والے کو راستہ معلوم ہے مگر اس کا کام یہ ہے کہ وہ اداکاروں کو یہ سمجھائے کہ وہ محسوس کریں کہ راہ خود انہوں نے ڈھونڈی۔ اس سے ان کا اعتماد بڑھتا ہے جس سے آگے کی پرواز کے امکانات ہموار ہوتے ہیں۔ یہ سارا سلسلہ پیشہ ور اور صرف پیشہ ور اداکاروں کے ساتھ ہوسکتا ہے اپنے ملک کے ننانوے فیصد اداکار اس پورے تصور سے بے نیاز ہیں۔

مطلب یہ ہوا کہ اب دو نومبر کی سویر کو چلوں گا۔ پہلی کی رات کے لئے دعا کرنا کہ میری لاج رہ جائے یہ بات ہے تو تہذیب کے خلاف کہ اسی رات "کاسٹ" سے خدا حافظ کہوں اور ان کو بُرا بھلا ان کے حال پہ چھوڑ کے بھاگ آؤں، پہلی رات کسی بھی کھیل کے لئے اچھی ہی ہوتی ہے بُری بھی، مہینوں کی محنت کا نچوڑ نکلتا ہے، تعریف کرنے والے بہت سے ہوتے ہیں تماشہ کے بعد کسی کا جی نہیں چاہتا کہ بدتعریفی سُنے کئی اداکار اعصاب کا شکار ہوتے ہیں اچھی خاصی محنت چھوٹی سی حرکت سے گڑھے میں گر سکتی ہے، دوسرے دن ڈھل ڈھلا کے میٹھا جاتا ہے، تجزیہ ہوتا ہے، گھپلوں، کمزوریوں، کوتاہیوں پہ غیر جانب داری سے بات ہوتی ہے۔ تجزیہ ہوتا ہے چھوٹے موٹے سین کی مشق ہوتی ہے اور کھیل کی بیل اصل میں پروان چڑھنا شروع ہوتی ہے۔

ایک میں ہوں کہ منہ سویرے بوریا بستر اٹھائے ہوائی اڈوں کی یکسانیت کو
دیکھتا نکل کھڑا ہوں گا۔ کب جہاز آئے اور اس میں بیٹھوں زرہ بکتر باندھوں
اور گھڑیاں گنوں۔

گھڑی کی سوئی ہندسے چھومے پل آئے پل جائے

فلپائن والوں کا ایک جہاز روم سے کراچی چلتا ہے ہفتے کو یعنی ۲ نومبر کو
بہت کوشش کی مگر ابھی تک تصدیق نہیں ہو پائی۔ کہ وہ لوگ مجھے جگہ دیں
گے یا نہیں۔ ہوائی جہاز والے کہتے ہیں کہ وہ پاکستان کی ہوائی کمپنی کے لوگوں کو
گھاس نہیں ڈالتے میں ان سے کہتا ہوں نہ ڈالیں مجھے تو لے جائیں اس پہ یہ لوگ
ہنستے ہیں۔ اور ساتھ ہی حیران ہوتے ہیں کہ میں اس قدر تلملاہٹ میں کیوں ہوں
ایک جہاز نہ ملا دوسرا سہی' میں انہیں کیسے سمجھاؤں! اگر اس ہفتے کے آخر تک
پکا جواب نہ ملا۔ تو مجبوراً دوسرا راستہ پکڑوں گا۔ یہاں سے صبح ۵ بجے پیرس
جاؤں گا چھ بجے صبح وہاں پہنچوں گا کہ یہاں اور وہاں کے وقت میں فرق ہے ساڑھے
گیارہ کے قریب وہاں سے لندن کا عزم کروں گا۔ اور رات کے آٹھ بجے وہاں
پی آئی اے پکڑوں گا۔ حرمت بیگ کہ ان چیزوں کا منتظم ہے اس بات کو
سمجھا نہیں اور آئیں بائیں کر دیتا ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ اطمینان سے دن
کے گیارہ بجے اتوار کو یہاں سے روم جاؤں۔ اور پانچ بجے شام وہاں سے اپنا
جہاز جو کراچی جاتا ہے۔ اس پہ بیٹھوں۔ میں ابھی تک مصر ہوں کہ اتوار ہی کو کراچی
پہنچنا چاہتا ہوں۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے' ثریا کو تار دے دوں گا۔ اس سے رابطہ
رکھنا۔

بارش کا عالم یہ ہے کہ کل رات سے مستقل شکار کئے جا رہی ہے' بیچ میں
بے تکے' تابڑ توڑ توڑے بھی دکھا دیتی ہے۔ ہوا ایسے چل رہی ہے' جیسے

ریڈیائی ڈرامے کا صوتی اثر ہو، تو صاحب رہی سہی گرمی ختم ہوئی، میں ایک بھی گرم پتلون ساتھ نہیں لایا۔ جو کپڑے لایا ہوں۔ ان میں سے تین چوتھائی ابھی تک نہیں پہنے، ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔

تمہارے ہاں عید ہوئی یا نہیں، کیا پیپا، چیٹر رپن ہوا؟ مجھے یاد نہیں عورتیں بھی گلے ملتی ہیں یا نہیں، ان لوگوں کا تہوار ہوتا ہے۔ تو عمدہ بول گائے جاتے ہیں۔

چلو مل کے کریں سکھیو سنگار۔ معلوم نہیں تم لوگ کس طرح کے گیت گاتی ہو۔ گاتی بھی ہو کہ نہیں

ضیاء محی الدین

برمنگھم ۱۲ ر اپریل۔
بعض چیزیں ایسی ہیں جو مجھے اب تک قبول کر لینی چاہئیں۔ مثلاً بنیادی طور پر تعصب کا شکار ہوتے تعصب کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے کہ ایران کا سہارا ہوتا ہے۔ مثلاً نیکی سے کہیں زیادہ بدی میں جاذبیت ہے مثلاً اس ملک میں لاکھ دھوپ نکلے سراب ہے کیونکہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بارش، زبردست بارش شروع ہو جاتی ہے۔ مثلاً سلیم شاہد وقت کے بارے میں کبھی وعدے کا پاس نہیں کر سکتا۔ یہی ہوا۔

مجھ سے کتنی دفعہ ٹیلی فون پہ یہ طے ہوا۔ کہ چھ بجے وہ ہر صورت میں گھر پر ہوگا گو میں نے کئی دفعہ یہ کہا کہ میں تمہارے دفتر پہنچ جاؤں گا تم شاید چھ بجے تک گھر نہ پہنچ پاؤ۔ حتمی اور پورے یقین سے اس نے کہا کہ گھر میں پہنچنا ٹھیک ہے۔ کیونکہ جمعرات یعنی کل اس کا کوئی خاص کام نہیں ہے۔ میں لنڈن سے موٹر چلا کر سلیم شاہد کے وعدے کے باوجود پونے سات بجے کل شام یہاں پہنچا گھر سے کوئی جواب نہیں پندرہ منٹ تک کھڑا رہا۔ سات بج گئے۔ سلیم شاہد غیر موجود۔ میں گاڑی میں بیٹھ کے بدر کے ہاں چلا گیا۔ کہ اس کی عیادت بھی کر لوں گا۔ انتظار میں آدھ پون گھنٹے کے بعد فون کیا۔ گھر سے کوئی جواب نہیں آخر آٹھ بجے اس کا فون آیا۔ کہ بھئی میں تو دفتر ہی میں پھنسا ہوا ہوں۔ تم آؤ چابی لے جاؤ کہ مجھے تو ابھی ایک آدھ گھنٹہ کچھ لوگوں سے باتیں کرنی ہیں بہت ضروری۔ بندا خدا مجھے لنڈن فون کر کے کہہ دیتے کہ میں شام بھر مصروف ہوں۔

میں کل کی بجائے آج سویرے چلا آتا۔ بدر اب پہلے سے بہتر ہے۔ کام سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ بلے انتہا پرہیز مکمل آرام، شراب بند، سنا ہے ایسی حالت تھی کہ بیان سے باہر۔ جب شروع میں دورہ پڑا۔ تو دو ایک دن

ہوش نہیں آیا۔ آج رات کھانے پر بلایا ہے۔ اپنا کاروبار شروع کرنے کا سوچ رہا ہے۔ دونوں بہت بھلے ہیں۔

سلیم شاہد کا کہنا یہ ہے کہ وہ تمہارے دورے کے لئے تمام کوششیں کئے جارہا ہے میں نے اس سے یہ کہا ہے کہ تمہیں لکھ کے بتائے۔ کہہ رہا تھا مجھ سے ناہید نے وعدہ کیا تھا۔ کہ وہ لکھے گی۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ یہ بات "کام" کے سلسلے کی ہے اس لئے تمہارا لکھنا بے حد ضروری ہے۔ تم خط میں جو جو کچھ اب تک ہوا ہے یا نہیں ہوا ہے اس کی تفصیلات اسے لکھو۔ معلوم نہیں لکھے گا یا نہیں۔ تمہارے پاس پتہ تو ہے۔ نصرت کے پاس بھی ہے ایسے ہی دو حرف لکھ دو۔ اگر وقت ہے۔

کل سویرے جاؤں گا واپس۔ تمام سامان بکھرا پڑا ہے اسے باندھوں گا ہول آرہا ہے۔

کس کا مصرع ہے ؟ آپ کا ساتھ اگر ہو تو غزل ہوتی ہے کوئی بڑھیا بات نہیں۔ مگر اس وقت یاد آگیا۔

ضیاء محی الدین

میری دھوپ،

جہاز پکڑنے سے پہلے معلوم نہیں تمہیں لکھ پاؤں گا یا نہیں، آج اتوار ہے۔ بستر پہ بیٹھا ہوں۔ ہمت نہیں ہو رہی ہے اُٹھوں اور چیزیں باندھنا شروع کردوں کہاں سے شروع کروں۔؟ کس طرف سے؟ کپڑے رکھوں، میلے کپڑوں کی گٹھڑی باندھوں؟ کاغذوں کو علیحدہ کروں، قمیضوں کو؟ کیا مشکل ہے؟!

کل برمنگھم سے لوٹتے ہوئے آہستہ آہستہ گاڑی چلائی، دو گھنٹے کا سفر ساڑھے تین گھنٹے میں کیا۔ کبھی گانے گائے۔ "مورے نیناں بہائے نیر سے کے کر جائیں۔ تو سے ناہیں بولوں" اور کوئی متوالا، اور اک رُت آئے اک رُت جائے اور سانجھی سویرے، دھرول پہ میرے اور جھوٹی تم جاؤ رے۔ اور معلوم نہیں کیا کیا، جتنے گاتے تم سے گانے کی فرمائش کیا کرتا ہوں وہ سبھی گانے پہلے گنگنا کر پھر پوری بھر پور پھٹے بانس جیسی آواز لگا کر، بس گھر پر اک بار پہ آکے پھنس گیا، سر نہ ملنا تھا نہ ملا ..... تم کب ملو گی؟ تمہاری کتنی ریکارڈنگ باقی ہیں؟ تم مجھ سے کب مل سکتی ہو؟ تمہارے نہ ہونے سے ہر شام ہر رات مجھے کرچیاں سی چبھتی ہیں۔

ڈھیروں ڈھیروں پیار، تم سدا بہار رہو۔

ضیاء محی الدین

یہ میراز کام کیا مصیبت ڈال کر رہے گا۔ آج پانچواں دن ہے اور ابھی تک ناک بہنی بھی نہیں شروع ہوئی جو مرحلہ نمبر ۲ ہوتا ہے۔ مرحلہ نمبر ۳ کھانسی اور تیز حرارت، راتیں ایسی کٹ رہی ہیں کہ تین تین بار اٹھ کر ناک میں (تمہاری طرح) دوا ڈالنی پڑتی ہے تو سانس ٹھیک ہوتی ہے خدا جانے کیا ہوا چپ چاپ تین دن سے لیٹا ہوں نہ مشقت کر رہا ہوں۔ نہ اِدھر اُدھر بھاگ رہا ہوں اس خیال سے کہ مکمل آرام ملے تو جلد ٹھیک ہوں مگر کوئی افاقہ نہیں۔

سوچا تھا لیٹے لیٹے پاکستان انگلستان کا تیسرا ٹیسٹ میچ دیکھ لوں گا گو پاکستان والے جس بھدے پن سے پہلے دو میچ ہار چکے ہیں۔ اس کے بعد کوئی خاص تجسس نہ تھا۔ پر وہ بھی ممکن نہ ہوا کہ تین چار دن سے مسلسل بوندا باری ہو رہی ہے۔ (بالکل جاڑوں کا موسم ہے) اس لئے کوئی کھیل ممکن نہیں۔

آج دوپہر ایک گاڑی دیکھنے جا رہا ہوں۔ سنا ہے اچھی حالت میں نہیں ہے۔ مگر دام کچھ کم ہیں۔ اور گاڑی وہی ہے۔ جو میں لینا چاہتا ہوں۔ یعنی آوٹھی چلا کر دیکھنے سے تو مجھے کیا پتہ چلے گا۔ کچھ پیسے دے کر ماہرین کا مشورہ لوں گا۔ گاڑی ہو جائے تو کہیں کا رخ کروں۔ لنڈن کا چکر لگاؤں۔ کسی سے فلیٹ وغیرہ کی بات کروں۔ کرشن گولڈ نے یہ مشورہ دیا ہے۔ کہ چھوٹی نئی گاڑی لوں تا کہ گارنٹی بھی ملے اور دو ایک سال کسی جھنجھٹ کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ سب سے سستی گاڑی ڈھائی ہزار پونڈ کی ہے۔

میں نے وکیل کو ٹیلی فون کیا تھا۔ وہاں سے پتہ چلا کہ گڈو میاں یا کسی اور نے وہ ہزار پاونڈ ابھی تک جمع نہیں کرائے۔ ٹھیک ہے میں فکر مند نہیں ہوں شہزادہ کے ہاتھ بھیج دو۔ یا کسی اور کے۔ نصرت کو تمہیں لکھ چکنے کے بعد لکھوں گا۔ کچھ کہتے کو کسی سے بات کرتے کو جی نہیں چاہتا۔ تم سلیم شاہد کو دو حرف لکھ

بھیجو۔ اس نے مجھ سے گلہ کیا ہے۔ دیکھو بھارتی (تمہاری شاگرد) کو ناہید نے کارڈ بھیجا کینیا سے مگر مجھے نہیں یاد کیا۔

مجھے ہر وقت تمہاری مشکلوں کا احساس رہتا ہے۔ تمہارے کام، تمہارے مسئلے خدا کرے خوبی سے انجام پائیں۔ اب تم میں پہلے سے بہت اعتماد آ چکا ہے اس لئے مجھے گھبراہٹ تو نہیں پھر بھی اس بات پر الجھن ہوتی ہے۔ کہ سب کچھ تمہیں ہی مکمل کرنا ہے۔ یہاں پچھلے تین چار مہینوں میں مہنگائی اور بڑھ گئی ہے۔ اسی حساب سے گھر اور گھروں کے کرائے اور گھروں کے دام۔ تم یہاں ہوتیں تو مجھے یقین ہے گھر ورڈھونڈ لیتیں۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے شروع کروں۔ ایجنٹوں سے ٹیلی فون پہ بات ہوئی ہے وہ کہتے ہیں آپ ہر صبح ساڑھے نو بجے ہمارے دفتروں میں حاضری دیں تو ہم بتا سکیں گے۔ کہ ہمارے پاس آپ کو دکھانے کے لئے کچھ ہے یا نہیں۔ اس کے بعد آنا فضول ہے کیونکہ گاہک ہم سے پوچھ پاچھ کر نکل گئے ہوتے ہیں۔ لو صاحب

عاشق زار

ضیاء محی الدین

ہفتہ ۱۵ / جولائی

میری جان

میں تمہیں تنہائی کے ڈونگرے کیا بتاؤں۔ کس سمت نکلتے ہیں اور کس رُخ ڈھیل بیٹھتے ہیں؟ میں کئی دنوں سے بغیر کسی فیصلے کے کسی سڑک پر نکل جاتا ہوں۔ وہاں سے گلیوں، راہگذاروں، شاہراہوں سے ہوتا جدھر آنکھیں اٹھتی ہیں کبھی آہستہ کبھی تیز قدموں سے گزرتا ہوں۔ کہیں رکتا کبھی اختتم جاتا ہوں۔ گھروں کی چھتوں کو دیکھتا ہوں۔ کٹی ہوئی یا بپھری ہوئی باڑوں کو دیکھتا ہوں۔ گھاس کے چھوٹے قطعوں کو دیکھتا ہوں۔ انگریز چھوٹے سے گھاس کے ٹکڑے کو اپنی زندگی کی قطعیت سمجھتا ہے۔ اور اسی ڈھب سے اس کو مونڈتا ہے۔ پھر دو تین میل کا چکر ختم ہوتے پر اس چھوٹے، خاموش کردار سے عاری فلیٹ میں لوٹتا ہوں۔

آج کئی دنوں کے معمول سے تنگ آکر کھانا پکانے کا فیصلہ کیا۔ کئی دن پہلے منجمد مرغ کا ٹکڑا خریدا تھا۔ مجھے یاد بھی نہیں تھا۔ روزانہ تو صرف کسی قسم کا ٹین کا ڈبہ گرم کر کے کھاتا رہا ہوں، فرج کھولا برف نکالنے کو، تو نظر آیا۔ میں تمہیں کبھی یقین نہیں دلا پاؤں گا، کہ اس ٹکڑے کے دو حصے کرنے کے بعد جو میں نے اسے پکایا تو وہ کس قدر لذیذ پکا۔ جیسے سمجھو کھڑے مصالحے کا مرغ، ساتھ میں تھوڑی سی مسور کی دال پکائی اور وہ کچھ ایسی ٹھیک نکلی۔ کہ اتفاق سے اگر ذرا سا پانی کم ڈالا ہوتا۔ تو واللہ دالوں میں لاجواب نکلتی۔ میں نے دال کے بارے میں ترڑکا نہ لگانے کا جو عہد کر رکھا ہے۔ اس کا بھی پاس رکھا کرو۔ یہ کہ بجائے پیاز یا لہسن کو باریک کتر کے جب دال تقریباً پک چکے تو اس میں دھیرے سے تھوڑے تھوڑے وقفوں سے مسَل کر ان کا عرق نچوڑتے جاؤ۔۔۔۔

تنہائی کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے ریڈیو دوبارہ دریافت کیا۔ ٹیلیویژن
کی غیر موجودگی میں (اور ریڈیو کی اس حد تک موجودگی کہ آواز بہترین ریکارڈ کی
طرح آئے) میں نے پچھلا پورا ہفتہ کیسا کیسا روح آفرین پروگرام سُنا، اس
میں تو مجھے کبھی شک نہیں تھا کہ ریڈیو خاص طور پر ریڈیو تین اور چار جس کا نام
میری جوانی کے زمانے میں تھرڈ پروگرام ہوتا تھا۔ ہمیشہ ٹیلی ویژن سے بہت بہت
بہتر اور "سوچ آور" پروگرام پیش کرتے ہیں، پر یہ علم نہ تھا کہ وہ اس حد تک
سننے کے قابل بھی ہوتے ہیں۔ تم سے شاید "ماریا کیلاس" والے پروگرام کا ذکر
تو کیا تھا۔ پر موسیقی (اب مجھے تمہیں سنجیدگی سے مغربی کلاسیکی موسیقی نہ صرف سنوانا
ہے بلکہ سمجھانا ہے پر کھوانا ہے)۔ آخر، میں نے پچھلے دنوں "موزارٹ" "ہائیڈن"
"پرسیل" "ڈے بُوسی" "شون برگ" کے وہ ٹکڑے سنے جو زندگی بھر پہلے سننے
کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ریڈیو چار چونکہ مستقل کلاسیکی موسیقی اور دوسرے ذہین
موضوعات یا ضروری موضوعات پر ذہین گفتگو پیش کرتا ہے۔ اس لئے اس کی
سارا وقت موجودگی بہت ذہن پرور ہے آج دوپہر ظرافت، کہ، ظرافت
کیا چیز ہے کیوں ضروری ہے ہم مختلف قومیت کے لوگ کس چیز کو ہنسنے والی
بات سمجھتے ہیں اور کیوں، پر اس قدر اچھی بحث سنی کہ جی چاہتا ہے میرے
پاس ٹیپ کرنے والی مشین ہوتی اور اس مشین کو چلانا آتا تو میں اس کو ٹیپ کر
کے رکھ لیتا۔

مدن اور للتا کے ہاں گیا۔ یہ شفیق دوست ہمیشہ بہت آؤ بھگت کرتے
ہیں۔ ان کے گھر کے اس پار ایسی خوشنما سڑکیں ہیں جن پہ دھوپ میں نہائے
ہوئے چھوٹے چھوٹے مکان اس قدر بھلے معلوم ہوتے ہیں کہ جی چاہتا ہے بغیر
ہری مرچ چھڑکے کھا جاؤ۔ اس ملک میں دھوپ نکلتی ہے تو یہ ایسا خوبصورت

لگتا ہے جیسے تم کمرے سے شام کو شاداب نکلتی ہو۔

(تمنا کی جان کچھ کتابیں حاصل کرو، غالب کا دیوان نسخہ حمیدیہ اگر مل سکے تو، آتش کا دیوان اور سودا کا)

مجھے جلد سے جلد لکھو کہ اردن کا پروگرام کس حد تک پکا ہوا۔ میرا اپنا اندازہ یہ ہے کہ وہ اتنے ٹکٹوں کے متحمل نہ ہو سکیں گے۔ تمہارا ٹکٹ اور تین یا چار سازندوں کا ٹکٹ کر سکیں گے۔ لیکن کراچی سے عمان اور عمان سے کراچی لنڈن کا ٹکٹ وہ کیوں کریں گے؟ خیر جو فیصلہ ہوتا ہے مجھے لکھو، کیا اب کی بار حکومت کے لوگ یا ثقافت کے کرتا دھرتا بیچ میں ٹانگ نہ اڑائیں گے، اگر اس میں ذرا سی بھی گڑبڑ کا امکان ہے تو اپنے کو بنچامت کرو۔ ۱۸ر اگست یا ۱۹ر اگست تک پہنچنے کی کوشش کرو۔ یہاں پر میں یہ تاریخ اس لئے دے رہا ہوں۔ کہ تمہیں خاصا وقت مل جائے۔ ورنہ کل کی بجائے آج آؤ۔ تو اچھا ہے اٹھارہ میں بھی ابھی بہت دن ہیں کیسے بسر ہوں گے۔

مینوس کے سکول کا ابھی تک کچھ طے نہیں ہوا۔ مجھے اگلا پورا ہفتہ اس سلسلے میں کچھ کرنا پڑے گا۔ اسے ہر صورت میں ستمبر کی ٹرم میں داخلہ ملنا ہو گا۔ اگر نہ ملا تو سر ہی پھوڑنا پڑے گا۔ ورنہ پچھلا یا یہ پورا سال تو ضائع ہوا ہی اگلا سال بھی ضائع ہو جائے گا۔

معلوم نہیں صفحے کو کیا ہو جاتا ہے۔ چکنا ہو جاتا ہے کیونکہ انگوٹھے کا بوجھ پڑتا ہے۔ قلم چلتا نہیں۔ اکثر صفحے کے نچلے حصے پر پہنچ کر یہ ہوتا ہے۔ اوپر کا حصہ دیکھو اور پھر آخری سطروں پر نظر ڈالو۔

چاند کی روشنی، میرے دل کی ضو!

مجھے تمہارا خط نہیں چاہیئے۔ تمہارے تعریف بھرے فقرے نہیں چاہئیں صرف وہ لاشعوری جذبہ چاہیئے۔ جو بغیر تحریر اور تقریر کے میرے لئے باقی رہ جاتا ہے۔

زندگی کا پیار
ضیاء محی الدین

جانِ تمنا۔ ہفتہ ۲۲ جولائی، کل کا خط بھیجنے کے بعد مجھے یہ خیال رہا کہ
کہیں تم یہ سوچو کہ میں گھر کے بارے میں بہت مسرور ہوں یا مطمئن ہوں ایسا
نہیں کیونکہ وہ پہلی نظر میں خاصا گھٹیا اور مردنی پیدا کرنے والا جھونپڑا لگے گا۔
صرف یہ ہے کہ جب اس کی ہر طرح سے کاٹ تراش ہو جائے گی۔ تو اندر
سے (باہر سے نہیں) خاصا پھیلاؤ اور بچوں کی کتابوں میں رنگدار تصویروں کے
بیچ وہ تصویر جو کھل کے کھڑی ہو جاتی ہے۔ (جیسا لگ سکتا ہے۔
ایک حل تو یہ ہو سکتا ہے کہ میں چوالیس پینتالیس ہزار کا گھر لوں۔ زیادہ سے
زیادہ قرض جو مل سکتا ہے وہ پچیس ہزار ہے۔ (اس کی ادائیگی پچیس سال
تک ۵۵ فیصد) جس کا مطلب یہ ہے باقی کا بیس ہزار نقد رقم دستیاب
ہو وہ کہاں سے ہوتی دوسرے یہ کہ گھر کی جگہ فلیٹ دو تین کمروں والا جو
کسی سات آٹھ میل دُور کے علاقے میں بیس تک مل جاتا ہے۔ مگر پھر اس میں
اٹکے رہو، ایک کمرہ یا پھر دوسرا کمرہ۔
میں یہ جانتا ہوں کہ تمہیں مجھ پہ اس قدر اعتماد ہے کہ میرا یہ فیصلہ اتنا
غلط نہ سمجھو گی بس تشویش یہ ہے کہ دیکھ کے تمہارے چہرے پہ وہ چمک نہیں
آئے گی۔ جو میں دیکھنا چاہتا تھا۔ پھر یہی علاج ہے کہ اس کو اچھا سے
اچھا بنا کے جلد، بہت اچھی آفر ملنے پر دے دلا کے کہیں اور .....
پرسوں لندن جاؤں گا۔
یہاں برمنگھم میں اللہ، خوبصورت گھر بھی ہیں قیمتیں لنڈن کے مقابلے
میں کم ہیں لیکن — یا پورے کپڑے سمیٹ کر دوسرے پھر تیسرے ٹھکانے
پہ جا کے رکھوں گا۔ بہت یاد آتی ہو۔ بہت پیاری جان ہو۔
ضیاء محی الدین

جانِ تمنّا،

پھر وہی کاغذ کا ٹکڑا پھر وہی مکتوب ہے

اس طرح کے مصرعے تو بہت آسانی سے گھڑ لیتا ہوں۔ ہائے کیا غریب الوطنی ہے، آزاد کو حسن آرا کی یاد تو تھی پر خوش قسمت تھا کہ خوجی کا ساتھ نصیب تھا خیر صاحب ہم بھی کبھی نہ کبھی تو اسلام اور کفر کی جنگ میں سرخرو ہونگے۔ اس سے پہلے تو تمہارے ساتھ وصال نہ ہو پائے گا۔

ہجر کی گھڑیاں لاکھوں کروڑوں وصل کے لمحے پانچ کہ سات

ابن انشا کی اس نظم میں بڑے ٹھکے ٹھکائے مصرعے تھے۔ گھڑی کی سوئی ہند سے چومتے پل آئے بدل جائے۔ اور پھر ٹیپ کا مصرع، یارو کوئی اُپائے، یارو کوئی اُپائے! بدھ کی سہ پہر ہے۔ گاڑی آج دکان سے اٹھانا ضروری تھی۔ اس لئے لندن پہنچا۔ گاڑی لی اور فلیٹ میں کہ بھائیں بھائیں کر رہا ہے آ گیا۔ کھڑکیاں دروازے کھولے، یہ بڑے بڑے مکھے تن تن کرتے اندر آئے۔ تمہیں نہ پا کر ادھر اُدھر چیزوں سے ٹکرا کر باہر چلے گئے۔ ۲۲ تاریخ ہے اس کے بعد کے خطوط لکھ پاؤں گا۔ یہاں کا ٹیلی فون نمبر احتیاطاً کہیں درج کر لو ۲۱۲۸ ، ۳۴۰ چھ دن سے تمہارا کوئی خط نہیں ملا۔ جب سے تم کراچی لوٹی ہو پہلی بار تمہارے خطوں کے بغیر اتنی مدت گزری ہے اور شبِ انتظار بھی گزر رہی ہے اور بہار بھی گزر رہی ہے۔

اس گاڑی میں ذرا سی عیاشی کی ہے کہ اچھا والا ریڈیو اور کیسٹ اور سپیکرز قسم کی چیزیں لگوائی ہیں۔ پچھلی بار تم کہتی تھیں کیا ہے گانے وغیرہ نہیں سن سکتے، اب کچھ اچھی چیزیں ٹیپ کر کے لاؤں گی۔ تو سنتا کچھ تمہارے واحد حسین صاحب کی بندشیں کچھ پنڈت جی کا ستار، کسی نے بتایا تھا۔ برمنگھم میں کوئی بروان ہیں کہ پنڈت جی

کا شدھ کلیان کا ریکارڈ دیا ہے۔ اور شاید کیسٹ پہ ہے پوچھوں گا اِدھر اُدھر اگر وہ کیسٹ ملا تو ے لوں گا کلیانوں میں مجھے شدھ کلیان ہمیشہ سے پسند ہے۔ پھر تمہارے پاس تو اور بھی طرح طرح کے ٹیپ ہیں جب تک گھر میں یہ سامان پیدا نہیں ہوتا۔ گھر کے باہر ہی سہی۔

اچھے وہ ہے کہنے والا پر خود غلط اپنی رائے کو حرف آخر سمجھنے والے جمیل الدین عالی کا مصرع یوں زیادہ پسند ہے کہ مجھے یہ بحر بہت اچھی لگتی ہے اس وقت تو مصرع بھی بہت تڑپ پیدا کر رہا ہے۔ اور اب تو خاص وہی موسم بہار ہے آجا' یہ دوسرا مصرع ہے۔ پہلا جس کا میں ذکر کر رہا تھا :۔

بہت دنوں سے مجھے تیرا انتظار ہے آجا

آج تے مصرعاں آتے ہی گزارا کرو شاہ جی

پیار پیار،

ضیاء محی الدین

۲۲ اگست

دیکھو صاحب، یہ کیسا کاغذ ہے ؟ یہ وہ پیڈ ہے جس پر تین اگست سے میں اپنا تمام تحقیق کا کام کرتا رہا ہوں ۔ نوٹس بناتا ہوں ، پھر اسی کاغذ پہ وہ سب چیزیں اور اشارے درج کرتا ہوں ۔ جو بعد میں ٹائپ ہوتے ہیں ، پر یہ تو کتابت کا کاغذ ہے۔ واہ کاتب صاحب آپ نے تو کمال کر

دیا۔ ایسی مہین کہانی کون پڑھے گا؟ میری پھول سی کامنی کی آنکھیں خراب نہ ہو جائیں گی۔

میری پھول سی کامنی، آج ۲۲ر اگست ہے۔ اب تو دن گنتا ہوں۔ بریف کیس سرہانے کے قریب رکھا ہے دوسرا پلنگ جو اس ہوٹل کے کمرے میں موجود ہے اس پہ مختلف کاغذوں کے ڈھیر بنے رکھے ہیں۔ چابیاں، ڈائری اور رات کے اتارے ہوئے کپڑے بھی۔

اس خط کو ختم کرنے کے بعد اٹھوں گا۔ نہاؤں اور پھر وہی جینز پہن کر نکل جاؤں گا، دفتر دو قدم کے فاصلے پر ہے۔ وہاں چائے پیوں گا۔ کچھ کاغذات اٹھاؤں گا اور پھر کرائے کی موٹر میں بیٹھ کر آج کی پہلی ملاقات جس جگہ ہونے والی ہوگی۔ وہاں کا رخ کروں گا۔

خوبصورتی تم کہاں ہو؟ تمہیں ہر چیز میں ڈھونڈتا ہوں، کوبہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی۔

چاہت، راحت، ملاحت، فلاحت،

ضیاء محی الدین

بدھ ۲ر اگست،

جانِ تمنا

بارش بدستور، ٹپ ٹپ ٹپ، گیلاپن، سیلاپن، افسردگی، مُردنی، ایسے میں تمہارا تصور دھوپ کی چمکیلی کرن کی طرح میرے سارے جسم کو منور کرتا ہے۔

میں پچھلی تین راتوں سے ڈیوڈو کے ہاں سو رہا ہوں ۔ آج اُسے آ جانا چاہیئے تھا ۔ پھر خبر ملی ہے وہ لوگ کل آ رہے ہیں، اُن کا پلنگ آرام دہ ہے مگر کافی چھوٹا ہے ۔ دونوں اچھے بھاری بھر کم ہیں معلوم نہیں کس طرح اس پہ سوتے ہیں ۔ آج ایک سندیافتہ معمار اور ایک بلڈر کو لے کر اس گھر جا رہا ہوں جہاں ہم چار ایک مہینہ کے بعد (اگر سب کچھ ہو گیا تو) رہ سکیں گے ۔ یہ اس لیئے ضروری ہے کہ جب تک سندیافتہ معمار نقشے نہ تیار کرے ۔ اور وہ نقشے کاونسل کے کرتا دھرتا پاس نہ کریں ۔ اس پہ کام ہونے کی اجازت نہیں ملتی، ابھی تک تو موجودہ مالکان اس میں رہتے ہیں، لیکن اگر ابھی سے یہ مرحلہ داخل دفتر کر دیا جائے ۔ تو جب تک گھر خالی نہیں ہوتا ۔ (تقریباً ایک مہینہ) تب تک شاید یہ کارروائی کس حد تک تکمیل پا جائے ورنہ صرف کاغذی کارروائی پہ ایک ڈیڑھ مہینہ اُٹھ جاتا ہے ۔

اگر ہر چیز بغیر کسی روڑے کے انجام پا جائے تو اگلے مہینے سے اس پہ کام شروع ہو سکتا ہے ۔ جس کا مطلب ہے کہ ستمبر، اکتوبر، نومبر، تین ایک مہینے میں بنیادی توڑ پھوڑ اور پھر جوڑ توڑ اور پوچا پاچی شاید ختم ہو سکے، تو پھر ۔ بس وہی مسئلہ ہمارے بیڈروم کا ہو گا ۔ جس کے بارے میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں ۔ کہ وہ بعد چھوٹا رہ جائے گا ۔ مگر تمام حربے اور تمام ترکیبیں سوچ کر اور پیشہ ور لوگوں سے مشورہ کرنے کے بعد وہی ڈھاک کے تین پات کہ بیڈ روم چھوٹا، کافی چھوٹا ہو جائے گا ۔

تخمینہ جو تقریباً سات ہزار کا تھا ۔ اس میں ذرا فرق پڑا ہے، کچھ کم ہو گیا ہے ۔ آج پانچواں دن ہے، نہیں چھٹا، تمہارا کوئی خط نہیں آیا ۔ آج صبح تک تمہارے بغیر سینتیس راتیں گزار چکا ہوں اور کتنی باقی ہیں؟

پیار ضیاء محی الدین

سُن ری سہاگن، یہ ایک چھوٹا سا دفتر ہے جو تین ایک ہفتے کے لئے میرے قبضے میں ہے۔ اسے ٹی وی کا ہے، جب وہ شخص جس کا دفتر ہے واپس لوٹ آئے گا۔ اپنی چھٹیوں سے تو پھر کسی اور جگہ سے بیٹھ کر خط لکھوں گا۔ عذرا نے کوئی بیالیس لوگوں کی فہرست بنائی ہے۔ جس میں سے اب تک صرف تین سے ملاقات ہوئی اور تقریباً دو دن نکل گئے۔ رات پونے گیارہ بجے تک آج صبح بغیر چائے پیئے نکل جانا پڑا۔ ہوٹل سے (ہوٹل بہت آرام دہ ہے۔) دو جوان لڑکوں سے باتیں کرتے تین بج گئے۔ ابھی دفتر پہنچ کر کچھ نوٹس بنائے ہیں۔ جو ایک سیکرٹری کو ٹائپ کرنے کے لئے دیئے ہیں۔ اس بیچاری نے کافی کا پیالہ پلایا ہے۔ ساڑھے پانچ بجے (اس وقت سوا چار ہیں) ایک سردار جی سے اور سات بجے ایک میاں بیوی اور ۹-۲۰ بجے رات ایک جوان لڑکے سے ملاقاتیں طے ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ اگست کا پورا مہینہ گو اس میں مجھے تین چار بار لندن بھی جانا پڑے گا۔ ملاقاتوں کا سلسلہ ختم کر کے ان لوگوں کو جن میں ایک تو ضرور ہو جائیں گے، چن لوں جو بعد میں کیمرے پر بھی گفتگو کر سکیں۔ ہو سکتا ہے اتنے نہ ہوں۔ ستمبر کے وسط تک میرے ذہن میں کچھ نہ کچھ پکی بات تخلیق ہو جانی چاہیئے۔ لیکن اگست کے آخر تک ان کو وہ شیڈول دیا ہے جو فلمنگ سے متعلق ہو گا۔ یعنی کتنے دن، کتنی لوکیشنز۔ ہو سکتا ہے ستمبر کی بجائے اکتوبر میں ہم یہ کام کریں۔ کیونکہ ایسی چیز اصل میں کی میز پر ہی ابھرتی اور بنتی ہے۔ بہرحال، اس کام میں اس قدر محنت درکار ہے کہ اب مجھے یہ احساس ہونا شروع ہوا ہے۔ کس لئے یہ سر دردی یا دردِ سری مول لی۔ سلیم سے ابھی تک ملاقات نہیں ہوئی۔ سنا ہے اس کا بیٹا آج کل یہیں چھٹیاں منا رہا ہے۔

د قلم جس سے تمہیں خط لکھا کرتا ہوں ۔ بریف کیس میں ہے ۔ بریف کیس
اس وقت موجود نہیں، اس کے بغیر تمہید لکھنے میں، مزا نہیں آتا، ایسا لگتا ہے
اوپرا اوپرا خط لکھ رہا ہوں ۔ ہماری پائل ابھو گی کانسرٹا میں بہت اچھی ' باجی "
ہوگی ۔ مجھے اس بات سے بیحد اطمینان ہے ۔ اب ہمارا رویہ پکا ہوتا جارہا
ہے کہ جو تم بھی کرو بہت بہت اچھا کرو تو کرنے کا فائدہ ہے اور دوسرے
اپنے کام سے مطمئن نہیں ہونا چاہیئے ۔

ضیاء محی الدین
برمنگھم ۴ راگست

۱۱ راگست

کچھ تو کہو، بس یہ تسکین ہے کہ پیر یا منگل کو لندن
پہنچوں گا۔ تو تمہارے کئی خط رکھے ہوں گے۔ بس یہ سوچ کر کچھ قرار آتا ہے
رات کو سونے سے پہلے کتنی کتنی دیر تمہارا سوچتا رہتا ہوں۔ اکثر جسم پر
چیونٹے سے رینگنے لگتے ہیں اور پھر۔ اور پھر؟ یہاں آج اور کل کچھ ملاقاتیں
ہیں۔ کل پھر رات کے بارہ بج گئے لیکن کم از کم دو ایسے لوگ مل گئے ہیں
جو کام کے ہیں اور کچھ دلچسپ باتیں کر پائیں گے۔

مینوس کا نتیجہ کیمبرج سے آگیا ہے اس قدر بوجھ ہلکا ہوا ہے کہ کیا بتاؤں۔
وہ نتیجہ یقیناً اس قابل ہے کہ اس کا داخلہ ہونا ممکن ہو جائے گا۔ تعجب
ہے اور کیسے چغد ہیں سکول والے کہ ان کے سرٹیفکیٹ پر صاف لکھا ہے کہ وہ
فیل ہے اور کیمبرج یونیورسٹی کے امتحانوں کے بورڈ نے یہ بتایا ہے کہ اصل میں
اس کا نتیجہ کیا ہے۔ پربھو، نگبو، میرے گھٹتے بال کی گھٹا۔

ضیاء محی الدین

لندن ۸ر اگست،

جو تم اس کاغذ کو بہت غور سے دیکھو، یہ اس بارش کی
وجہ سے ہوا۔ جو اس قدر ہوئی تھی۔ جیب میں رکھا ہوا بھیگے خوفزدہ چوہے
کی طرح ہو گیا۔

آج لندن میں ہوں، کل پہنچا تھا۔ ڈیوڈ کے ہاں۔
تمہارا ایک (پورے ہفتے کے بعد) صرف ایک خط ملا۔ آج صبح کچھ نہیں، اور ڈیڈی
سے فون پر بھی معلوم کیا کہ آج کوئی خط نہیں ملا اسے جس کا مطلب ہے،
کل کچھ نہیں ملے گا مجھے۔ اور چونکہ کل دوپہر میں پھر برمنگھم جا رہا ہوں تو پھر
اگلی اتوار تک (آج منگل ہے) آنے کا ارادہ ہے۔ تمہاری طرف سے
اور تمہارے پیارے حروف دیکھنے کو نہیں ملیں گے۔

مینوس کو داخلہ مل گیا ہے۔ یہ کتنی اچھی خبر ہے، رات بڑی بے آرامی
ہوئی۔ سوچتا ہوں معلوم نہیں اور کتنے دن کتنی راتیں اس طرح بھٹکتے بھٹکتے گزریں
گی، ان بچاروں کے ہاں ڈیوڈ کی سٹڈی میں اس بستر پہ سویا جو عام طور پہ تہہ کئے
کونے میں کھڑا کر دیا جاتا ہے، بیچ میں اندھا کنواں، دائیں کروٹ لو تو اونچا
اور بائیں کروٹ تو اونچا۔ پھر عنقریب تم آجاؤ گی۔ تم میرا اتنا خیال رکھتی ہو۔
تھکے اعضاء کو کس محبت سے تھپکاتی ہو۔ میری جان جگر۔

ضیا محی الدین

جمعرات ۱۰ اگست، پھر وہی ہوٹل ہے۔ وہی شہر، کل رات سلیم شاہد کے ہاں کھانا کھایا نمک اس قدر ڈال دیتا ہے کہ پناہ، چاول البتہ غیر معمولی طور بہت نہیں بہت ہی عمدہ تھے۔ چپاتی کھائے معلوم نہیں کے برس ہوگئے ہیں، ہاں وہ نیروبی میں سستی والی سرائے میں کھائی تھی، پر وہ بھی نان تھا۔

رات خواب میں تم نے مجھ سے کہا ہے تم تیرنا بھول گئی ہو تم کسی تالاب میں گئی ہو مگر یونہی ہاتھ پیر مار کر واپس لوٹ آئی ہو۔ میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کہ تیرنا بچپن میں سیکھی ہوئی ہیپانوی زبان نہیں ہے کہ بڑے ہو کر انسان بھول جائے۔

میری راگ ودیا کوئی تاریخ تو لکھو یہاں پہنچنے کی کہ دل کو قرار آئے۔ داڑھی کو کل ایک حجام سے ترشوایا۔ اتنی بری نہیں لگ رہی، لوگ پوچھتے ہیں کب تک رکھو گے۔ میں کہتا ہوں تمہیں پسند ہے اس لئے جب تک تم نہ کہو گی۔ نہیں کٹواؤں گا۔

پتہ نہیں تم شلواروں میں پھر رہی ہو۔ یا ساڑھیوں میں، بال کیوں کھلے نہیں رکھتی۔ چکنے ہوتے ہیں تو جوڑے کی ضرورت پڑتی ہے ورنہ تو کھلے بال بہت سجتے ہیں۔

نصرت میاں نے کوئی خط نہیں لکھا، ان پر میرے دو خط واجب ہیں مینوس کا سکول ستمبر کے پہلے ہفتے میں شروع ہوتا ہے۔ اس وقت تک اگر تم نہ پہنچیں تو میں کہاں سے اس کے کھانے اس کے سکول لے جانے کے لئے سینڈوچ وغیرہ کا انتظام کروں گا۔ شروع شروع میں تو اسے سٹیشن تک روزانہ چھوڑنا بھی پڑے گا۔ اور لانا بھی، جب راستوں سے آشنا ہو جائے گا۔ تو پھر اکیلا سب کچھ کرے گا۔ پھر وہ تمام چیزیں کپڑوں کا دھلنا، یا مشین میں دھلوانا، استری کروانا۔

میرے پاس تو ابھی کوئی ٹیلی ویژن بھی نہیں ہے کہ وہ شام کو بیٹھ کر دیکھ لے۔ وقت اس قدر تیزی سے نکلتا جا رہا ہے۔ اگلے مہینے میرا کام برمنگھم میں کافی شدت پکڑ جائے گا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کیا نصرت واقعی اگست کے آخر میں آنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ سکول اس جگہ سے جہاں فلیٹ لیا ہے۔ زیادہ دور نہیں فقط پانچ ایک میل ہے اور وہ گھر جس میں ہم (ایک دن!) رہیں گے۔ اور بھی کم دور۔ گھر کا معاملہ ابھی ڈسٹرکٹ کے دفتروں میں پھنسا ہوا ہے۔ شاید اگلے مہینے تک اس کو ٹھیک کروانے کی اجازت مل جائے۔ میرا زندہ زندہ پیار لو۔

ضیاء محی الدین

۱۸ر اگست، جونم، عادت سے مجبور ہوں۔ ورنہ کیا ضرورت تھی۔ پانچ چھ گھنٹے اس فلیٹ کی ہر چیز کو مانجتا پھروں، ہر چیز سے مطلب باورچی خانہ "ہیلم" کے حساب سے صاف تھا اور میرے حساب، چیکیٹ، گو کل سویرے مجھے برمنگھم لوٹنا ہے اور شاید ہفتہ بھر واپس نہ آؤں، معلوم نہیں کتنی خالی بوتلوں کو انگلیوں سے بھینچ بھینچ کر صاف کیا ہے کہ تم آؤ گی تو ان میں مصالحے اور دالیں رکھو گی۔ بس اسی خیال سے۔

رات ڈیوڈ کے باہر سو یا گیا۔ اپنی اس عادت کو کوستا رہا۔ جب نیند نہیں آتی تو کیوں نہیں آتی۔ تین بجے پھر چار، پھر پانچ، پرندے بولنے لگے۔ پھر موٹروں اور بسوں کا شور ہوا۔ خدا جانے کیا ہوا، آنکھیں جل رہی تھیں۔ یہ کروٹ بدل بدل کر میری روح عذاب میں تھی۔

بھول نہ جاؤں۔ یاد سے اپنا لائسنس، انٹرنیشنل بنوا لانا، کچھ فیس لیتے ہیں مشکل نہیں ہوتا۔

کیا اچھا ہو کہ مینوس اور تم تقریباً ایک ساتھ ہی آجاؤ۔ (آج بہت بہت خوب صورت دن تھا، چمکیلی دھوپ اور اچھی والی گرمی، میں نے تمام دروازے کھول دیئے۔ باغ میں بھیں بھیں کرتے بھونرے ادھر ادھر منڈلا رہے تھے، پتہ نہیں تمہارے آنے تک اس قسم کا دن نصیب ہوگا یا نہیں اس سال میں یہ پہلا ایسا دن تھا)

جونم بس پلنگ میں گزارہ کرنا ہوگا۔ وہ اتنا کم چوڑا ہے کہ میں کیا بتاؤں ساڑھے تین اور چار فٹ کے درمیان مجھے یہ خیال آیا تھا۔ ابھی ابھی جب میں اس میں آیا کہ گدا اٹھا کر زمین پہ بچھا لیں گے۔ پر یہ کمرہ اتنا چھوٹا ہے۔ اس کی جگہ بھی نہیں، سلیم بیچارہ اکیلا آدمی ہے مجھے یہ خیال ہی نہیں آیا۔ اس سے پوچھتا

میں اسی خوش فہمی میں رہا۔ ایک "ڈبل بیڈ" تو فلیٹ میں ہو گا۔

میں تمہیں اتنا چاہتا ہوں کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اکثر سوچتا ہوں تمہیں کبھی اس کا اندازہ ہو گا؟ پرا چھپا ہے نہ ہو ایسی چیز کا تول کا حساب کہاں ہوتا ہے اب تم آ و گی کہیں اس بات سے گبھرا نہ جاؤ ۔ کہ گھر میں ایک جوان لڑکا بھی تقریباً سارا وقت موجود رہے گا۔ کاش میں اب کی بار اپنے اس فرض سے پہلے سے بہتر سبکدوش ہو سکوں۔ تم مدد کرو گی۔ تو شاید ممکن ہو۔ پارو سکھی، تمہارے وزن کا کیا عالم ہے۔

ضیاء محی الدین

برمنگھم - ۲۱ راگست،

صبح سویرے اٹھ بیٹھا ہوں۔ تمہاری خوشبو ڈھونڈتا ہوں تکیوں میں سے
سے نہیں آتی۔ پھر کہاں، کس چیز میں تلاش کروں۔؟ کھڑکی کے باہر ایک بڑا گھڑیال
ہے۔ جس کو کتنی دیر سے دیکھ رہا ہوں۔ کبھی سوا آٹھ سے ساڑھے آٹھ ہوتے
ہیں کبھی پونے نو،

وہ پروین شاکر کے نام جو خط لکھا تھا وہ اصل میں تمہارے لئے تھا اس میں
جو اچھے شعر نکالے تھے تمہارے کانوں کے لئے جو دو ایک طنزیہ اشارے تھے وہ
بھی تمہاری مسکراہٹ کے لئے تمہیں اس بات کی کتنی داد دوں۔ کہ چاند والی غزل
میں تم نے واقعی چھان کر مجھے شعر بھیجے تھے باقی کے اشعار کمزور ہیں۔ غور کے قابل
نہیں تم کہتی ہو میں ایک صفحے کا خط نہ لکھوں میری چمپا۔ میری کلی۔ کتنے صفحوں کا
لکھوں۔؟ اب تو یہ خیال بھی آرہا ہے کہ دو چار دن بعد یہ سلسلہ بند کرنا پڑے گا۔ سنا
ہے (اور تجربہ بھی یہی رہا ہے۔) کہ یہاں سے پہنچنے میں آٹھ دس دن لگتے ہیں پھر
اگر تمہیں ستمبر کی سات آٹھ تک بھی یہاں پہنچنا ہے تو خط تمہیں نہ ملیں گے۔

مینوس کا سکول ۷ ارستمبر سے شروع ہوتا ہے اس لئے وہ تیرہ چودہ تک
بھی پہنچ جائے تو غنیمت ہے۔ پھر تم سے پوچھتا ہوں کہ میں اور وہ گھر میں (اگر
میں تین چار دن کی چھٹی بھی لوں تو) کیسے کام چلائیں گے۔ خیر یہ بھی اک ڈھونگ
ہے کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ تم مطمئن رہو۔

مجھے کچھ پتہ نہیں چلا (تم نے ذکر ہی نہیں کیا) کہ کام کس مرحلے پر ہیں۔ چیزیں
چونکہ گھر کے معاملہ میں کچھ دیری ہو رہی ہے۔ یعنی قانونی اور کاغذی کارروائی
سے پہلے کہہ رہے تھے۔ روپیہ مل جائے گا۔ (بہن پر اب کچھ روڑا ہے۔ پر گھبرانے
کی بات نہیں ایک آدھ مہینہ میں کر دیں گے۔ مشکل یہی ہے کہ جب تک یہ کام

مکمل نہیں ہوتا مزدور وغیرہ اپنا کام شروع نہیں کر سکتے۔

اب بھاگوں، بھاگوں، بھاگوں

سارا وقت یہی ہوتا رہتا ہے۔ ابھی تک ۵۰ سے اوپر لوگوں سے

ملاقات کر پایا ہوں۔

کم ہیں اور چاہیئں

حوزنم

ضیاء محی الدین

۲۶ راگست
، گاڑی تیز چل رہی ہے۔ معلوم نہیں کیسے ٹیڑھے میڑھے حروف بنیں گے۔ اور پتہ نہیں، یہ خط تمہیں ملے گا یا نہیں، آج ہفتہ ہے اگست کی ۲۶ تاریخ ہے، کل اتوار اور پرسوں پیر کو اس ملک میں بنک کی تعطیل پورا ملک بند" اگر ڈاک میں منگل تک پڑا رہا تو تمہارے روانہ ہوتے سے پہلے کہاں ملے گا۔ جب تک یہ گاڑی لندن پہنچے گی ایک ڈیڑھ بج چکا ہوگا دوپہر کا۔ میں سویرے سویرے ہی اٹھ کر چلا آیا۔

سلیم شاہد نے بتایا اس نے تمہیں کوئی خط لکھا ہے۔ ہاں یاد آیا۔ کہ کل صبح اتوار کو سلیم شاہد وہ پروگرام چلا رہا ہے جو اس نے میرے تمہارے ساتھ تین برس ہوئے ریکارڈ کیا تھا۔ کیا زمانہ تھا۔ میں مانتا ہی نہیں۔ اس زمانے میں ہم تم ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ تم مانو نہ مانو ہمارا تمہارا بندھن تو مارچ میں شروع ہوا۔ اور ۸ ارمئی سے ہم نے پہلی بار ایک دوسرے کو دیکھنا شروع کیا۔ ... میں کہاں دیکھ پاؤں گا۔ یہ پروگرام ٹیلی ویژن میرے پاس نہیں، ایک ہی صورت ہے۔ کہ صبح اٹھ کے ڈوڈو کے پاس جاؤں۔ وہاں جاکر دیکھوں آدھ گھنٹے کا پروگرام ہے کہہ رہا تھا سلیم کہ بہت اچھا ہے۔ پر ہمیں معلوم ہے۔ اس نے آج تک کوئی چیز کب کہی ہے جو بہت اچھی نہ ہو -؟ یوپی کا فون آیا تھا معلوم ہوا وہ یہاں آگیا ہے۔ خدا کرے اس کا کام یہاں چل جائے۔ ثریا کو فوراً یہ پیغام دے دو کہ مجھے مسعود بیٹے کی طرف سے کوئی کاغذات نہیں ملے ——— میں قربان جاؤں۔ آپ کی اس ادا پر کہ شہزادہ کو خط دیتی ہیں کہ وہ پوسٹ کرے اس پر لکھتی ہیں کہ خدا کے لئے یہ فارم دستخط کر کے بھیج دیں اور خط میں کوئی فارم نہ کچھ، کیسے فارم ! کہ تسے فارم ؟

ایک فارم پر تو دستخط کروا کے ڈیوڈ سے گواہ کے دستخط بھی کروائے)

تمہیں بھیج چکا ہوں۔ اب یہ کونسے کاغذات تھے۔

فون نمبر لکھ چکا ہوں، پتہ اس خط کی پشت پر دیکھ لو، بوبی نے یہ بھی بتایا کہ ۵ اراگست سے تم لاہور میں ہو۔ پھر تمہیں میرے خطوط کیسے ملیں گے ایسے بھی نہیں ہوتے کہ ٹیلی فون پر پڑھ کر کوئی سنادے، سنادے سنادے سنادے کرشنا تو بنسری کی تان، سنادے کرشنا آ آ آ سنا

پیار پیار
ضیاء محی الدین

عالم رنگ بو، کل خط لکھنے سے ہچکچاتا رہا کہ ۲۸ تاریخ کا خط تمہیں کہاں ملے گا۔ جب تک تم لندن کا رخ کر چکی ہوگی۔ ۵ یا ۶ ستمبر کو اگر ملا تو مجھے اکثر تمہارا خط سترہ اٹھارہ دن بعد ملا ہے۔ آج رہا نہیں گیا، جو تم اب تو خیر تمہارے پہنچنے میں زیادہ دن نہیں ہیں دو ہفتے بہت سے تھے، بہت، اگر میں تمہیں دکھاؤں گا کہ تمہارے بیشتر خطوں میں یہ فقرہ پایا کہ آپ کا کوئی خط نہیں، آج کل لکھ نہیں رہے، کیوں نہیں لکھ رہے؟ دل بلبلا اٹھتا ہے کیونکہ ...... کبھی ڈاک والوں کو کوسنا شروع کرتا ہوں۔ کبھی ستم ظریفی پہ غور کرتا ہوں۔ پرسوں اتوار کو میاں سلیم شاہد کے ہاں یعنی اس کے ہاں "نئے جیون" میں وہ پروگرام چلا تھا جو اس نے تین برس پہلے ریکارڈ کیا تھا۔ یہاں پہ کچھ لوگوں نے مجھ سے براہ راست ابھی تک کسی نے بات نہیں کی۔ یہ کہا کہ فلاں نے یہ کہا اور فلاں نے یہ کہا کہ اس شخص کی بیوی بہت خوب صورت ہے۔ گھامڑ کہیں کے۔ چغد کہیں کے بہت خوب صورت کیا مطلب، اس سے خوب صورت کوئی شے، کوئی لڑکی، کوئی نہیں۔ دکھائیں تو، تو ہی تو ہے۔

ضیاء محی الدین

۲۹ راگست

چمپا ۳۰ اگست

اب برمنگھم میں تحقیق کا کام تقریباً ختم ہونے کو ہے اگلا ہفتہ اور اس کے بعد ملنے ملانے کا سلسلہ تمام ہو چکا ہو گا۔ پھر شوٹنگ شیڈول بناؤں گا۔ بیسوں کیا تقریباً پچاسوں کے حساب سے لوگوں سے مل چکا ہوں، زیادہ تر مزدور طبقہ لوگ، بات بھی اس طبقہ کے لوگوں میں سے ہو کر بنے گی۔ عذرا بیچاری نے بہت مدد کی۔ بیچاری خواہ مخواہ لکھ دیا۔ خیر اس کی مدد اور بھاگ دوڑ کے بغیر اتنے خاندانوں، لڑکوں لڑکیوں خالاؤں، چچیوں اور دان سب کا ان داتا، صاحب خانہ (کیا کیا رویے، کیا کیا فلسفے دیکھنے اور سننے میں آئے۔) سے میں کہاں مل سکتا تھا۔

سب سے (آنکھوں کو خیرہ کرنے والی) بڑی بات جوان لوگوں کا "خیالات" بٹالہ میں ایک شخص تھا جو ہمیشہ یہی کہتا تھا۔ تمہاڑا خیالات کی کہندا "انہی کی باتوں سے کچھ امید نظر آئے گی۔ رات تمہارے جوتوں کا سوچ رہا تھا۔ اتنے جوتے کیسے لاؤں۔ ؟ خیر ابھی تو کم ہیں۔ ابھی تو مجھے شفقی اور قرمزی اور گلابی جوتا لینا ہے تب اس شعر پہ پہنچا۔

پازیب سے پیار تھا سو میرے
پاؤں میں سدا بھنور ہی ٹھہرے

کچھ حسب حال لگا؟ پھر اس کے بعد (درومان پرور)

جانے والوں کی تصویر کب ہٹ سکی تھی مگر
درد بھی جب تھما، آنکھ بھی جب ذرا لگ گئی

یہ بحر بھی بہت مزے کی ہے جیسے نو ماترے کی تال
موسم اب پھر خنکی کی طرف مائل ہوتا جا رہا ہے۔ جس طرح شاہین پہلے کی نسبت

چھوٹی ہونی شروع ہو گئی ہیں ۔ ۳۰ تاریخ بھی کون سی دور ہے آج ۲۰ تاریخ ہے
عذرا اور گڈو اور چھوٹو بھی آج یہاں پہنچ جائیں گے ۔ کل پرسوں لندن جاؤں
گا ۔ تو فون پر ان سے بات کروں گا ۔ یا چلا جاؤں گا ۔ کچھ تمہارا حال پتہ چلے
گا ۔ کچھ تمہاری باتیں کریں گے ۔ میں نے ابھی تک سامان ایک جگہ اکھٹا نہیں
کیا ۔ بدر کے ہاں سے سامان اٹھانا ہے ۔ فرینک کے ہاں سے اور شفیع کے
گھر سے، کوشش کروں گا شاید تمہارے آنے سے پہلے سب کچھ جمع کر لوں پھر
فلیٹ میں جگہ بہت کم ہے کہاں رکھی جائیں گی ۔ اتنی چیزیں ۔ شوبھا او شا،

ضیاء محی الدین

منگل ۲۵ جولائی

میری شبنمی بچی

میں آج کرائٹین سے ملا جو میرا وکیل ہے اس نے یہ مشورہ دیا ہے کہ تم اپنے ساتھ شادی کا سرٹیفکیٹ لاؤ اصل بھی اور اس کا ساتھ اس کا انگریزی ترجمہ جس پر کسی وکیل یا مجسٹریٹ یا کی تصدیق شدہ مہر اور دستخط ہوں "توڑی" سب سے بہتر ہے نصرت کو معلوم ہو گا اور چونکہ وہی یہ کام کرائے شاید یا شوکت تو پھر ان کو سمجھا دو "اب ہمارے ہاں شادی کا سرٹیفکیٹ کسی دفتر میں تو رکھا نہیں ہوتا۔ اس لیئے یا تو اس مولوی کو ڈھونڈ لاؤ۔ جس کے پاس شاید نکاح نامہ کی کاپی ہو ورنہ پھر نئے سرے اس تاریخ کا نکاح نامہ کی کاپی نبواؤ پھر ایک پیراگراف انگریزی میں ترجمہ نصرت سے کہو کروائیں' یہ اس لیئے بہت ضروری ہے کرائٹین کا خیال ہے کہ جب تک تمہاری قومیت پاکستانی ہے وہ اس کاغذ کی بنا پر تمہارے پاسپورٹ پہ اس قسم کی مہر لگوانے میں کامیاب ہو جائے۔ کہ ہمیں کہیں سفر کرنا ہو تو دوبارہ ویزا لینے کی ضرورت نہ پڑے' یہ ضروری بات ہے اس لیئے آج ہی سے اس کام کو کروانا شروع کر دو۔ اول تو اگر ہمارا نکاح نامہ مل جائے (جا کہاں سکتا ہے ؟) تو بس لفظ ترجمہ اور تصدیق اور اگر نہیں ملے تو پھر ..... بھاگ دوڑ .....

آج دھوپ نکلی ہے بالکل بخل سے نہیں، موسم میں ہمارے ہاں کی بہار کا عنصر ہے، تم ہوتیں تو تمہیں کسی باغ میں لے جاتا تم بار بار ہاتھ پھیرواکے بالوں کو کبھی ڈھیلا کبھی کس کے باندھتی رہتیں۔ میرے پیار کی لاج۔

تمہارا ضیاء محی الدین

منگل، غزالاں، کچھ سفر کچھ نقاہت کچھ اُداسی، کچھ افسردگی وہی حال
ہوا لندن پہنچتے پہنچتے جو پچھلی جنوری میں تھا، یعنی گلا مرنے والا اور ناک
سُرخ اور سوجھی ہوئی اور بند، سلیم شاہد کے ہاں سے کوئی جواب نہیں اور
مرتا مرتا رات کی گاڑی سے برمنگھم پہنچا، اور وہاں ٹیکسی لے کے، بھلا ہو
ان لوگوں نے آؤ بھگت کی، کھانا کھلایا، ان کی بیٹھک میں سونے کا انتظام
ہوا، ابھی آدھ گھنٹہ ہوا اٹھا ہوں، طبیعت بہت مضمحل ہے، ہلکا ہلکا بخار
محسوس ہو رہا ہے۔

تم تو چلی گئیں۔ معلوم ہے میرا جہاز کتے بجے چلا، پونے دو بجے دوپہر
اسی لئے تو لندن پہنچتے رات ہو چکی تھی۔

خدا کرے (خدا نے کیا ہو!) کہ تم خیریت سے پہنچ گئی ہو، ڈھیروں
پیار، سُونا سُونا

ضیاء محی الدین

بستر میں لیٹا ہوں، باہر جاڑا اور بارش

رقصِ بُتاں سیمیں بدن خندہ دہن،
جُونی، میں اس وقت ہمیشہ کی طرح تمہاری سوچ میں مگن، اکیلا، سدا اکیلا،
کبھی یہ سوچ کر گھنٹوں سے قلم نہیں ہاتھ میں لیا ہے میرے لئے خط لکھنا اپنی
سے ہاتھ دھونے کے مترادف تو ہے نہیں آج (اور آج ہی کیا ہر روز ہی) جس
شدت سے تمہاری یاد مجھے پاگل کئے دے رہی ہے، اس کو تم تک کن لفظوں میں بیان
کروں،

تم، صرف تم، (تو ہی تو ہے)

صرف تم،

کل کیا کروں گا، اور پرسوں، اور پھر
اس کے بعد کل اور اس کل کا کل اور

اس کا پرسوں ؟

تمہارے صرف ایک خط سے جس پہ تاریخ ۱۰ر جولائی کی لکھی ہے یہ پتہ
چلا ہے کہ تم ستمبر کے پہلے ہفتے تک شاید یہاں پہنچ جاؤ۔ میرے خیال میں اب
تک تمہیں وہ تمام خط مل چکے ہوں گے۔ جس میں ۱۸ر اگست سے فلیٹ لینے کے
بارے میں تمام تفصیلات لکھ چکا ہوں۔ پھر دیر ہی کیوں۔؟ اردن کے بارے
میں بھی سب کچھ لکھا ہے اگر مجھے اب بھی کچھ دنوں میں پتہ چلے تو شاید اپنے کام
کے کچھ دنوں کی تعطیل کا انتظام کر سکوں۔ مگر ۳۰، ۳۱ تک اگر کوئی اطلاع نہ آئی
تو پھر ذرا مشکل رہے گی۔ آج ۲۷ر جولائی ہے۔ کل پرسوں تک شاید تمہارے کسی خط
میں کچھ پتہ چلے، اگر اردن کا پروگرام نہیں پکا ہوتا تو ۲۰، ۲۱ ر اگست تک چل آؤ۔
میں اب زبان دے چکا ہوں۔ ورنہ ۵۰ پاؤنڈ ہفتہ کا فلیٹ تمہاری عدم موجودگی
میں میرے لئے ایک طرح سے بیکار ہے کیوں کہ مجھے برمنگھم آنا جانا ہوگا۔ میں وہیں

کہیں رہ جاتا۔ شفیع کے فلیٹ سے میں پرسوں کوچ کروں گا۔ سامان ڈیوڈ کے ہاں
رکھوں گا۔ کچھ دن وہاں رہوں گا۔ کچھ برمنگھم میں جب تک ۱۸ اگست کا دن نہیں
ابھرتا۔ ڈیوڈ اور پولا کے لئے کچھ سوچ کر ضرور لے آتا، پولا کے لیے کوئی چاندی
نما کوئی اصلی نہیں۔ اصلی تمام زیور لے آتا، مالائیں وغیرہ تو وہ پہنتی نہیں، ڈیوڈ
کے لئے وُہی نیوی جیسی واسکٹ بڑے سائز کی، ان کا بہت احسان ہر طرح سے
ہمارے اوپر ہے۔ ڈاک میں گڑبڑ ہی ہوئی ہوگی۔ ورنہ شاید ہی کوئی ایسا دن ہو
کہ تمہیں نہ لکھوں۔

ضیاء محی الدین

منگل،

میری روپاوتی، کل رات صابر کے ہاں کھانا تھا۔ اچھا کھانا تھا۔ پر روٹی کے بجز، چاول اچھے پکے تھے۔ مگر وہ سرور کہاں جو ٹھنڈی روٹی کو دوبارہ گرم کرنے کے بعد کھانے میں ہوتا ہے۔ تازہ کی بات ہی نہیں کرنا چاہتا۔ اچھا خاصا گھر ہے، نیا۔ پر رکھا ویسے ہی ہے جیسے مذاق سے عاری کھاتے پیتے لوگ رکھتے ہیں اس نے چار برس ہوئے ۱۵ ہزار کا خریدا تھا۔ اب اس کے ساتھ والا گھر (دو بیڈروم بابر کا گھر چار بیڈروم والا ہے۔) کتنے کو رکھا ہے‘ ۲۷ ہزار پاؤنڈ کا، برمنگھم میں

کل پورا دن تمام اخبار لا کے لندن کے، گھروں کے اشتہاروں کو دیکھتا رہا کہ اگر کوئی واجب داموں والا اشتہار ہو تو فون پہ کم از کم اتنا پوچھوں کہ خالی ہے یا نہیں، حیرت ہو گئی۔ کہ اشتہاروں میں صرف دو فلیٹ ایسے تھے۔ تین کمروں کے جو ۲۴ یا ½۲۴ ہزار پاؤنڈ کے ورنہ ۴۰ ہزار کے اوپر۔ میری سمجھ میں تو آتا نہیں کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ کروٹ کا تو میں پھر بھی اندازہ کر لوں، مجھے تو بیٹھتا ہی نظر نہیں آ رہا۔

بڑی نے فون پہ بتایا ہے کہ ابھی تک کوئی خط اس کے پاس نہیں پہنچا۔ یا خدا یہ کیا ماجرا ہے۔

رات عجیب خواب دیکھا، پیغام ملا کہ فیض[۱] صاحب جن کی حالت بیحد نازک ہے۔ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں کسی نرسنگ ہوم میں ہیں ڈھونڈتا ڈھونڈتا وہاں پہنچتا ہوں۔ پتہ چلتا ہے کہ پانچویں منزل پہ کمرہ ہے پانچویں منزل پہ کمرے میں اندر جانے کی اجازت نہیں ملتی۔ میں بہت رعب جھاڑ کے اس عورت کو نظر انداز

---

۱۔ فیض احمد فیض

کر کے جو مجھے اندر جانے سے روک رہی ہے، ان کے کمرے کا دروازہ کھول
کر اندر جاتا ہوں فیض صاحب کوتے میں پلنگ پر لیٹے ہیں

میں فوراً باہر نکلتا ہوں تو کمرے میں سے ایک نوجوان باہر نکلتا ہے شکل
جیسے شعیب ہاشمی کا چھوٹا بھائی ہو۔ سترہ اٹھارہ برس کا، اور مجھ سے کہتا ہے
وہ فیض صاحب کو بہت فکر تھی۔ آپ کو چوتھا مل گیا۔؟ "چوتھا؟" میں پوچھتا
ہوں۔ وہ آپ کو برج کے لئے کسی چوتھے کی ضرورت تھی۔ وہ سمجھاتا ہے
لو صاحب، خواب میں بھی ہنسا، اب بھی ہنسی آرہی ہے۔ تمہاری طرف سے کوئی
خبر نہیں۔ پیار

ضیاء محی الدین

جمعہ ۲۸، میری آنکھوں کی روشنی، خطوں کا کچھ مت پوچھو، تین دن پہلے تمہارا ۱۶ ر جولائی کا لکھا خط ملا۔ آج پندرہ کا، مجھے تعجب نہیں ہے تمہیں تین چار دن متواتر میرے خط نہیں ملتے۔۔۔ کئی خطوں میں "سر میں تیل لگا ہوا ہے" کا فقرہ پایا اتنا تیل مت چپڑو میری چمپا

کل پرسوں دو دن، پھر ذہنی کوفت کے گزرے کہ وہ سرٹیفیکیٹ جو نصرت نے مینوس کے سکول سے بھیجا تھا اور جو میں نے اس کے خطوں کے بعد کہ اس نے ہر طرح سے یقین دلایا تھا کہ مینوس اپنے امتحان میں پاس ہو گیا ہے، ان تمام سکولوں سے ہوتا ہوا جہاں جہاں اس کے داخلے کی کوشش ہو رہی تھی۔ واپس آ گیا کیونکہ اس کے مطابق مینوس صرف تین مضمونوں میں پاس ہوا۔ اور داخلہ کی شرط یہ ہے کہ چھ مضامین میں پاس نمبر ہوں۔ مجھے ندامت بھی ہوئی۔ جھنجلاہٹ بھی اور شدید مایوسی کا احساس ہوا کہ سب نے لکھا ہے کہ اسے وہیں کراچی میں دوبارہ اولیول کا امتحان دلوایا جائے۔ مگر چونکہ ۱۷ سال کی عمر اس کی ہو جائے گی۔ اگر وہ پاس بالفرض ہو جاتا ہے تو ہم اسے کسی سکول میں لینے سے معذور ہوں گے۔ کہ یہاں A لیول کے داخلے سے پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ لڑکے لڑکی کی عمر ساڑھے سترہ برس تو نہیں۔۔۔۔ میں اتنا زیادہ اس بات سے بیزار ہوا ہوں کہ بیان نہیں، ایک طرح سے مینوس کی پوری زندگی کا سوال تھا۔ کہ وہ کس چیز کا اہل ہو گا۔ اور اس کام میں کس حد تک اہل ہوں گا۔

لاجونتی۔ کانتی سلونی، کل اس جگہ سے روانگی ہے بکھری ہوئی چیزوں کو، کاغذوں لفافوں کو جو ایک انبار کی طرح کونے کونے میں پھیلے ہیں بکس۔ جو زمین پہ پہلے دن سے دونوں زانوؤں پہ کھلا ہے۔ اور جس میں سے یہ

چیزیں نکالنے کی توفیق نہیں ہوئی ۔ پلاسٹک کے بے شمار تھیلوں کو دیکھتا ہوں تو یہ ساری مشق (ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کی) اتنی بے کار اور بے معنی نظر آتی ہے ۔ پوری زندگی محض چیزیں سمیٹنے اور پھر سے جمانے میں صرف ہوتی نظر آتی ہے ۔ کیوں ؟ اور پھر قرینے سے جمانے کی اتنی شدید نفسیاتی ضرورت کیوں ہے ؟ زندگی میری خود اس قدر سمٹ سمٹ کر محدود سی (مکانیت اور لامکانیت دونوں معنوں میں) ہوتی جا رہی ہے ہو گئی ہے ۔ ایک دن آئے گا کہ یہ تمام کوشش نہ صرف لاحاصل بلکہ بیوقوفانہ لگے گی ۔ پھر کوئی وقت نہیں ہوگا ایک لمحہ پھیل کر ابدی وقت نظر آئے گا ۔ مگر یہ احساس کہ وہ لمحہ ہی تو ہے فوراً اس لمحے کو اور مختصر بنا دے گا ۔ اور دوسرے درجے کے ستار بجانے والے کی جلدی میں لی ہوئی تنہائی (جو اس کے نزدیک اہم کوشش ہوتی ہے) کی طرح اختتام ۔ خدا کرے اس وقت مزاح کی حس قائم رہے ۔

تمہارا عاشق زار
ضیاء محی الدین

تمہاری یاد سے شیریں ہے

ماں کی محبت بیٹے کے لئے بڑی پراسرار ہوتی ہے۔ اور خاص طور سے ایسی حالت میں جب ایک ماں کے تین بیٹوں میں سے صرف ایک ہی بچا ہو۔ ضیاء محی الدین نے گریجویشن تک اپنی والدہ کے پاس وقت گزارا۔ لیکن ۱۹۵۲ - ۵۳ء کے بعد جب سے انہوں نے فن کے دشت میں اپنے آپ کو چھوڑ دیا۔ تو پھر جیسے وہ اپنے گھر سے اپنے رشتہ داروں سے اپنے چاہنے والوں سے دور ہوتے گئے۔ مگر یہ دوری، لاکھوں کروڑوں انسانوں کے ساتھ قربت کا سبب ٹھہری۔ ایک مرتبہ ضیاء محی الدین نے اپنی گفتگو میں کہا تھا "ہم روزانہ اپنی زندگی میں ہزاروں مفاہمتیں کرتے ہیں کہ ان کے بغیر زندگی گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مگر اس مفاہمت کرنے کی بھی ایک حد ایک نکتہ زوال ہے۔" لیکن ماں کی ذات کے متعلق میرا دعویٰ ہے کہ وہ واحد ایسی ہستی ہوتی ہے جو بغیر کسی طلب کے محبت کئے جاتی ہے اسے مفاہمت کے ایسے اصول جن میں "کچھ لو، کچھ دو" کا فلسفہ ہوتا ہے اس سے قطعی کوئی غرض نہیں ہوتی۔

میں نے ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۷ء تک ضیاء محی الدین کی والدہ (اماں جی) کو ضیاء محی الدین کے گھر دیکھا ان کے لئے ایک مخصوص کمرہ تھا، جو ٹی وی لاؤنج کے ساتھ ملحق تھا۔ اس میں سنگھار میز ٹی وی اور ائرکنڈیشنڈ ہر چیز بڑے سلیقہ اور قرینے سے رکھی تھی ضعیف العمری میں بھی ان میں ایک سلیقہ ایک د ARRANGEMENT ، تھا

یہی سلیقہ ضیاء محی الدین کی زندگی میں جابجا نظر آتا ہے۔ ان کی وارڈروب ہو یا کتابوں کی الماری، دراز ہوں یا جوتے رکھنے کی جگہ ہر چیز اپنے ٹھکانے پر موجود ملے گی۔ تو جتنا عرصہ اماں جی کراچی رہیں ضیاء محی الدین دفتر سے آنے کے بعد پہلے اماں جی کے حضور آتے ان کا حال پوچھتے۔ اماں جی کی نظر ان دنوں کافی کمزور ہو گئی تھی۔ ضیاء محی الدین باتیں کرتے رہتے اور اس سارے وقت میں اماں جی ضیاء محی الدین کا ہاتھ تھامے رہتیں۔ ۱۹۷۹ء میں ضیاء صاحب برطانیہ چلے گئے۔ اور برمنگھم میں رہنے لگے۔ (اب بھی وہی رہتے ہیں) ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۶ء کے درمیان جب بھی ضیاء محی الدین پاکستان آئے اماں جی کے پاس ضرور حاضری دی۔ لیکن اس محبت کا اظہار انہوں نے کبھی عام آدمی کی طرح ڈھنڈورا پیٹ کر نہ کیا۔ پھر ۸۷ء کو انہیں اماں جی کے انتقال کی خبر ملی۔ عجیب اتفاق ہے کہ والد کے انتقال پر بھی وہ برطانیہ[1] میں ہی تھے اور جب اماں جی رخصت ہوئیں تو بھی وہ باہر تھے۔ اس خبر کو انہوں نے کیسے محسوس کیا ہوگا۔ میں نہیں بتا سکتا۔ وابستہ غم نہیں ہوئے ہوں گے۔ جب ۳۱ دسمبر ۸۷ء کی "محفلِ شعر و نثر" کے لئے لاہور آئے تو ۳۰ دسمبر کی صبح علی آڈیٹوریم میں ان سے ملاقات ہوئی۔ تو انہوں نے کہا "یار بس اب کے بہت کم وقت ہے کل شو ہے پرسوں لندن واپسی وہاں ایک فلم کی شوٹنگ شیڈول[2] ہے۔
"صبح اماں جی کے پاس گیا تھا، فاتحہ پڑھنے" اور پھر چند لمحوں کے لئے اپنے دونوں ہونٹوں کو دبا کر کچھ سوچنے لگے۔

---

۱۔ والد کے انتقال کے وقت ضیاء محی الدین ایک کھیل "THE HIDDEN TRUTH" کر رہے تھے۔

۲۔ فلم کا نام "GET TOGETHER" تھا۔

میرے خیال میں والدہ کی بیٹے سے محبت اور بیٹے کی والدہ سے محبت دراصل آئینے میں ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔

دیکھئے ضیا محی الدین اولاد کے بارے میں کس نکتہ نظر کا اظہار کرتے ہیں۔

"اب تو خیر بڑے بیٹے جوان ہو گئے ہیں۔ لیکن جب چھوٹے تھے تب بھی یہی خیال تھا کہ میرا زندگی کا ڈھرہ ایسا ہے کہ عام باپوں کی طرح ان کی روزمرہ کی اونچ نیچ سے واقف نہیں۔ معلوم نہیں ان سے دوستی ہو پائے گی یا نہیں۔ میں یہی چاہتا ہوں کہ اپنے بیٹوں سے بھی اس انداز سے گفتگو کر پاؤں جیسے اپنے احباب سے اور اس میں کسی تصنع کا سراغ نہ ملے۔ میں نے جس گہوارے میں تہذیب پائی اس کا تقاضا یہی تھا۔ احباب سے مذاق ہو ٹھٹھول ہو لیکن لپاڈگی نہ ہو، چہل ہو مگر سوقیانہ پن ہو ہمارے ہاں عام تصور یہ ہے کہ دوستوں کی محفلوں کی بے تکلفی اپنی جگہ ہے اور باپ بیٹے (یا باپ بیٹی) کا آمنا سامنا اور معانقہ اپنی جگہ۔ پھر ان بیٹھکوں کی خصوصی بات یہ ہے کہ اس میں جنسی معرکوں کا ذکر ہوتا ہے جنسی شکست کو ہمارے معاشرے میں کوئی شخص دوسروں کے سامنے قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔

مگر اولاد کا باپ کے بارے میں کیا رویہ ہوتا ہے؟ مشکل یہ ہے کہ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ ہماری لاکھ کوششوں کے باوجود وہ جس ماحول میں پلتے بڑھتے ہیں۔ جن لوگوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں ان سے ہماری صرف سطحی واقفیت ہوتی ہے۔ میرے دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ آپ چاہے کتنا ہی دوستی اور بنی تلی بے تکلفی کا رویہ لے کر اولاد سے بات

کریں ۔ وہ ایک دوسری نسل اور مشرق ہوتے ہوئے جھجک کی ایک دیوار ضرور چن دیں گے ۔ چونکہ ہم سب اپنے اپنے والدین کے بچے ہوتے ہیں اس لئے میرا نکتہ نظر اس مسئلے پر یہی ہے ۔

"WHAT PARENTS DO FOR CHILDREN IS NATURE

BUT WHAT CHILDREN DO FOR PARENTS IS CULTURE"

ویسے کبھی کبھی مجھے یہ خیال آتا ہے کہ " باہر " رہنے کی وجہ سے میں اپنے والدین پہ اپنے " کلچر " کا اظہار نہیں کر پایا ۔

(ضیاء محی الدین کا خط راقم الحروف
کے نام ۲۵ نومبر ۱۹۸۶ء)

اماں جی کے ضیا محی الدین اور سرور کے نام لکھے ہوئے چند خطوط ملاحظہ کیجئے جن میں ماں کی دعاؤں اور برکتوں کی بارشیں برستی نظر آئے گی ۔

---

۱ ۔ ضیاء محی الدین کی پہلی شریکِ حیات ۔

ماڈل ٹاؤن ۲ رمئی ۔ جان سے پیارے ضیاء تمہارا خط یکم مئی کو ملا اور وہ دستخط کا کاغذ بھی مل گیا ۔ میرا حال کیا پوچھتے ہو زندہ ہوں جب تک میرا وعدہ پورا نہیں ہوتا میں مر نہیں سکتی ۔ دربدر ماری ماری کبھی حمیدہ کے گھر چلی جاتی ہوں ۔ کبھی صفیہ کے گھر چلی جاتی ہوں ۔ کراچی اس لئے نہیں کے وہاں سے بار بار نہیں آسکتی ۔ کرایہ تو ۲۶۰ روپے ہے مگر وہ نیک لوگ ہیں ۔ تم کو یاد نہیں لائل پور والے چودھری سردار محمد جو کے زراعتی کالج میں پروفیسر تھے ۔ اشرف صاحب کو پتہ ہے ان لوگوں کا ۔ میرے پاس تو باہر کا کمرہ ہے ۔ اور دوسری طرف میں نے صحن بنا لیا ہے ۔ جہاں سبزیاں ہوتی تھیں ۔ ۲۰۰۰ روپے خرچ ہوئے ہیں ۔ تب کہیں جا کر ٹھیک ہوا ہے ۔ کراچی تو میں نے جانا ہے اگست میں اسحاق نے امریکہ ( AMERICA ) چلے جانا ہے ۔ اس لئے رضیہ اکیلی ہو گی ۔ میرے ضیاء میرا دل چاہتا ہے کہ تم میرے کراچی جانے سے پہلے ایک دفعہ آجاؤ ۔ اگر بچوں کو ساتھ لے آؤ تو بہت خوشی ہو گی ۔ اگر گرمی کی وجہ سے تکلیف بچوں کو ہو ، تو پھر تم اکیلے آجاؤ ۔ مگر آؤ ، ضرور ۔ تمہارا آنا بہت ضروری ہے ۔ اگر میں بھی تمہارے آبا کی طرح اچانک مر گئی ۔ تو تم کو بہت تکلیف ہو گی ۔ اس لئے میرے چاند آنا ضروری ہے ۔ کچھ دن آرام کر لو پھر آجانا ۔

نسیم صاحب پہلی سے جاتے لگ گئے ہیں یہ سب کچھ رشید صاحب نے کیا ہے ۔ خدا ان کو سلامت رکھے ۔ سب کا کام کرتے ہیں ۔ پا بھوتے ظاہر نہیں کیا کہ میرا رشتہ دار ہے ۔ رشید صاحب نے بھی یہی کہا تھا ۔ ویسے اختیار تو پا بھو کا ہے ۔ خدا والی ہے سب کا ۔ جب خالی بیٹھے تھے تو میں مدد کرتی رہی تھی بس گزر رہی ہے کبھی صفیہ آجاتی ہے ۔ کبھی حمیدہ ۔ میرے لالوں کو بہت بہت پیار ۔ بیدی سرور کو بہت بہت پیار ۔ میرا دل بہت چاہتا ہے انھیں دیکھنے کو ۔

آپ کی دعا کرنے والی والدہ

خادم محی الدین ۔ بیگم محی الدین

ماڈل ٹاؤن

پیارے ضیاء جیتے رہو۔

میری خواہش ہے کہ تم چند دنوں کے لئے میرے پاس آؤ۔ اگر تمہارے پاس آنے کو روپے نہیں ہیں۔ تو مجھے بتاؤ میں تمہارا ٹکٹ بنوا کر بھجوا دوں گی۔ تاکہ تمہیں پونڈ نہ خرچنا پڑیں۔ سرور اور بچوں کو پیار۔

تمہاری امّاں

---

میری پیاری سرور

ابھی ابھی تمہاری والدہ نے میرے پیارے پوتے کی خبر دی۔ مجھے بہت خوشی ہے کہ خدا نے تم کو خیریت کے ساتھ فارغ کیا۔ تم کو بہت بہت مبارک ہو۔ اور میرے دونوں جگر کے ٹکڑوں کو پیار۔ امید ہے اب تو میرا بڑا باتیں کرتا ہو گا۔

خیر سے ایک چاند سے خدا نے اب تین چاند کر دیئے ہیں۔ خدا کی مہربانی ہے۔ جس کا میں عاجز شکریہ بھی ادا نہیں کر سکتی۔ خدا کا شکر ہے میں دھوپ میں بیٹھ کر کچھ لکھ لیتی ہوں۔ اور سب کے خط پڑھ سکتی ہوں۔ تمہارے لئے دعا کرتی رہتی ہوں۔ میرے سب بچوں کو خدا اپنی حفاظت میں رکھے۔ شہر بانو کے پاس ہونے سے میری تسلی ہے۔ اُسے پیار۔

تمہاری دعا کرنے والی اماں

میری پیاری سرور سلامت رہو۔ آپ کا خط اور بچوں کی تصویریں پا کر بے حد خوشی ہوئی۔ خدا کا شکر ہے کے آپ خیریت سے ہیں۔ آپ تو بڑی اچھی اردو لکھ سکتی ہیں۔ میں اب نظر کی کمزوری کے سبب کچھ بھی لکھ پڑھ نہیں سکتی۔ میرا پیارا امی نوس اب خدا کے فضل سے سیانا نظر آتا ہے لیکن رشا کچھ اچھی طرح پہچانے نہیں گئے۔ شاید اگلی تصویروں میں جو آپ روانہ کریں گی۔

ان کی شکل و صورت زیادہ صاف دکھائی دے۔ ہم نے گرمی کا یہ موسم بڑی تکلیف سے گزارا ہے۔ اب کچھ موسم بدلنے لگا ہے میری پیاری سرور آپ لوگ کب تک پاکستان آئیں گے۔ آپ سب سے ملنے کو جی بہت چاہتا ہے۔ کیا میرے پیارے ضیا میاں کو آنے کی فرصت ملے گی خدا ان کے کام میں ترقی اور برکت دے۔ بچوں کو بہت بہت پیار۔ تصویروں کا شکریہ۔ میرے ضیاء کو بہت بہت پیار۔

بیٹی زیادہ نہیں مہینے کے بعد آپ ایک خط ضرور لکھ دیا کریں۔ نہایت تاکید ہے بڑی مہربانی ہوگی۔

آپ کی دعا کرنے والی والدہ

میرے پیارے ضیاء صدقے واری ضیاء

تمہارا دوسرا خط بھی مل گیا میرے بیٹے تم غم نہ کرنا۔ کبھی کسی کے ماں باپ ہمیشہ تو ساتھ نہیں رہتے خدا تمہاری زندگی کرے اور ان کا نام سلامت رکھے۔ لیکن میرے بیٹے میرا حال کچھ نہ پوچھو میں تو پاگل ہو گئی ہوں مجھے اس بات کا بہت رنج ہے کہ وہ منٹوں میں چلے گئے۔ میرے ضیاء وہ میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ افسوس کہ میں نے ان کی قدر نہ کی۔ اب تو میری یہی دعا ہے کہ ان کو بہشت میں جگہ دے۔ رضیہ کل کراچی چلی گئی ہے میرا دل ابھی کراچی جانے کو نہیں کرتا۔ رضیہ کل گئی تو صفیہ آ گئی ہے۔ آپ میرا کوئی فکر نہ کریں۔ تمہارے ابا جی نے کسی کا کچھ نہیں دینا۔ بلکہ تین چار سو پرچوں کا لینا ہے۔ اور کچھ مضمونوں کا بھی لینا ہے۔ کپڑے میں نے سب دے دیئے۔ میں بیٹھے کھاتی بھی ہوں۔ صبر تو خدا ہی دے گا۔

میرے دونوں لالوں کو پیار

تمہاری دعا کرنے والی اماں

اور اب ایک خط ضیاء محی الدین کا اماں جی کے نام جو انہوں نے غالباً ۲ رمئی ۸۶ء کو لکھا۔ ملاحظہ کیجئے۔

پیاری اماں جی،

میں چودہ تاریخ کو کراچی سے نکلا، پندرہ کو یہاں پہنچا۔ افسوس ہے کہ جو کام کرنے گیا تھا وہ نپٹ نہ سکا۔ اس میں میرا قصور صرف اس قدر تھا کہ میں نے کچھ ادھورا کام کرنے سے انکار کر دیا۔ ہاں اگر میرے پاس بہت زیادہ وقت ہوتا تو میں محنت کر کے اسے کچھ ٹھیک ٹھیک کر دیتا۔ خیر بقول آپ کے یہ بات اللہ کو منظور نہ تھی۔

مجھے افسوس ہے کہ اب کی بار میں نے آپ کو خفا کیا۔ مجھے اپنی جھنجھلاہٹ آپ تک نہیں پہنچانی چاہیئے ہیں۔ میں قصوروار ہوں اس لئے معافی چاہتا ہوں۔ آپا اور منظر اور سب گھر والوں کو پیار۔

آپ کا

ضیاء محی الدین ۲ مئی

---

# ۳۱ دسمبر کی شام

## ضیا محی الدین کے ساتھ
## ایک شام
## محفلِ شعر و نثر

۳۱ دسمبر ۸۷ء

میں داستان گو نہیں اور پیشہ ور داستان گو لوگوں کی طرح قصے بیان کرنا نہیں جانتا۔ جس طرح گرنتھی اپنی مقدس کتاب کو ایک خاص لہک میں پڑھتا ہے، اسی طرح داستان گو بھی قصے کو ایک خاص سُر میں شروع کرتا ہے۔ سننے والوں کی بھی چونکہ اس سُر سے آشنائی ہے اس لئے ان کا لُطف آشنائی کا لطف ہے، داستان سبھی کو معلوم ہوتی ہے۔

لیکن [illegible]
آج کی [illegible]

ضیا محی الدین

| | |
|---|---|
| Creation Hymn from the Rig Veda | (C1200 BC) |
| گماں کا ممکن | ن م راشد |
| Tribulations of Twashtri from Oriental Stories | F.W. Bain |
| حسن کوزہ گر | ن م راشد |
| سمندر کی تہہ میں | ن م راشد |
| اقتباس | مشتاق احمد یوسفی (زرگزشت) |
| Maharajahs Plain Tales of the Raj | Charles Allen |
| باسودے کی مریم | اسد محمد خان (کھڑکی بھر آسمان) |
| Night of the Scorpion | Nissim Ezekiel |
| مرحوم کی یاد میں | [illegible] |
| [illegible] | [illegible] |
| خطوط | نعمت علی دوری |
| خط | [illegible] |
| Silence | Krishnamurti |
| زندگی سے ڈرتے ہو | ن م راشد |
| Time | Bharatrihari |

# Some scintillating pieces ...

**By Asif Noorani**

**That Zia Moheyuddin's personality epitomises the best of the literary and cultural traditions of the East and West was amply reflected in his recitations in December 1986 and again in the same month last year. He recited some scintillating pieces from English and Urdu literature in front of appreciative audiences in Karachi and Lahore. His accent, pronunciation, correct pauses and the sheer quality of rendition can be a model for any one who wishes to take up recitation of prose and poetry seriously.**

Prose recital is purely an alien concept in this part of the world and poetry, though recited in 'mushairas,' is largely done by poets themselves. How enjoyable can this be and how popular can it become if only some one like Zia Moheyuddin were to perform to a large audience, and for that televisiop is just the right medium.

EMI have however contributed their bit by presenting some of his recitals from the December 1986 programme on a cassette. The one-hour album begins with the "Song of Tshwatri", which is an interesting expose of man's dire need of woman — he finds it difficult to put up with her as also to exist without her. Barring this piece, others are all in Urdu.

The excerpt from Mushtaq Ahmad Yusufi's *"Zarguzasht"* is like most of his work, more witty than humorous. His choice of words and expressions in every situation that he describes is excellent.

Patras Bukhari's piece on a bicycle which takes up almost the entire duration of side II evokes an interesting comparison between two of the greatest humourists in Urdu Literature.

**If Yousufi is skilful, Patras is spontaneous. His humour is not at any one else's cost, it is benign and aimed at his own self. Patras has just one slim collection of humourous pieces to his credit, but in sheer quality it is difficult to match. Yousufi is not very prolific either. His output has been three very readable books written in as many as 25 years.**

The album of live-recitals also features a moving character-sketch cum short story *"Basaudi Ki Mariam"* and a letter written by Chaudhry Mohammad Ali Radolvi to his daughter. The letter depicts an interesting 'dialogue' between the ageing writer and his creator. Both poieces are fine combinations of humour and pathos. Noon Meem Rshid's *"Zindagi se darte ho"* and *"Andha Khawab"* were recited by Zia with depth of feeling.

This writer would suggest that teachers could do well in recommending the cassette to all students in their teens, or above so that they could understand and appreciate the nuances of our literature and, if I may repeat myself, make it a model for recitation programmes.

A word about the snatches of sitar by Javed Allahditta, which punctuated the pieces of literature in the live poerformances, but which appear rarely on the cassette — they are exquisite. What a pity EMI did not mention his name even in small print on the in-lay crd of the cassette.

# ضیاء محی الدین کے ساتھ ایک شام

۳۱ر دسمبر ۱۹۸۷ء سال کا آخری سورج عروج پر پہنچنے اور دن بھر ناہموار زمین پر طلوع ہو کر مغرب کی جانب عازم سفر ہے۔ دسمبر کے سرد دنوں میں لوگ دن بھر اس کی آگ سے لطف اندوز ہوتے رہے ہیں۔ سورج کے مغرب کی جانب جاتے ہی فضا میں خنکی بڑھ گئی ہے موسم سرما کی آخری شام کو فیروز پور روڈ پر برفیلی ہواؤں سے محفوظ رکھنے کے لئے ایک باوقار تقریب کا اہتمام کیا گیا ہے

متمدن اور مہذب شہری اپنے ہم جلیسوں کے ساتھ آتے چلے جارہے ہیں۔ اس شب ان کی نگاہیں کسی غمگسار کی تلاش میں ہیں ان کی خاموشیوں میں ان کے نالوں کی گمشدہ آوازیں لرزاں ہیں وہ زندگی کو زرنگار کرنے کے تمنائی ہیں لیکن ابھی تبسم دوست زیر لب ہے۔ یہ محفل شعر و نثر پاکستان کے مایہ ناز فنکار ضیاء محی الدین کے لئے سجائی گئی ہے۔ جو ابھی کچھ ہی دیر میں ان کے کام و دہن کے لئے روحانی غذا فراہم کریں گے۔ ضیاء محی الدین داستان گو نہیں ہیں اور نہ پیشہ ور داستان گو کی طرح قصے بیان کرتے ہیں ہاں وہ بات کہنا جانتے ہیں۔ ابھی کچھ مہینوں پہلے انہوں نے فیض احمد فیض کے کلام سے لوگوں سے خراج تحسین وصول کیا تھا۔ وہ اس لہجے سے آشنائی رکھتے ہیں۔ جو سننے والے کے

دل کی آواز ہوتی ہے۔ اس لئے ضیاء کی بات "میں تے یہ جاتا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"۔ کی ترجمان بن جاتی ہے اور اس وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ اب کچھ بھی باقی نہیں ہے نہ مہتاب نہ سورج نہ اندھیرا نہ سویرا، ہاں ضیاء محی الدین کے لہجہ کی گونج ہے جو دل کی پہنائیوں میں درد کا ڈیرہ ڈالے ہوئے ہے

رات ڈھلنے لگی ہے سینوں میں
آگ سلگاؤ آبگینوں میں!

ضیاء محی الدین نے محفل شعر و نثر کے آغاز میں

FROM THE RIGVEDA سے تماشائیوں کو مبہوت کر دیا۔
یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ زمانہ ۱۹۸۷ء کا نہیں۔ بلکہ بارہ سو قبل مسیح کا ہو۔ آنکھوں کے سامنے آنکھیں بند کرکے سادھوں اپنے چیلوں میں گھرے، گنگا کے پوتر کناروں پر ڈیرا جمائے بیٹھے ہوں اور رگ وید کا پاٹھ جاری ہو اور۔

اس طرح ہے کہ ہر اک پیڑ کوئی مندر ہے
کوئی اجڑا ہوا بے نور پرانا مندر
آسمان کوئی پروہت ہے جو ہر بام تلے
جسم پر راکھ ملے، ماتھے پہ سیندور ملے
سرنگوں بیٹھا ہے چپ چاپ نہ جانے کب سے
اس طرح ہے کہ پس پردہ کوئی ساحر ہے
جس نے آفاق پہ پھیلایا ہے یوں سحر کا نام
دامن وقت سے پیوست ہے یوں دامن شام
اب کبھی شام بجھے گی نہ اندھیرا ہو گا
اب کبھی رات ڈھلے گی نہ سویرا ہو گا

نہ معلوم تماشائی کب تک اس ماحول میں گم رہتے کہ ضیاء نے ن۔م راشد کی نظم گماں کا ممکن سنانی شروع کی، ہمیں راشد کے وہ الفاظ یاد آئے جس میں انہوں نے پیش گوئی کی تھی۔ کہ صرف ضیاء ہی ان کی نظموں کو ڈراما ٹائیز کر سکتا ہے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ نظم نہیں پڑھی جا رہی آنکھوں کے سامنے ONE MAN SHOW ہو رہا ہو۔ لوگوں نے کہاں ایسی نظم اور اس انداز میں سنی ہوگی۔ ضیاء محی الدین کا فن نجات دل اور حیلۂ غم کا چارہ بنا ہوا تھا۔ جس نے خواب ہی خواب میں درد کے شہر کو بیدار کر دیا تھا۔
شعر کی دنیا میں ابھی تماشائی کھوئے ہی ہوئے تھے کہ ضیاء محی الدین نے نثر میں F.W. BAIN کی TRIBULATIONS OF TWASHTRI FROM ORIENTAL STORIES سنانی شروع کر دی، ان کے بیان کرنے کو کیا کہا جائے۔

کس طرح بیان ہو تیرا پیرائہ تقریر
گویا سرِ باطل پہ چمکنے لگی شمشیر
وہ زور ہے اک لفظ ادھر نطق سے نکلا
واں سینۂ اغیار میں پیوست ہوئے تیر
گرمی بھی ہے ٹھنڈک بھی روانی بھی سکون بھی
تاثیر کی کیا کہئے ہے تاثیر سی تاثیر

"حسن کوزہ گر" ن م راشد کی مشہور نظم ہے۔ کبھی راشد نے ضیا، محی الدین سے اس نظم کو پڑھنے کی خود فرمائش کی تھی۔ اب ضیاء سنا رہے تھے۔ ن م راشد کی ایک نظم "سمندر کی تہہ میں" ضیاء نے سمندر اور اس کی لہروں کی آواز کو پیش نظر رکھا اور اس کی آواز کا زیر و بم ایسا تھا جیسے ملاح کے چپوؤں کی آواز آ

رہی ہو۔ تماشائیوں کی یہ کیفیت ہوگئی تھی کہ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ان کی نگاہیں سمندر پر لگی ہیں اور وہ محو انتظار ہوں کہ کب دور دیس سے ان کی امیدوں کا جہاز آتا ہے۔

کسی نے خوب کہا تھا کہ ہم مزاح کے عہد یوسفی میں جی رہے ہیں۔ یوسفی نے یوں تو اردو ادب اور مزاح کی دنیا میں چراغ تلے، خاکم بدہن سے خاصہ اضافہ کیا ہے لیکن ان کی مزاحیہ انداز میں لکھی ہوئی آپ بیتی زرگزشت واقعی زرگزشت ہے۔ مزاح سے عموماً وہی لوگ محظوظ ہوتے ہیں۔ جنہیں اپنے آپ پر ہنسنا آتا ہے۔ یوسفی کا مزاح اور ضیاء محی الدین کا انداز، سونے پہ سہاگہ، دل چاہتا تھا کہ یہ ۱۴ دسمبر ۱۹۸۷ء کی رات طویل سے طویل تر ہو جائے اور ضیاء ہمیں اسی طرح زرگزشت سناتے رہیں۔

ضیاء محی الدین تماشائیوں کو مزاح کی دنیا سے سیاست کی دنیا میں لے گئے۔ راجے اور مہاراجے دنیا کے لئے مگر دل کے ہاتھوں مجبور مقہور، یہ CHARLES ALLEN کی MAHARAJAHS PLAIN TALES OF THE RAJ تھی

اسد محمد خان کی "کھڑکی بھر آسمان" مدت ہوئی شائع ہو چکی تھی مگر ابھی تک لوگوں کی توجہ اپنی جانب متوجہ نہ کر پائی تھی۔ ضیاء محی الدین نے "باسودے کی مریم" پڑھی تو لوگوں کو احساس ہوا۔ یہ اسد محمد خان کتنا بڑا فن کار ہے۔ اور کھڑکی بھر آسمان کتنا بڑا فن پارہ۔

NISSIN EZEKIEL کی NIGHT OF THE SCORPION نے مشرق و مغرب کو ایک کر دیا تھا۔ ضیاء محی الدین بین الاقوامی حیثیت کے فنکار ہیں۔ آج ان کے فن نے تماشائیوں کو بھی بین الاقوامی بنا دیا تھا۔

مزاح کا ذکر ہو اور پطرس کا نام نہ آئے یہ ممکن ہی نہیں۔ ضیاء نے پطرس

کا "مرحوم کی یاد میں" جب سنایا تو ایسا محسوس ہوا کہ سائیکل اور آدمی کا ساتھ تو جنم جنم کا ہے۔

خط، محبت اور خلوص کے ترجمان ہیں، ضیاء محی الدین نے پطرس کا ایک خط ہاجرہ کے نام لکھا ہوا سنایا۔

E.M.FOSTER

ضیاء محی الدین کا خیال ہے کہ محمد علی رودلوی اپنے خطوط میں کی طرح معرفت کو اس خوب صورت انداز میں پیش کرتے ہیں کہ ابھی تک کوئی ایسا لکھنے والا اردو ادب میں موجود نہیں، ضیاء محی الدین نے جب خط پڑھا تو واقعی احساس ہوا کہ ہم میں اتنے بڑے نابغہ بھی موجود ہیں۔

انہیں خطوط میں ضیاء محی الدین نے ڈاکٹر اقبال کے فرزند داؤد رہبر کا ایک خط بھی پڑھا۔ جو بقول ضیاء محی الدین کے ان کے ہم عصروں میں داؤد رہبر سے بہتر خط شاید ہی کوئی لکھتا ہو۔

آخر میں KRISHNAMURTI کی SILENCE اور BHARATRIHARI کی TIME پڑھی

ضیاء محی الدین نے پڑھنا ختم کر دیا تھا۔ لیکن لوگ دم بخود بیٹھے تھے انہیں تالیاں بجانے کا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔ پھر یکایک تالیوں کا ایک سمندر ابھرا۔ ضیاء نے اپنی داستان گوئی سے انہیں مبہوت کر دیا تھا۔ ان کی شام اس تحیر کی نذر ہو گئی تھی۔ ضیاء محی الدین نے عمر بھر میں جو کچھ پایا تھا سب لا کر دکھا دیا تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا واقعی سب کچھ لا کر دکھا دیا تھا؟

ہر اک دور میں، ہر زمانے میں ہم
زہر پیتے رہے، گیت گاتے رہے
لوگ سنتے رہے سازِ دل کی صدا

WEDNESDAY, 6 JANUARY, 1988 MIDWEEK
The Nation

# Zia Mohyeddin and the art of reading

**Khaled Ahmed**

**It seemed new because for the first time it was correct. Instead of the stylised rendition, which emphasises the reader rather than the subject, there was a precise reproduction of accents and the characters seemed to come alive. The reader effaced himself and the people he read about seemed to walk about the dim-lit hall like shades from an age when written Urdu sounded most like speech.**
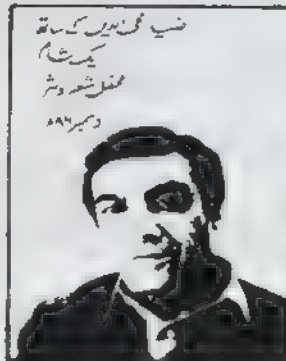
***The choice of Mushtaq Yusufi (who is undoubtedly the greatest Urdu humorist alive) was significant for two reasons. Like S.J. Perelman, he is not for everyone, his language and idiom are not for all literary palates. The choice in a way put the stamp of authority on his work; it also proved that he could be enjoyed if read properly. Zia had the audience in stitches.***

Lahore's memory of *Zia Mohyeddin reading Faiz* at the Pearl Continental last year was still fresh as the audience at the Ali Auditorium on Thursday (Dec 31) listened to him reading Urdu literature. His selection was wise and [illegible]: Noon Meem Raashid, Mushtaq Yusufi, Asad Mohammad Khan, Patras, Muhammad Ali Radolvi, Rattan Nath Sarshar and Daud Rahbar. Noon Meem's choice was a happy one because Zia's reading proved that Urdu's rhythmical line can be effectively read as one reads English blank verse, closer to the sound pattern of prose, avoiding the sing song which robs the line of meaning. The extract from Patras was pure cinema, the opening scene showed how Urdu could be as expressive of irony as English and Zia effectively translated the intent of Patras in his rendition.

The choice of Mushtaq Yusufi (who is undoubtedly the greatest Urdu humorist alive) was significant for two reasons. Like S.J. Perelman he is not for everyone, his language and idiom are not for all literary palates. The choice in a way put the stamp of authority on his work, it also proved that he could be enjoyed if read properly. Zia had the audience in stitches. He took some of the English reading out and got more of Yusufi's *Zarguzasht* in, he could have gone on the whole night.

Mohammad Ali Radolvi was a maverick in Urdu literature. His heresies are beautifully expressed in works he never himself took seriously; he was more of a personality than a professional writer. The letter Zia read expressed Radolvi's unrepentant old age and a command over the language that few contemporaries of his possessed. The pathos in that apparently funny letter was Zia's achievement, his rendition of the closure was masterfully low-key and controlled. A similar sadness filtered through the lines written by Asad Mohammad Khan about a house-maid. And Lahore will be grateful to Zia Mohyeddin for reviving the memory of Daud Rahbar the city's greatest contribution to intellect and sensibility that it was to lose to America.

Zia knows how to pronounce and read. His elocution in both Urdu and English is flawless. One is compelled to recall a similarly bilingual talent: the late Rafi Peer, a man of the theatre like Zia. But Rafi Peer was stylised, whatever he read became Rafi. He had a voice, rich and modulated,

but it remained his voice, it did not help the reader ef face himself Zulfiqar Bukhari read his brother Patras to great effect but Zulfikar's flaw was that he was too exclusively a man of the radio it was not the phrase but the word that he looked after, emphasising the last consonant to get it across intact. Zia Mohyeddin's rendition has the advantage of being closer to common speech and carries the idiosyncracies of the people who throw out phrases without thinking about emphasis. Zia had pace and selected the patches he had to gloss over with great dexterity. The pace saved his show

Coming back to Noon Meem, reading Urdu is not glowing with great tradition Mushaira murders the art of reading. Poetry is all rhythm because of *awzaan* the Arabic prosody; even blank verse, which is what Noon Meem wrote, was sing song. *Marseea* when read by experts like Z. Bokhari became effective but the tyranny of rhyme compounded the dullness of insistent rhythm and endless liaison Reading Noon Meem's *Hassan Koozagar*, Zia tried to wrench the lines out of these prosodic chains to bring

them closer to speech. The effect was amazing. Two things happened: the audience who would not pick up Noon Meem otherwise because of his tough diction, actually began to comprehend, and when Zia chose to fall into rhythm for effect, the audience seemed to comprehend even Noon Meem's use of complex symbolism. Before Zia's reading one thought Noon Meem was strictly for perusal and not for everyman.

Our cultural expression is supposed to be marred in literature because of overstatement. There must be such a thing as overstating the voice: we have it all the time on TV and Radio. It may be because our writings are flawed by overstatement and the characters they wish to put across are overstated like the hero of the Punjabi movie. That could be one reason why there are overkilling readers like Tariq Aziz and Muhammad Ali (shades of Z. Bokhari!) Zia's choice of *Basaudav ki Maryam* was a happy one: there was an [illegible] ment of meiosis in it and Zia's voice was beautifully understated.

Zia Mohyeddin's performance at the Ali Auditorium last week has opened a whole new vista of possibilities of reading. Urdu classics need to be read (voice) instead of being read as books if they are to be rescued from oblivion. Zia can go on and do more. If one is allowed to dream, his kind of reading can bring back to life the sort of Urdu that is fast disappearing. Writers who exclusively devote themselves to reproducing visual and lexical patterns may begin to use the yardstick of sound and realise how our Urdu today looks good but sounds so bad. It could be that writers begin to write with the objective of being read aloud rather than just being read visually.

EMI was selling the cassette of his latest readings from Urdu literature outside the Ali Auditorium hall. It is a keepsake but one knows it is not going to sell like Musarat Nazir's *Long gawacha* and EMI will not go blue in the face begging Zia to do more readings for them; but someone who loves Urdu, some organisation, official or NGO, should do a set for all of us who love Urdu but are saddened by the decline of belles lettres in it. There is Manto to be read yet and there are gems in Rashid Ahmad Siddiqi, Ghalib's letters, Chiragh Hassan Hasrat and Sarshar that need to be picked out the way Zia picked out his latest selection.

*EMI was selling the cassette of his latest readings from Urdu literature outside the Ali Auditorium hall. It is a keepsake but one knows it is not going to sell like Mussarat Nazir's LONG GAWACHA and EMI will not go blue in the face begging Zia to do more readings for them; but someone who loves Urdu, some organisation, official or NGO, should do a set for all of us who love Urdu but are saddened by the decline of belles-lettres in it.*

ناھید صدیقی۔ شادی کے موقع پر

شہزادی مارگریٹ اور ضیاء محی الدین - آرٹس اکیڈمی کا دورۂ برطانیہ

۱۹۵۴ء کی ایک یادگار تصویر

فلم EMPRESS AND THE MUNSHI کے واحد کردار "منشی حافظ عبدالکریم" کو ادا کرنے کی تیاری HAGLEY HALL
ایک عالی شان رہائش گاہ کو فلمبندی کے اس مرحلے کے لیے خاص طور سے کرایہ پر لیا گیا تھا۔ ۳ ۱۹۸ء

ضیا محی الدین "SHYLOCK" کے کردار میں (۱۹۶۰ء)

NOEL COWARD کے کھیل HAY FEVER کی کاسٹ کے ساتھ، پہلی رات کی پرفارمنس کے بعد اس میں سے تین چار لڑکے لڑکیاں بہت مشہور اداکار بنے

اس کھیل کی ہدایت کاری کے دوران "پیسیج ٹو انڈیا" کی پیشکش ہوئی

پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن کراچی سینٹر کے پروگرام میں امریکی جاز نواز کے ساتھ

EMPRESS AND THE MUNSHI کے ایک شاٹ کی فلمبندی کی تیاری (۱۹۸۳)

ڈاکٹر عزیز کے کردار میں

HUXLEY کی فلم AFTER MANY A SUMMER میں

ڈاکٹر عزیز کے کردار میں۔ پیسیج ٹو انڈیا کا ایک اور پوز

پنے شو HERE AND NOW کی ریکارڈنگ سے چند لمحے قبل پیش،
منظر میں رکھے ہوئے میکسکین آرٹ کے نمونے کو ہٹانے یا نہ ہٹانے
کے بارے میں سوچتے ہوئے۔ بالآخر اُسے ہٹانے پر بات ٹھہری ۔
(۱۹۸۸)

ضیاء محی الدین، ناھید صدیقی، حسن اور ریشا

چینل نور" کے لیے محفل موسیقی کی ریکارڈنگ کے دوران سرود نوازی کے فن اور استاد امجد علی خاں کی شخصیت کو حاضرین سے متعارف کرواتے ہوئے (۱۹۸۳ء)

پروگرام نشر ہونے سے چند لمحے پیشتر مسوّدے پر آخری نظر

( ۱۹۸۶ ر.

# ہمارا علم ٹوٹ بٹوٹ

داؤد رہبر جس سے ضیا محی الدین کی صرف رشتہ داری یا دوستی ہی نہیں بلکہ ایک معرفت کا رشتہ ہے جسے وہ ہمیشہ سے قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے دلچسپ اور سحر انگیز خطوں کے وہ ہمیشہ سے مداح ہیں۔ لیکن جیسا کہ آپ کو اب تک اس بات کا علم ہو چکا ہے کہ ضیاء محی الدین کے خطوط بجائے خود ایک انفرادیت کے حامل ہیں۔ ایک خط جو انہوں نے داؤد رہبر کو ۱۸ مئی ۸۷ء کو تحریر کیا ملاحظہ کیجیے۔

یہ خط جس میں بقول ضیا محی الدین۔

"اس خط کی نقل اس لئے بھیج رہا ہوں کہ اس میں میرے دو چار ( PET ) سوال ہیں، شاید ان کا ذکر تمہاری تحقیق کے سلسلے میں کام آئے۔"

ضیاء محی الدین

برمنگھم ۲۵ نومبر ۸۶ء

پربھو جی، دکھیو لاج ہماری۔

ڈرتے ڈرتے قلم اٹھاتا ہوں، آپ کے خط کو ہر مہینے پڑھتا رہا، جملے جملے کو سراہتا رہا۔ اس سے حظ اٹھاتا رہا۔ اور یہ ہے کہ کے چپ ہو جاتا رہا، یونہی ہفتے گزارے اور پھر مہینے۔

دیکھئے حضرت آپ ایسی عبارت آرائیاں کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اچھل بھی پڑتا ہے اور چت بھی ہو جاتا ہے۔ واللہ تحریر میں کیا کیا سحر طرازیاں کرتے ہیں۔ ضروری تو یہ تھا کہ ہم بھی اسی انداز میں لکھیں۔ یہ غالب صاحب کا ادراک کہاں سے لاویں۔؟ اردو، ہماری معمولی، فارسی، قطعی ناقص، لفظوں کو لغت سے ڈھونڈیں تو آورد کی تہمت لگے گی اور لغت کس کم بخت کے پاس ہے۔

میں کبھی اپنی زندگی پہ نظر دوڑاتا ہوں تو مجھے سب سے زیادہ افسوس اپنی تعلیم کی کمی پہ ہوتا ہے۔ بچپن میں اگر دلجمعی سے اپنی زبان پڑھی ہوتی تو آج محرومی کا اتنا شدید احساس نہ رہتا فارسی میں رفت، رفتند رفتم رفتیم تک ہی معاملہ رہا۔ عربی میں کبھی نرم "ریڈر" سے آگے نہ پڑھ پایا (انگریزی سیکھی اور اپنے حساب سے خوب سیکھی، لیکن کسی انتظام کے تحت نہیں کبھی ادب کبھی نظم، کبھی جاسوسی کہانی کبھی کھیل تمثیل، نہ پہ نہ بیٹھتی رہی۔ لیکن ایسی نہیں جیسے کسی اچھی جلد کی ہوئی کتاب کے ورقوں پہ ہوتی ہے۔)

اچھا یہ بتایئے کہ جس دھونس سے ہم اردو کو اپنی زبان کہتے ہیں، اس میں ہم کس حد تک حق بجانب ہیں؟ اپنی زبان تو وہ ہے جو اس ملک کے باشندوں کی مادری زبان ہو جس میں ہماری تمہاری پنپ ہوئی۔ دراصل میں نے گہوارے سے اپنے اردگرد کے بوڑھوں سے یہ زبان نہ سنی۔ (آپ شاید اس سے مستثنیٰ ہوں اسی لئے آپ سے پوچھا، بعد میں جب اس زبان کے رموز سے

واقفیت ہوئی تو وہ ایک طرح سے شعوری طور پر گھٹی میں پڑی یہ الگ
بحث ہے کہ کوئی چیز شعور کے سلسلے سے گھٹی میں داخل ہو سکتی ہے یا نہیں
مختصر یہ کہ محنت اور مشقت سے زبان کے قواعد پر عبور حاصل کرنے کی
کوشش کی، ممکن ہے۔ تھوڑا بہت صحیح لکھنا بھی آگیا ہو لیکن اس کے باوجود
ہمارا درجہ زبا ندان ہی کا ہو سکتا ہے۔ اہل زبان کا نہیں، زبان کے روزمرے میں
ایسی ایسی نزاکتیں ہیں جو قاعدے اور کتاب میں نہیں ملتیں۔ اس لئے ہمارا علم
ٹوٹا پھوٹا ہی رہے گا۔ لایعنی، لایعنی،
حاصل، بہت جانچ پڑتال کروں تو ایک انگریزی کا لفظ TASTE
(میں نہیں جانتا کہ ذوق میں وہ بات آتی ہے یا نہیں)، چند بندشیں، چند طرزیں،
کچھ شیکسپیر کے فقرے ..... باقی ہوس!
لفافہ پر ہوائی جہاز کی تصویر بنا کر آپ نے گویا اپنی معصومیت کی مہر ثبت
کردی۔ بالمشافہ کی امید کے بارے میں یہ عرض ہے کہ ہمارا گاؤں لنگم کا ہم قافیہ
ہے پھر بھی آپ کے شہر سے اتنا دور نہیں، آیئے اور کچھ دن ہمارے پاس رہیئے
ناہید بیگم نے کچھ چیزیں تو اچھی جمع کر ہی لی ہیں۔ ایک طبلے کا مستقل انتظام بھی
ہے سو آپ کی گائکی میں خلل نہ ہونے دیں گے۔

پیار اور پیار
ضیاء محی الدین

پسوجی، رکھو لاج ہماری
ذرّے ذرّے تلملاتا ہوں۔ آپ کے خط کو پڑھتے پڑھتا؛ جملے جملے کو سراہتا؛
اس سے حظ اٹھاتا؛ اور پھر بے کرکے چپ ہو جاتا (ہوں)۔ یوں ہی بیتے گزرے
اور پھر بیتے۔

دیکھئے حضرت آپ ایسی عبارت آرائیاں کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اچھل ہی پڑتا ہے
اور چپ ہی ہو جاتا ہے۔ واللہ تحریر میں کیا کیا سحر طرازیاں کرتے ہیں۔ ضروری تو یہ
تھا کہ ہم بھی اسی انداز میں لکھیں۔ پر حالت یہ ہے کہ ادراک کہاں سے لاویں؟
اردو، ہماری معمولی۔ فارسی مفلس یا قلیل۔ لفظوں کو لغت سے ڈھونڈیں تو
آورد کی تہمت لگے گی اور لغت کس کم بخت کے پاس ہے؟

میں کبھی اپنی زندگی پر نظر دوڑاتا ہوں تو مجھے سب سے زیادہ افسوس اپنی تعلیم کی کمی پر
ہوتا ہے۔ بچپن میں اگر دل جمعی سے اپنی زبان پڑھی ہوتی تو آج محرومی کا اتنا شدید
احساس نہ ہوتا۔ فارسی میں رفت رفتند رفتم رفتیم تک ہی معاملہ رہا۔ عربی میں کبھی
بسم اللہ سے آگے نہ بڑھ پایا۔ [انگریزی پڑھی اور اپنے حساب سے خوب پڑھی
لیکن کسی استاد کے تحت نہیں۔ سو کبھی ادب، کبھی نظم، کبھی جاسوسی کہانی، کبھی کمیل
تمثیل، جو ہاتھ پڑتا پڑھتا رہا۔ لیکن ایسی بھوک جیسے کسی اچھے حلوائی کی دکان کے
پکوانوں پہ ہوتی ہے]

اچھا یہ بتائیے کہ جس دعوے سے ہم اردو کو اپنی زبان کہتے ہیں، اس میں ہم کس حد
تک حق بجانب ہیں؟ ۔ اپنی زبان تو وہ ہے جو اس ملک کے باشندوں کی مادری زبان
ہو جس میں ہماری تہذیبی پرورش ہوئی۔ دراصل میں نے گھر سے، اپنے اردگرد کے بوڑھوں سے
یہ زبان نہ سنی (ایک شاعر ایسے نشستیں ہوتی اسی لئے آپ سے پوچھا) لیکن جب اس
زبان کے رموز سے واقفیت ہوئی تو ایک طرح سے شعوری طور پر گھر ہی میں رہی ہے۔ یہ الگ
بحث ہے کہ کوئی چیز شعوری سلیقے سے گھر میں داخل ہو سکتی ہے یا نہیں۔ مختصر یہ کہ
محنت اور مشقت سے زبان کے قواعد پر عبور حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ممکن ہے
تھوڑا بہت کچھ لکھنا بھی آگیا ہو لیکن اس کے باوجود گیا ہارا درجہ زباندانی کیا ہو سکتا ہے

حرفِ مکرّر

چاہتوں کی سرزمین پاکستان ، ضیاء محی الدین کا وطن ہے۔ اور وطن کی مہک انسان کی نس نس میں رچی بسی ہوتی ہے۔ انسان اپنے خمیر اور مٹی کو کیسے بھلا سکتا ہے۔ فیض نے تو ذکر وطن اپنے روبرو کرنے کا مشورہ دیا اور انہوں نے یہ کہا۔

تمہارے ہاتھ میں ہے تابشِ حنا جب تک
جہاں میں باقی ہے دلداریٔ عروسِ سخن
تمہارا حُسن جواں ہے، تو مہرباں ہے فلک
تمہارا دم ہے تو دم ساز ہے ہوائے چمن
اگرچہ تنگ ہیں اوقات، سخت ہیں آلام
تمہاری یاد سے شیریں ہے تلخیٔ ایام
سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حُسن کے نام

ضیاء محی الدین کے لئے یہ "حسن" وطن کا حسن ہے جس کی یاد میں وہ بیرون وطن اپنے در و بام سجاتا ہے۔ ضیاء محی الدین کے فن کی تازگی اور اس کی شخصیت کی توانائی میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ بلکہ اس تازگی اور

توانائی میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ ضیاء محی الدین فن کی دنیا کا وہ منفرد آفتاب
ہے جو آئے دن زیادہ تابندہ اور رخشندہ ہو رہا ہے۔ ضیاء محی الدین
ایک عظیم تہذیبی ورثے کا امین ہے۔ وہ تہذیبی سفر میں حیران و سراسیمہ
نہیں وہ یقیناً اس بات پر فخر محسوس کرتا ہے۔ کہ اس نے اپنی چاہتوں
کی سرزمین پاکستان کا نام روشن کیا ہے۔ ضیاء محی الدین نے فن کی
دنیا کو وسیع کیا ہے۔ اور دنیا کو بتا دیا۔ کہ پاکستان کے فن کار کسی بھی ملک کے فنکاروں سے
پیچھے نہیں ہیں۔ لیکن اُس کے مہمان خانۂ دل میں یہ کسک باقی ہے۔ کہ
کاش انہیں اپنے وطن میں اپنے عوام میں اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کو
بروئے کار لانے کے لئے کوئی اسٹیج مل جاتی۔ وہ بار بار اس کا اظہار
کرتے ہیں کہ اگر انہیں دو وقت کی روٹی اور مکان فراہم کر دیا جائے تو وہ
واپس وطن آنے کے لئے تیار ہیں۔

اس حصے میں جسے "حرفِ مکرر" کا نام دیا گیا ہے۔ ضیاء محی الدین
کے ساتھ وقتاً فوقتاً ملاقاتوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے گفتگو
کے ان حصوں میں ان کی شخصیت کے بہت سے پہلو نمایاں ہوتے
ہیں۔ اور ضیاء محی الدین کی دیانتداری اس گفتگو کا اصل حسن ہے۔

"میں لاکھ کوشش کروں لوگوں کے ذہن سے یہ تاثر نہیں مٹا سکتا
کہ میں اپنی پہلی ڈگر پر ہی چلوں گا۔ کیونکہ میری ذات اس ایک "شو" سے
وابستہ ہو چکی ہے تاہم میں نہیں سمجھتا کہ اب جو کام شروع کروں گا۔ پہلے
جیسا ہی ہوگا۔ کچھ تو فرق ہوگا۔ ہونا بھی چاہیئے۔ وقت بھی بہت گزر
چکا ہے۔ پندرہ سال پہلے کی بات ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لوگ
میرے پہلے "شو" کو دل سے پسند کرتے ہیں اور مجھے بار بار یاد بھی

دلاتے ہیں کہ صاحب کیا نفاست تھی۔ اس پروگرام میں جو کبھی آپ پیش کرتے تھے۔ مگر میں صاف گوئی سے عرض کروں گا۔ کہ میں نے ماضی میں جتنے بھی پروگرام کئے ان میں سے معیار کے اعتبار سے چند ایک ہی اچھے تھے۔ باقی سب اوسط درجے کے تھے۔ گزارا ہی تھے۔ اس میں کوئی انکسار نہیں ہے۔ ٹی وی اور شو بزنس ایسی جگہ ہے کہ جتنا کام کرتے جاؤ احساس ہوتا ہے۔ کہ ہم کچھ نہیں جانتے۔ اب تو صورت حال یہ ہے کہ میں نے اپنا سر قصائی کے تختے پر رکھ دیا ہے۔ لوگوں میں

( NOSTALGIA ) اتنا زیادہ ہے کہ وہ ماضی کے

ضیاء محی الدین جو شو والے تھے۔ انہیں بھلا ہی نہیں پاتے میں کچھ اور پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میں جو چیز بھی پیش کروں گا۔ اسے کس حد پسند کیا جاتا ہے۔ اس کا فیصلہ قبل از وقت نہیں کیا جا سکتا میں نے دوبارہ آغاز اس لئے کیا ہے کہ دوبارہ خود کو آزمایا جائے پھر یہ کہ وطن واپس آنے کو کس کا دل نہیں چاہتا۔ اور کام کرنے کو بھی یہاں دل چاہتا ہے۔ وہ تو اتفاق کی بات ہے کہ مواقع ایسے مل گئے۔ کہ دس بارہ سالوں کے دوران میں ذرا مختلف سا کام کرتا رہا۔

"پھر کچھ میرے اپنے معیار کے پیمانے بڑھتے رہے۔ کچھ اور دنیا دیکھ کر آنکھیں بھی کھلی ہیں باہر کام کرنے والوں کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ ہم ہیں کیا؟ میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ بڑے اداکار میں دو چیزیں ہونی چاہئیں۔ حد درجہ انکسار اور حد درجہ تکبر۔ انکسار اسے یہ بتاتا ہے کہ تم کچھ نہیں ہو، محنت کرتے رہو اور تکبر اسے حوصلہ دیتا ہے کہ بڑے سے بڑے رول پر ہاتھ ڈالو، تم اسے کر سکتے ہو۔ میں نے اپنے استاد رفیع پیر صاحب میں دیکھا ہے کہ جب تک انسان میں انا نہ ہو وہ اس گھن گرج میں بول ہی نہیں سکتا، جو بڑے اداکار کی شان ہے

میں ذاتی طور پر بے حد شرمیلا انسان ہوں۔ میں یہ بات اس لئے کہہ رہا ہوں کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ شو بزنس کا کوئی شخص شرمیلا نہیں ہو سکتا۔ میرا خیال ہے کہ میں تو اس میدان میں آیا ہی اس لئے تھا۔ (گفتگو اپریل ۱۹۸۶ء)

شرمیلاپن یا احساس کمتری یا اپنے میں لئے دیئے رہنے والا شخص شوبزنس کی دنیا میں کس طرح شہرت کا حامل ہوتا ہے۔ اس بارے میں پاکستان کے ایک معروف ہدایت کار کہتے ہیں :

جانی : میں سمجھتا ہوں کہ ضیاء محی الدین کو اس کے شرمیلے پن اور اگر میں یہ کہوں کہ احساس کمتری کے جذبے نے ایک عظیم فنکار بنایا تو غلط نہ ہوگا۔ یعنی غور کریں ضیاء پہلے پہل جب پاکستان فلم انڈسٹری میں آنے کے خواب دیکھنے لگا، تو اسے خاصا مایوس کیا گیا۔ اسے اس ملک کے ہیرو کی خصوصیات کچھ اور ہی بتائی گئیں اور بلکہ مشورہ دیا گیا کہ آپ اگر اس فیلڈ میں آنا ہی چاہتے ہیں، تو بطور ہدایت کار آئیں، باہر سے کوئی CINEMATOGRAPHY کی سند لے آئیں، زیادہ شہرت ہوگی، کچھ نمبر بن جائیں گے۔ لوگ زیادہ متوجہ ہوں گے۔ باقی یہ اداکاری وغیرہ چھوڑیں۔ یہ وہ لمحہ ہے جب ضیاء محی الدین اپنے ساتھ جنگ لڑتا ہے اور فیصلہ کرتا ہے کہ اس احساس کمتری یا شرمیلاپن کی حد د پھلانگ کر وہ اس میدان میں وہ کر دکھائے گا جس کا صرف تصور کیا جا سکتا ہے اور پھر ضیاء محی الدین نہ صرف ڈرامہ کرتا ہے بلکہ دنیا کے مشکل ترین، ڈرامہ نگار شکسپیئر کو ہاتھ ڈالتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہ کیا ہے ؟ اس کی آواز، اس کا لہجہ، اس کا انداز، اس کا اسٹائل، دو نہیں، تو کم از کم ایک دنیا پر حکمرانی کرتا ہے۔ یہ ہے ضیاء محی الدین، جو "شو" کرتا ہے تو اپنے انداز میں۔ ڈرامہ بولتا ہے تو اپنے اسلوب سے۔ نثر، پارہ یا شعر پڑھتا ہے، تو سب کو مبہوت کر دیتا ہے۔ یہ سارا اعجاز اس شرمیلے پن کا ہی تو ہے۔" (یادر حسین سے گفتگو، جنوری ۱۹۸۸ء)

ضیاء محی الدین کے پاکستان میں قیام کے سلسلہ کی ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ جب کبھی بھی پاکستان آتے ہیں اپنے ایک دوست محمود الٰہی کے ہاں قیام کرتے ہیں ان کی رہائش لاہور کینٹ میں ہے اور یہ، محمود الٰہی، منظور الٰہی کے بھائی ہیں - جن کی کتاب "سلسلہ روز و شب" ہے۔ جس میں فیصل آباد کے کچھ احباب کا ذکر ملتا ہے اور کچھ تحریک کا - لاہور میں سب بہنوں کی طرف جاتے ہیں داماں جی کے پاس باقاعدہ حاضری ہوتی تھی، مگر رہتے وہ محمود الٰہی صاحب کے گھر ہیں، ۱۹۸۰ء میں جب وہ PAUL SCOTT کے ناول پر مبنی فلم " STAYING ON " کی شوٹنگ کے سلسلے میں شملے جا رہے تھے - ان سے محمود الٰہی صاحب کے گھر ملاقات ہوئی - انہوں نے کچھ اس فلم کے بارے میں بتایا، کچھ زندگی کے بارے میں گفتگو ہوئی - لیکن میرے ایک سوال پر کہ آپ کی زندگی کے وہ کون لوگ تھے جن کا اثر آپ پر ہوا - بہت دیر خاموشی سے سگریٹ پیتے رہے - چائے پڑی پڑی ٹھنڈی ہو گئی - پھر ایک دم سے کہنے لگے - "میاں اس کا جواب میں لکھ کر بھیجوں گا - سو انہوں نے جواب لکھ بھیجا - یہ مراسلہ انہوں نے ۲۵ نومبر ۸۶ء کو ارسال کیا -

---

ضیاء محی الدین سگریٹ پینے کے معاملے میں بھی بڑے مضبوط ارادہ کے مالک ہیں میں نے انہیں ہمیشہ صرف 'ROTHAMANS پیتے دیکھا ہے -

"کون سے لوگ ہیں جنہوں نے آپ کی زندگی پر اثر چھوڑا ؟"
ان کرداروں میں کسی کو برتری کے اعتبار سے نمبر نہیں دیئے گئے ہیں ۔

۱۔ محمود نظامی
دوستوں کی دل آزاری کبھی مت کرو ۔ کیا باغ و بہار شخصیت تھی ۔

۲۔ سر عبدالقادر ۔
میں نے جب پہلی بار انہیں تقریر کرتے سنا تو ایسا لگا کہ موتی جھڑ رہے ہیں ۔ میری عمر اس وقت چھ برس کی تھی ، مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک عجیب چیز میرے دل میں نقش ہوئی کہ لب و لہجہ کس قدر خوب صورت چیز ہے ۔

۳۔ خادم محی الدین ۔
میرے والد نے مجھے شدھ سنگیت کی پہچان کرائی ۔ شریفانہ برتاؤ کا وہ مجسمہ تھے ۔ سٹیج سے مجھے انہی نے روشناس کیا ۔ جب آپ یہ پوچھتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اثر چھوڑا " تو اس سے یہ نہ سمجھیئے گا ۔ کہ جن ہستیوں کا میں ذکر کر رہا ہوں ۔ کہ ان کی بڑی صفات مجھ میں آگئیں ۔ ہاں ان صفتوں کی کسی حد تک پرکھ ضرور آگئی ۔

۴۔ بی بی سی ۔
بمبئی بخاری برادرز کارپوریشن ، بڑے بخاری نے مجھے ادب کی طرف اشارہ کیا ۔ کچھ راہ بھی دکھائی ۔ چھوٹے بخاری صاحب

نے آواز کے اتار چڑھاؤ، مائیکروفون کے آداب سکھائے ان کی مہمان نوازی ایک یادگار عجوبہ تھی، ایک نظم تھی۔

۵۔ ای ایم فارسٹر:۔

علم و فضل کا خزانہ تھے۔ انگریزی ادب میں ان کا مقام ایسا جو ایک صدی میں دو ایک لوگوں کو ملتا ہے۔ دوسروں کی بات ایسے سنتے تھے جیسے ان سے کچھ سیکھ رہے ہوں۔

۶۔ داؤد رہبر:۔

میرے ہمعصروں میں (چار یا پانچ سال سینئر لوگوں کو ہمعصر سمجھا جا سکتا ہے تو) میں نے ابھی تک کوئی ایسی قرون وسطیٰ کی سی شخصیت نہیں دیکھی۔ یہ کہنا بھی غلط ہے کیونکہ اپنے ذاتی دکھوں کو اپنے سینے سے لگائے رکھنا صرف قرون وسطیٰ ہی میں نہیں کسی صدی میں بھی ممکن ہے۔ لیکن ذاتی دکھوں کو اپنی ذات پر حاوی نہ ہونے دینا۔ اور اپنے رویّے میں شامل نہ کرنا اور کبھی اس کا اظہار نہ کرنا پیغمبرانہ خوبی ہے۔ پھر اسلوب کی پرکھ، صاحب طرز ہونے کی کیفیت، اور موسیقی سے حد درجہ عشق ہونے کے باوجود خود اپنی گائیکی کو کسی پہ مسلط نہ کرنا۔ سبحان اللہ سبحان اللہ۔

اور کیسے کیسے لوگ اور پھر

۷۔ ن م راشد:۔

مجھ میں راشد صاحب کی کوئی بات بھی نہ آئی۔ پر راشد صاحب سے ملکر جو خوشی ہوتی تھی وہ بہت کم لوگوں سے ہوئی جب تک میں راشد صاحب سے نہیں ملا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ

مجھے اور کچھ آتا ہو نہ آتا ہو۔ میں شاعری اور اس کی نزاکت کو فوراً پکڑ پاتا ہوں۔ راشد صاحب کے پاس اٹھنا بیٹھنا ہوا تو معلوم ہوا کہ جسے میں اردو شاعری سمجھا تھا۔ وہ اصل میں ہاتھے اوئی اللہ قسم کی چیز ہے، اور اردو میں اچھی شاعری اتنی بہت سی ہے بھی نہیں،

یوں تو دنیا بھر میں صحافی لوگ، اداکاروں کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی تو ان کی اپنی تنہائی بھی چھین لیتے ہیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ بھارت میں پیش آیا۔ جن دنوں وہ شملہ میں شوٹنگ کر رہے تھے۔ ان کا قیام OBEROI ہوٹل میں تھا۔ حضرت صحافی نے انہیں جا لیا اور پھر اپنے اخبار میں یہ کالم چھاپا۔ یہ کالم ۲۵ مارچ ۱۹۸۰ء کو اخبار THE STATESMAN میں شائع ہوا۔

PASSING BY

## A MAN WHO WON'T SEE OWN FILMS

By A Staff Reporter

MR SASTHI Brata may find it a little hard to believe, but there is at least one fairly important Asian in Britain who swears that he has never heard of him. He is Zia Mohyeddin, a Pakistani stage and film actor who has been living in Britain for 25 years and claims to know almost everyone worth knowing.

Among them is Mr Ian Stephen, former editor of The Statesman, whom Mohyeddin calls as "an extremely knowledgeable journalist with fond memories of India and The Statesman". About Brata he says: "Well, if you say that he is well known, he must be . . . but frankly I have never heard of him, or seen him on TV."

However, another Indian whom he knows and also admires is Saeed Jaffrey, who is Lucknow's contribution to West End. In fact, between them the two have put the subcontinent on the British theatre and film map. Right now, they are here* for the filming of Paul Scott's novel, Staying On, built around a British couple who choose to stay on in India after independence. Trevor Howard and Celia Johnson play the couple, with Mohyeddin and Jaffrey doing major character rôles. The film, being made for Granada TV, will be shot in Simla and Delhi. It is

a pity that Mohyeddin will not get to see the film. For he claims that he never sees his own films. "Those who do suffer from narcissism, though their argument is that they want to see where they erred and improve themselves. My theory is that you never get to learn from your own mistakes. If you could, then Gavaskar would not get out again and again by playing the same kind of shot."

He is also quite cynical about acting courses, though he himself went to the British Royal Academy of Dramatic Arts. "All that a stint at a school does is to give you an insight into what is in store for you . . . and perhaps impart a snob value."

Mohyeddin went to Britain in the 50s to learn dramatics, and then, like Scott's couple, decided to stay on in a foreign country. "I felt that if there was one place where I could live by theatre it was Britain. And in retrospect I feel that I was not far too wide of the mark. Of course, I was lucky that I got a break in TV and films."

Some of his films that he likes to talk about are Lawrence of Arabia, Bombay Talkie, and Ashanti. The last, he says, got "dreadful reviews despite a multi-star cast. Since I didn't see the film, I don't know how bad it was"

Racial attitudes in Britain have hardened considerably in recent years, according to Mohyeddin. Probably the worst thing that has happened to Asian immigrants there, he says, is Mrs Thatcher. "Organizations like the National Front have become bolder since she took over.

**(*Hotel Oberoi)**

## ضیاء محی الدین شیکسپیر تھیٹر میں

ہر اداکار کی خواہش ہے کہ وہ ڈرامہ کے بے تاج بادشاہ یعنی شیکسپیئر کے

تھیٹر میں بھی اپنے فن کا لوہا منوائے چنانچہ جن دنوں ضیاء محی الدین لارنس آف
عربیا کے شوٹنگ کے سلسلہ میں اردن میں تھے۔ انہیں اطلاع ملی کہ
ROYAL SHAKESPEARS THEATRE نے شیکسپیئر کے شہرہ آفاق
ڈرامہ "رومیو جیولٹ" میں انہیں "رومیو" کے لئے منتخب کر لیا

ضیا محی الدین نے آسٹریلیا میں قیام کے دوران شکسپیئر کے ڈرامے دیکھے اور ان پر
یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ شکسپیئر کا مطالعہ کیا جائے، اسے بغور پڑھا جائے اور معرفت کے
اس مقام کو تلاش کیا جائے، جو شکسپیئر کے ہاں پایا جاتا ہے۔ اور یہی ان کی اس محبت کا
اظہار اس امر سے ملتا ہے کہ انہوں نے شکسپیئر کے کئی ڈرامے کئے۔ جن میں "مرچنٹ آف
وینس" "رومیو جیولٹ" اور "کنگ لیئر" نمایاں ہیں ضیا محی الدین کے شکسپیئر سے تعلق
کے حوالے سے شکسپیئر کے بارے میں چند سطور درج کرنے کو جی چاہ رہا ہے کہ ہم بھی اس
عظیم ڈرامہ نگار کے بارے میں تھوڑا سا جان سکیں۔

شیکسپیئر کی ذات اس کا مقام اور رفعت کا اندازہ لگانے کے لیے میں ۱۹۲۴ء کی چھپی ہوئی کتاب "ناٹک ساگر" سے چند اقتباس شامل کتاب کر رہا ہوں تاکہ شیکسپیئر کی حیثیت اور اس کے ڈراموں کی ارتقائی کیفیت کا اندازہ ہو سکے۔ اس کتاب کے مصنفین نور الہیٰ اور محمد عمر تھے جنہوں نے اس کتاب کو جناب مولانا محمد عبدالحق (بابائے اردو) کے نام منسوب کیا۔

"شیکسپیئر کے عام پڑھنے والے جو اس کے متعلقہ لٹریچر پر عبور نہیں رکھتے یہ خیال کرنے میں حق بجانب ہیں کہ شیکسپیئر کے کیریکٹر۔ اخلاق اور سیاسیات کے متعلق اقوال اس کے اپنے تجربہ اور مشاہدہ پر مبنی ہیں مگر دیگر باتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی کام ہے جو اس نے نہیں کیا وہ جانتا تھا کہ کسی ایک شخص کا ذاتی تجربہ کیسی حقیر چیز ہے اور اس لئے اس نے مختلف زمانوں کے جمع شدہ تجربات سے دل کھول کر فائدہ اٹھایا۔ اس کے بہت سے خزانے اس کے سامنے کھلے ہوئے تھے ناول اور ڈرامے فلسفیانہ باتوں کی کان تھے۔ جن میں قرنوں کی ہوشمندی کے نمونے دستیاب ہوتے ہیں ڈراموں کی تیاری میں انہیں نظر انداز کرنا عقلمندی سے بعید تھا اور اس لئے شیکسپیئر نے ان باتوں کو استعمال کرنے سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ یہ خیال نہ کیا جائے کہ وہ ارادتاً اپنے ڈراموں کے مطالعہ کو ان باتوں سے بھر دیتا تھا۔ بلکہ یہ اقوال اُس کے دل نشین ہو گئے تھے۔ اور لکھنے کے وقت جو کچھ اس کے دھیان میں آتا لکھ ڈالتا۔ اور کبھی اس بات کی پرواہ نہ کرتا تھا۔ کہ آیا جو کچھ وہ لکھ رہا ہے اسی کا طبعزاد ہے یا کسی اور کا مال ہے۔ اس کام میں شیکسپیئر فقط بیج لیتا تھا اور پودے کو چھوتا تک نہ تھا لیکن گو خیال کسی اور کا ہوتا تھا۔ مگر وہ اسے اپنے الفاظ میں لکھتا اور اس قدر بلند کر دیتا تھا۔ کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے تھے کہ کیا تھا۔

اور کیا بن گیا۔ بعض اوقات جب عجلت ہوتی تھی۔ تو وہ بیچ کے ساتھ پورا کھینچ لینے سے دریغ نہ کرتا تھا۔ اظہار خیالات میں وہ اس قدر قدرت رکھتا تھا مسرو قہ خیالات پہلے سے زیادہ روشن اور نمایاں ہو جاتے تھے۔ شیکسپیئر نے

نیا پلاٹ تیار کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی ناولوں، نظموں، تاریخوں بلکہ مروجہ ڈراموں سے بلا تکلف پلاٹ لے لیتا ہے۔ لیکن جب انہیں ڈرامے کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ تو کچھ اور ہی چیز بن جاتے ہیں۔ جب محققین ڈرامہ کو شیکسپیئر کے ڈراموں میں کوئی ایسی کہانی ملتی ہے۔ جس کا سراغ انہیں کسی پہلے مصنف کی کتاب میں نہ ملے۔ تو وہ نہایت دلجمعی سے تحقیقات جاری رکھتے ہیں۔ کیونکہ انہیں یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن اصلی کہانی مل کر رہے گی۔

شیکسپیئر نے اپنے ڈراموں میں پندرہ ہزار الفاظ سے کام لیا ہے انگریزی لٹریچر میں کسی مصنف نے اس قدر الفاظ استعمال نہیں کئے۔ ملٹن کو اس لحاظ سے خاص امتیاز حاصل ہے۔ مگر اس کے لغات کی تعداد ۸ ہزار الفاظ سے زیادہ نہیں۔ شیکسپیئر نے جو مختلف اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ وہ خاص توجہ کی مستحق ہیں۔ کیونکہ انہوں نے انگریزی زبان میں ایک نیا باب کھول دیا ہے۔ قانون۔ طب۔ جراحی۔ کیمیا۔ جنگ۔ جہازرانی۔ موسیقی۔ ورزش کھیل۔ جادو وغیرہ کی اصطلاحات اس طرح بلا تکلف لکھتا چلا جاتا ہے۔ گویا اس نے ہر ایک پیشہ میں ایک عمر صرف کی ہے۔

اس کی (سانٹ)، غزلوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایکٹر کا پیشہ جو اس وقت معیوب سمجھا جاتا ہے اس کا داغ اس کے سینہ میں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکا۔ وہ اس کام کو چھوڑ کر سٹیٹ فورڈ میں جا بیٹھا۔ اس

سے مجال انکار نہیں۔ کہ شکسپیئر نے لنڈن کو بڑی خوشی سے چھوڑا۔ کیونکہ بن
جانسن کی طرح وہ پبلک کی رائے کو حقیر نہ سمجھتا تھا۔ اور ان لوگوں کے منہ
سے اپنی تعریف سننا پسند نہ کرتا تھا۔ جو اپنے آپ کو ایک ایکٹر سے بلند
تر حیثیت کا سمجھتے تھے۔ شکسپیئر کی ٹریجڈیوں کو سلسلہ تصنیف کے لحاظ سے
دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کلام بتدریج زوردار ہوتا چلا گیا ہے۔
اس نے ٹریجڈی مارلو کی نقل کرنے سے شروع کی۔ ٹائٹس اینڈ رائیکس اور شاہ
ہنری میں مارلو کی نقل کا عکس اس قدر زبردست ہے کہ اکثر نقادوں نے باوجود
اندرونی اور بیرونی شہادتوں کے ان کی تصنیف کو مارلو سے منسوب کیا ہے
لیکن مارلو کا اثر رچرڈ دوم ــ رچرڈ سوم ـ ہیملیٹ اور میکبتھ میں بالکل مفقود
نظر آتا ہے۔ یہ نہایت اہم بات ہے کہ رچرڈ دوم میں کامک عنصر نام کو نہیں
اور رومیو جیولیٹ اس کا پہلا ڈرامہ ہے جس میں شکسپیئر نے سنجیدہ اور مذاقیہ
باتوں کو ایک ہی کہانی میں پہلو بہ پہلو درج کرنے کی جرأت کی ہے اس کی بڑی
ٹریجڈیاں جن سے اس کی پختہ مغزی کا پتہ ملتا ہے ابتدائی کاوشوں کی نسبت
زیادہ خوفناک باتوں کی حامل ہیں۔

شکسپیئر کا ہر ڈراما سوز و گداز بیم و رجا اور بلند خیالی کا ایک بے پایاں
دفتر ہے۔ اس کے مطالعہ سے انسان کا دل تعجب، خوف ولولہ، اور جوش
سے معمور ہو جاتا ہے وہ تبسم، رنج قہقہہ اور گریہ کے مناظر اس انداز سے
پیش کرتا ہے کہ دنیا بھر کا لٹریچر اس کا جواب پیش کرنے سے عاجز ہے وہ
خوفناک طاقتیں جنہیں وہ متحرک کرنا چاہتا ہے۔ اس کے ایک اشارہ پر
بجلی کی سرعت اور طوفان کی شدت سے کمربستہ ہو جاتی ہیں۔ اور وہ فطرت کے
بے حس مناظر کے پردہ میں جذبات انسانی کی جھلک دکھا کر دیکھنے اور پڑھنے

والے کو مبہوت کر دیتا ہے۔ دل کا کوئی جذبہ ایسا نہیں جس پر شکسپیئر نے روشنی نہ ڈالی ہو اس میں ممکن ہے کچھ مبالغہ ہو مگر یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ جن اور پریوں کو سٹیج پر لا کر قلب انسانی میں قیامت کا ہیجان پیدا کرنا اسی کا حصہ ہے اور اس میدان میں کوئی اس کا مدمقابل نہیں۔ معرکہ جنگ کے تند اور پرشور ہنگامے، بہادروں کے شجاعانہ نعرے۔ دست بدست کشمکش اور وحشیانہ تعاقب اس کے متعدد ڈراموں میں اس اسلوب سے لکھے گئے ہیں کہ سٹیج ہو بہو میدان جنگ کا نمونہ بن جاتا ہے۔ اس سے بھی سنسنی خیز پیدا کرنے والے وہ مناظر ہیں جن میں شکسپیئر ان اشخاص کو سٹیج پر لاتا ہے جو صرف جوش شجاعت سے مست ہو کر تلوار نہیں نکالتے۔ بلکہ محض عزت اور آبرو کے لئے جان پر کھیل جاتے ہیں۔ اس طرح جب عورتیں اور بگڑے دل حضرات زبان کی تلواریں لے نیام کرتے ہیں تو ان کے حملوں سے کہیں پناہ کی صورت نظر نہیں آتی۔

لیکن اگر شکسپیئر کو جذبات بہیمہ کی نمائش میں ید طولیٰ حاصل ہے تو عشق و محبت اور راز و نیاز کی باتوں میں بھی وہ اپنا جواب آپ ہی ہے۔ جب وہ اس طرف نگاہ اٹھاتا ہے تو محبت سے بریز دل اپنی تمام بے تابیوں، حسرتوں اور ارمانوں کے ساتھ اس کے سامنے تڑپنے لگتا ہے شب فراق کے کٹھن لمحے رقیبوں کی ناقابل برداشت سازشیں اور یار و اغیار کے دل خراش طعنے عین مشرقی غزل کے رنگ میں ڈوب کر لکھتا ہے مگر ڈرامہ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔

اس کے ڈراموں کی اہم ترین خصوصیت جو انہیں فطرت کا آئینہ بنا دیتی ہے یہ ہے کہ وہ قسمت کے فیصلہ کو جا بجا ممتاز کر کے انسان کی بے بسی کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔ اسی لئے وہ معمولی واقعات سے نہایت غم ناک نتائج پیدا

کرتا ہے۔ شیکسپیئر کا شاعر کی حیثیت سے یہ مذہب تھا کہ ایک نامعلوم طاقت جسے قدرت۔ قسمت اور اتفاق کہتے ہیں۔ فانی انسان کے تمام اعمال کی عنان اپنے ہاتھ میں لئے ہے دنیاوی جدوجہد کے مختلف کرشمے اپنے اپنے وقت پر خود بخود ظہور میں آتے ہیں۔ کوئی انہیں بدل سکتا ہے نہ روک سکتا ہے بعض اوقات اس کا دل ذقت اور قسمت کی ستم آرائیوں سے جل اٹھتا ہے اور اس کی آہ سوزیاں کا دھواں ڈراموں کے کسی نہ کسی سین میں نمودار ہوتا ہے اس طرز خاص میں بھی تغزل چھپا ہے مغربی نقاد شیکسپیئر کی اس خصوصیت کے بہت مداح ہیں۔

جنس لطیف کے حیاں گسل غم والم فلک کے ستائے ہوئے شاہوں اور وزیروں کے حسرت بھرے دل کی کیفیت کا احساس اس سے زیادہ کسی شاعر نے نہیں کیا۔ شب مہتاب کے منظر پیش کرنے سے اس کا دل کبھی سیر نہیں ہوتا اور رزم کے محشرستانوں میں بھی ماہ کامل کی بہار تلاش کرتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ باوجود اس قدر بلند آہنگ سین لکھنے کے وہ دلگداز باتوں پر جان دیتا تھا۔ خصائل نگاری میں اس کا خاص رنگ ہے شیکسپیئر کے کیرکٹروں پر بیسیوں کتابیں لکھی گئیں ہیں حسن وعشق کی سب سے زیادہ چھیڑ چھاڑ۔ اس کے ڈرامہ "بارہویں شب"[1] میں ہے اور "طوفان"[2] "اور "خواب شب برشگال"[3] خوبصورت مناظر سے مالامال ہیں اس نے اکثر ڈراموں میں ٹریجڈی اور کومیڈی کے عناصر کو مخلوط کر کے نقادوں کو اعتراض کا موقع دیا ہے۔ بعض ماہرانِ فن نے منطق کے زور سے شیکسپیئر کو حق بجانب

---

۱۔ TWELFTH NIGHT

۲ THE TEMPEST

۳ A MID SUMMER NIGHT'S DREAM

قرار دینے کی کوشش کی ہے لیکن یہ فعل فن کے لحاظ سے روا نہیں گو اس کا ارتکاب شکسپیئر ہی نے کیوں نہ کیا ہو۔

بنظر غائر دیکھا جائے تو شکسپیئر کی حیثیت ایک چابکدست مدیر سے کچھ ہی زیادہ معلوم ہوتی ہے جو کہیں سے خیالات اڑاتا ہے اور کہیں سے پلاٹ لے کر ایک نہایت دل پسند گلدستہ تیار کر دیتا ہے۔ جس کی دلآویز خوشبو سے سب مست ہو جاتے ہیں۔ اور کسی کو یہ پوچھنے کا ہوش نہیں رہتا کہ ان پھولوں کے لئے کس کس چمن کی گل چینی کی گئی ہے۔ شکسپیئر یونانی سے بے بہرہ تھا۔ اور اس لئے ادبائے یونان کے وضع کردہ اصول و قواعد سے مستفیض ہونے کا اُسے کبھی موقع نہ ملا۔ اس لئے اتحاد ثلاثہ کا اس کے ڈراموں میں۔۔۔۔ کوئی التزام نہیں اور بعض ڈراموں میں وہ ایکٹ اور سین کی ترتیب بھی مناسب طور پر نہیں کر سکا۔ اور ان واقعات کو جو آئندہ ظہور میں آئے ماضی سے مدغم کر گیا ہے۔ علاوہ طوالت کے یہ بھی وجہ ہے کہ اس کے ڈرامے جب کبھی سٹیج پر لاتے ہوتے ہیں تو ان میں بہت کچھ ردوبدل اور تخرجہ و تعمیہ کرنا پڑتا ہے انہیں نقائص کو رفع کرنے کے لئے شکسپیئر کے ڈرامے لنڈن میں از سرِ نو مرتب ہو رہے ہیں۔

۱۔ ڈراموں کی طوالت اور ضخامت کے متعلق شیکسپیئر اپنی اقتصار رائے سے کام لیتا تھا۔ اور سٹیج اور ایکٹروں کی سہولت کو نظر انداز کر دیتا تھا۔ اس کے معاصرین نے سٹیج پر ڈراما ہونے کے وقت کو ۲ ۔ ۲½ یا زیادہ سے زیادہ ۳ گھنٹے بیان کیا ہے۔ اس کے مطابق شکسپیر کا کوئی بڑا ڈراما کانٹ چھانٹ کے بغیر سٹیج نہ ہو سکتا تھا۔

۲۔ شکسپیئر کے ڈراموں کا عروج (کلائمکس) تیسرے ایکٹ سے شروع

ہوتا ہے۔

۳۔ بحیثیت ایکٹر کے شکسپیئر قابل ذکر نہیں ہمیشہ چھوٹے چھوٹے پارٹ کرتا تھا۔ اور کسی کو معلوم بھی نہ ہوتا تھا۔ کہ کون سٹیج پر کھڑا ہے" جیسے پسند ہو[1]" میں آدم کا اور " ہیملٹ[2]" میں روح کا پارٹ اکثر اس کے سپرد ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی پایا جاتا ہے کہ اس نے بن جانسن کے ایک ڈراما میں پارٹ کیا۔

۴۔ "عشق[3] رائیگاں" صرف ایک ہی ڈراما ہے جس کا پلاٹ کسی سے مستعار نہیں لیا گیا۔

۵۔ "ونڈسر کی خوش باش[4] بیویاں" واحد کومیڈی ہے جس کا سین پلاٹ انگلستان میں رکھا گیا ہے۔

---

۱ AS YOU LIKE IT

۲ HAMLET

۳ LOVE'S LABOUR LOST

۴ THE MERRY WIVES OF WINDSOR

"آپ کا سوال یہ ہے کہ شکسپیئر کا مقام میری نظر میں کیا ہے؟ اول تو یہ کہ شکسپیئر کوئی نظریاتی (یا جمالیاتی) مسئلہ نہیں (کہ ہم معاشرے میں یا کسی صدی میں اس کا مقام ڈھونڈنے کی کوشش کریں) شکسپیئر ایک مصنف تھا ایک لکھیک تھا۔ گلوب تھیٹر میں ایک اداکار/منشی کی حیثیت سے نوکر تھا۔ جس سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ اپنی کمپنی کے اخراجات اور فنی لوازمات کو سامنے رکھتے ہوئے ایسے کھیل لکھے کہ وہ دیکھنے والوں کے لئے تفریح کا سامان ہوں۔

مجھے شکسپیئر سے اس لئے لگاؤ نہیں کہ وہ دنیا کے عظیم ترین مصنفوں میں سے ہے۔ اس لئے بھی نہیں کہ وہ ایک آفاقی مفکر ہے، بلکہ اس لئے کہ وہ میری غمخواری کرتا ہے، مجھے سہارا دیتا ہے، میری پژمردگی کو دور کرتا ہے۔ مجھے اپنے آپ سے باہر نکال دیتا ہے۔ میں جب اس کے پاس جاتا ہوں، وہ میری ہمت بڑھاتا ہے۔

مجھے شیکسپیئر پڑھتے ہوئے آج بھی وہ سنسنی محسوس ہوتی ہے، جو میری ریڑھ کی ہڈی کو کچھ دیر کے لئے جھنجھنا دیتی ہے۔ یہ میرا وہ ذاتی پیمانہ ہے جس سے میں گویا وجدانی اور غیر وجدانی چیزوں میں تمیز کرتا ہوں، (بہت بڑھیا گوریکی کلیان سنتے ہوئے بھی کبھی کبھی یہ جھنجھناہٹ محسوس کرتا ہوں) اُس کے بہت سے کھیل میں نے کئی بار پڑھے ہوں گے مگر ہر بار جیسے ہی شروع کرتا ہوں اس کے کردار صفحوں سے اٹھ کر باہر نکل آتے ہیں اور سٹیج پہ بیٹھنا، چلنا پھرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہیملٹ، اوتھیلو، شائیلاک، لیئر، اینجلو۔ اداکار کے لئے جوش و خروش کا چیلنج شیکسپیئر کا یہ ایک ایسا کمال ہے کہ اس نے ایسے کردار تخلیق کئے کہ چھوٹا بڑا ہر اداکار ان کو اپنانا چاہتا ہے۔ ان پہ اپنی چھاپ ثبت کرنا چاہتا ہے، (لیکن اس نبرد آزمائی میں بیشتر اوقات اداکار ہی پچھاڑ کھاتا ہے) وہ ہر عمل میں اداکاروں کی کارکردگی کے اعلیٰ معیار کا سب سے بڑا پیمانہ ہے، یہ بات صرف انگریزی بولنے والے ملکوں تک ہی محدود نہیں، روس میں یا اٹلی میں، مصر میں یا یونان میں، تقریباً ہر جگہ اداکار اس کوشش میں رہتے ہیں کہ وہ شیکسپیئر کے مسلّمہ کرداروں کو خوبی سے انجام دیں اور کچھ نہ ہو تو کم از کم ان کو گرفت میں لینے کی کوشش کریں۔

یونانی المیہ کو سنبھالنا بھی کم ہمتی کا کام نہیں، لیکن یونانی المیے میں تمام لوگ ایک طرح سے غیر انسانی اور مافوق الفطرت ہیں۔ شیکسپیئر کے کھیل کے سب افراد جیتے جاگتے انسان ہیں جن پر حالات اور ماحول کا تھپیڑا پڑتا ہے۔

ذرا غور کیجئے! تقریباً چار سو سال ہونے کو آئے اور شیکسپیئر کے ڈرامے مسلسل سٹیج ہو رہے ہیں اور سوائے سترھویں صدی کی چند دہائیوں کے ان کے تسلسل میں کوئی فرق نہیں آیا۔ کوئی رکاوٹ نہیں ہوئی۔ یہ بات محض روایت نہیں۔ اس میں یہ لازم ہے کہ ہر عہد اور ہر دور میں شیکسپیئر کا کھیل لوگوں کے احساسات کو جذباتی، روحانی اور جمالیاتی غذا پہنچاتے رہے ہیں۔ کچھ ایسی بات بھی ہے کہ اس کے افکار اور مفہوم ہر دور میں ایک نیا جنم لے لیتے ہیں۔ آپ نے کبھی دھیان کیا ہے کہ انگریزی میں

کتنی کہاوتیں، کتنے فقرے، کتنے بول ہیں، جو بیشتر لوگ استعمال میں لاتے ہیں۔ بغیر یہ جانے ہوئے کہ یہ شکسپیئر سے اخذ کئے گئے ہیں۔ اچھا اور یوں "نصب العین" اور "مقصد" اور "زیست" اور "موت" اور اس طرح کے بلند بانگ جذبات کو بیان کرنا ہو تو کون ہے جو اظہار کے لئے شکسپیئر کی مدد نہیں لیتا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ لالچ اور حرص اور نجاست اور کمینگی اور سفلہ پن اور بے شمار دوسری انسانی کمزوریاں کو دیکھنا ہو تو بھی اسی کے ڈراموں کی طرف رجوع کیجئے ———— وہ انسان کو کس کس حال میں دیکھتا ہے اور انسان کے اندر جو کھوکھلا پن ہے اس کی کس خوبصورتی سے وضاحت کرتا ہے۔

میں امتحان کے جوابوں میں ایسی باتیں نہیں کرنا چاہتا کہ پچاس برس کی عمر سے پہلے پہلے وہ اتنا کچھ لکھ لکھا کے واپس اپنے گاؤں چلا گیا تھا، یا یہ کہ چھتیس ڈرامے اس شخص نے لکھے جن میں بعض تقریباً ساڑھے چار پانچ گھنٹے کی مدت کے ہیں (گو یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ ابسن نے شکسپیئر سے تقریباً دگنی عمر پائی، لیکن اتنا کچھ نہ لکھا، جبر اس سے کچھ ثابت نہیں ہوتا) اور پھر شاعری الگ یا یہ کہ گلوب تھیٹر میں منشی گری کرتے کرتے اس نے زبان اور بیان کی ایسی چوٹی سر کی کہ آج تک وہاں پہنچنے میں اچھے اچھوں کی سانس پھول گئی۔

سانس سے یاد آیا کہ شکسپیئر کا کوئی پارٹ ادا کرتے ہوئے جس قدر سانس کی ضرورت پڑتی ہے، وہ شاید ہی کسی اور ڈرامہ نویس کے کام میں پڑے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ شکسپیئر معراج ہے۔ ایک ایکٹر کے کام کی، اسے ادا کرنے کے لئے جسمانی چابکدستی اور توازن اور تیاری کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی ذہنی لگن اور حافظہ کی کشادگی کی، شکسپیئر کا ٹکڑا بولتے ہوئے اگر آپ کی سانس اکھڑی یا غلط جگہ آپ نے سانس لی، تو فقرے کی لے اور نغمگی تو خیر ٹوٹے گی ہی، اس کے معنی اور متن میں بھی فرق آ سکتا ہے۔

میں اس کا قائل نہیں کہ ایک اداکار کو روزانہ اتنی ورزش اور اتنی کسرت

کرنی چاہیئے (وہ تو کسی آڑھتی کو بھی کرنی چاہیئے اگر آپ کو ڈنڈ پیلنے کا شوق ہے، تو اسے ضرور پورا کیجئے، آپ کا ڈاکٹر بھی آپ سے خوش رہے گا) لیکن پہلی فرصت میں شکسپیئر کا کوئی پارہ پڑھ کے (پہلے اس کو سمجھ کر) ذہن میں بٹھا لیجیئے اور اس پہ کچھ عرصہ ریاض کیجیئے، تو آپ کے فن میں جلا آنے کے، امکانات روشن رہتے ہیں۔

ایک زمانے میں میں نے سمجھا تھا کہ شکسپیئر SHAKESPEARE IS THE GOD OF MY IDOLATORY مجھے کسی "صحرائی جزیرے" پہ اگر ایک کتاب کی اجازت ہو تو وہ شکسپیئر کا مجموعہ ہی ہو گا۔ اس کے بعد کوئی اور کرم کرنا چاہے اور غالب کے خطوط کی تین جلدیں بھی شامل کر دے تو عنایت ہو گی۔"

(ضیاء محی الدین کا خط راقم الحروف کے نام)
۷ جولائی ۱۹۸۸ء

"آپ نے جو یہ کہا کہ یہاں فن کا معیار بہتر نہیں ہو سکتا یا یہ کہ لوگ ایک خاص سطح کی چیز ہی پسند کرتے ہیں اور اگر کوئی بہتر چیز انہیں دکھا دی جائے، تو وہ قبول نہیں کریں گے۔ تو میں یہ ماننے کو ہرگز تیار نہیں۔ آپ کے ہمسایہ ملک کے لوگ آپ سے کسی طرح مختلف نہیں ہیں۔ غربت کا مسئلہ، ان کی سوچ، ان کے وہم سب ہمارے جیسے ہیں۔ وہاں کیوں قبول کیا جا رہا ہے اچھی چیزوں کو۔ وہاں فلم میں تجربے کیوں ہو رہے ہیں؟ ہمارے ہاں تو تصور یہ ہے کہ ہیرو بارہ گانے گائے اور ہیروئن کے گلے اتنے پھولے ہوئے نہ ہوں کہ اسے چاند سے تشبیہہ دی جا سکے، فلم کامیاب نہیں ہو سکتی۔ دراصل ہمارے ہاں یہ رویہ بن گیا ہے کہ جب کام چل رہا ہے، تو پھر مزید معیار بہتر بنانے کی کیا ضرورت ہے چیز بک رہی ہے، بس کافی ہے۔ نئی چیز یا بہتر چیز دینے کی کوشش آخر کیوں کریں۔ معلوم نہیں اس میں معاوضہ زیادہ آئے نہ آئے۔ دراصل بہتر معیار کی صورت میں کہ چیزوں کو ان کی اصل میں دیکھا اور پرکھا جائے۔ یعنی آپ دیکھئے کہ ڈرامے کی جان تصادم میں ہے یونانی المیے سے لے کر اس کے بعد کی تین ہزار سال کی تاریخ دیکھ لیجئے، ٹکراؤ تبھی ہوتا ہے جب ایک خیال کا دوسرے سے، ایک کردار کا دوسرے سے، ایک نظریئے کا دوسرے نظریے سے تضاد ہو۔ ہم یہاں تضاد کیسے پیدا کریں۔ ہم تو کسی ذات، پیشے کا نام بھی لے دیں تو بے حرمتی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں معیار کیسے بڑھ سکتے ہیں؟ (گفتگو، اپریل ۸۶ء)

میرا دوست اور اردو کا جدید شاعر ایوب خاور بڑی اچھی باتیں کرتا ہے اس کی شاعری اس دور میں کیا حیثیت رکھتی ہے یہ تو آنے والی نسل بتائے گی اس کی شہرت اور جان پہچان کے لئے اس کی مشہور غزل کا شعر سنیئے۔

"جنگل جنگل اڑنے والے سب موسم
اور ہوا کا سبز دوپٹہ تیرے نام
سات سروں کا بہتا دریا تیرے نام

خاور کے ساتھ فن کے حوالے سے باتیں ہوتی رہتی ہیں وہ ضیاء محی الدین کے عاشقوں میں سے ہے۔ ۱۲ر دسمبر، ۸۷ء کی شام ہم اکٹھے ساتھ ساتھ بیٹھے علی آڈیٹوریم میں "محفل شعر و نثر" سن رہے تھے۔ معاف کیجئے سننا میں نے غلط لکھ دیا دیکھ رہے تھے۔ محفل اپنے اختتام کو پہنچی۔

کچھ دیر ضیاء صاحب سے باتیں ہوئیں پھر وہ اپنا اوور کوٹ تھامے آغا ناصر اور نعیم بخاری کے ساتھ چلے گئے۔ ہم اس ٹھنڈی اور خنک فضا میں بہت دیر خاموش کھڑے انہیں دور جاتے دیکھتے رہے۔ پھر خاور یکایک بولا۔

"یار آج کی محفل کی ایک بات بتاؤں۔ ضیاء صاحب پہ ایک نظم لکھوں گا۔ کہ ضیاء صاحب اپنے فن سے تحریر میں وہ کچھ کر دیتے تھے۔ کہ اگر لکھنے والا سنے یا دیکھے تو خود سوچنے لگے کہ یار اس کا اصل مفہوم تو یوں تھا گویا وہ حکایت کی اصل حقیقت کھول دیتے ہیں یہ بات واقعی سچ ہے۔ اور یہ خوبی فنکار کی سچائی، دیانتداری اور اس کے اپنے پیشے سے انتہائی خلوص کا ثبوت ہوتی ہے۔ اب اس کو لیجئے اکتوبر ۸۶ء میں وہ پاکستان آئے۔ میں نے اپنی تحقیق جاری رکھی، کیونکہ ان پر کتاب لکھنے کا سودا مکمل طور سے سمایا ہوا تھا۔ میں نے ایک عامیانہ سا سوال کیا۔ لیکن ان کے جواب نے

میرے سوال کی آبرو رکھ لی۔ بقول غالب
"رکھ لی مرے خدا نے میری بےکسی کی شرم"

سوال تھا
"آپ کے نزدیک زندگی کا مفہوم؟" ذرا جواب سنیئے
"ہم بھی کیا ہیں دھیان کسی کا اور سوال کس سے" "زندگی کیا ہے....؟"
"زندگی باگیری، سارنگ دیپک سوہنی" اس تک تو یہی سمجھ میں آیا ہے کہ زندگی
یاں تضاد ہی تضاد ہے، اب دیکھئے نہ خدا میں پورا یقین نہ اعمال نیک ہیں نہ جزا
میں نہ سزا میں نہ کتاب میں نہ میزان میں پھر بھی سبحان اللہ کہتا ہوں اور کوئی
آرزو کرتا ہوں تو اللہ میاں ہی سے دعا مانگتا ہوں۔

میں یہ جانتا ہوں کہ اپنی زندگی میں ہمیں دنیادار مولویوں سے چھٹکارا نہیں ملے
گا۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ دنیا سے تعاون کرنا بھی ضروری ہے آپ کی دنیا
سے بھی، یہاں کی دنیا سے بھی۔ میں صلح کا بھی قائل ہوں۔ اس لئے یہی بہتر ہے کہ
اپنا کام جس حد تک ہو سکتا ہے اچھا سے اچھا کئے جاؤں۔ اگرچہ یہ فرار ہے
تو سہی۔ ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقش پا پایا۔

اصل میں یہ سوال اس قدر گہرا ہے کہ اس کا جواب مولوی ابوالکلام آزاد
دیں۔ ابن خلدون دیں۔ ہیگل دیں یا کانٹ دیں تو کچھ سمجھ آتا ہے یوں ایسے
جوابات فراوانی سے عبدالماجد دریاآبادی یا مودودی یا سوامی پرمانند وغیرہ
قسم کے لوگوں کے ہاں مل جاتے ہیں شاید اسی لئے ہمارا ایسے لوگوں سے کبھی سمبندھ
نہیں ہوا" اچھا ہاں لگے ہاتھوں یہ کہہ دوں کہ آج کل ہمارے برصغیر میں رسالوں
میں "ستاروں" سے جو سوال پوچھے جاتے ہیں، ان میں کچھ "زندگی آپ کے لئے
کیا معنی رکھتی ہے" قسم کی بات بھی پوچھی جاتی ہے جس کا جواب اکثر محبت،

انسانی ہمدردی، پیار، آشتی، پانی کا بلبلا، ماں کی محبت، دوست کے لئے جاں
وطن کے لئے قربانی، بچے کی مسکراہٹ وغیرہ ہوتے ہیں۔
کتنے وہ لوگ خوش قسمت ہیں جنہوں نے اپنے رہن سہن میں ذہن
کے دریچے نہیں کھولے اور جنہیں زندگی کی اچھائی برائی کے صلے میں جنت اور جہنم
ہی نظر آتی ہے۔ ایک چیز کالی ہے اور ایک سفید لیکن مجھے تو زندگی ان دونوں
کے درمیان، بے شمار بھورے خاکستری رنگوں کا مجموعہ نظر آتی ہے۔

ایک مرتبہ ۱۹۷۵ء میں یعنی جب پاکستان میں ٹیلیویژن نیا نیا آیا تھا اس وقت ضیاء محی الدین کو اس کے پروگراموں کی بہتری اور ترتیب و تشکیل کے لئے بلاوا گیا تھا۔ اور پھر مارچ ۱۹۸۶ء میں انہیں ٹیلیویژن کی بیسویں سالگرہ کے موقع پر ایک پروگرام کو پیش کرنے کے سلسلے میں دعوت دی گئی۔ یہ پروگرام بعد میں چند اور نامی گرامی لوگوں کے ہاتھوں میں آگیا۔ مگر قیام لاہور اور کراچی کے دوران حسب معمول، صحافیوں نے سوالات کی بوچھاڑیں کر دیں۔

سوال:۔ ہمارے ہاں جو اس وقت تھیٹر ہو رہا ہے اس کے معیار کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔

ضیاء:۔ بات کرنے میں ہچکچاہٹ سی ہوتی ہے کیونکہ اعتراضات کی بوچھاڑ ہو گی۔ کہ جی ضیاء محی الدین باہر سے آکر بڑی ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہیں جناب یہاں رہیں تو سہی ہم میں آئیں تو سہی پھر دیکھیں گے کتنے پانی میں ہیں۔ باہر سے آکر سب اس طرح کی باتیں کرتے رہتے ہیں بجلی نہیں ہے پانی نہیں ہے۔ ہماری دقتیں کتنی ہیں یوں باتیں بڑھ بڑھ کر کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ لیکن میں تو آپ کے سوال کا حوالہ دے رہا تھا۔ کہ معیار سے بڑھ کر اگر کوئی چیز کی جائے تو لوگوں کے سر پر سے گزر جائے میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کی سوچ بہت ہی غلط ہے۔

سوال:۔ ضیاء آپ کے خیال میں ہم اس صورت حال سے کس طرح باہر نکل سکتے ہیں۔؟

ضیاء:۔ یہ جو آپ نے سوال کیا یہ اتنا بڑا اور مشکل سوال ہے میں یہ

کہوں گا۔ مجھ پر بھی پتیا اور مشکلات اکثر پڑیں۔ اور اپنے جو بھی معیار تھے۔ کم از کم انہیں میں نے برقرار رکھنے کی کوشش کی تاکہ اس میں کمی نہ آنے پائے۔ پھر آہستہ آہستہ اس میں سمجھوتہ ضرور ہو جاتا ہے۔ پھر ایک اور سمجھوتہ ہوتا ہے۔ اس سے آگے پندرہ ہزار سمجھوتے اور کرنے پڑتے ہیں۔ اور ایک وقت آتا ہے کہ ایک دم سے آنکھ کھلتی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ جیسا ہم نے سوچا تھا یہ بات تو اس سے بہت گر گئی ہے۔ میں یہاں کئی مرتبہ آیا۔ میرے یہاں سے واپس جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ کہ مجھے تھوڑا بہت خود کو یقین ہونا شروع ہو گیا تھا۔ کہ جو میں کر رہا ہوں وہ تو بڑی ٹھیک بات ہے یعنی وہ جو کہتے ہیں وہ ہڑبڑا کر اٹھا لیکن کچھ دنوں اور ہفتوں کے بعد مجھ پر یہ خیال مسلط ہو گیا کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں۔ وہ بہت اعلیٰ درجے کی چیز ہے۔ میں اپنے بارے میں یہ نہیں سمجھتا کہ میں سب سے بہتر ہوں۔ بس صرف یہ کوشش کرتا ہوں کہ پہلے سے میرا کام بہتر ہو چنانچہ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ نکلا لیکن یہ سب کرنا آسان نہیں ہے۔ اب ہر شخص کام کاج چھوڑ کر بھاگ بھی نہیں سکتا یہ بھی ممکن ہے، شاید میرے لئے یہ بات اتنی مشکل نہ تھی کہ میرے وہاں پر تھوڑے بہت لوگوں سے اور اداروں سے تعلقات ایسے تھے کہ میں اپنا ایک طرح سے جو رابطہ تھا۔ اس کو میں پکڑ سکتا تھا۔ لیکن وہ لوگ جن کے پاس ایسی سہولت نہیں ہے وہ کیا کریں۔ ایک تو یہ ہے کہ اپنا معیار جو ہے اسے کس طرح گرایا نہ جائے مثلاً ناصر کاظمی بھی تو اسی ماحول میں رہتے تھے ممکن ہے۔ آپ سمجھیں کہ یہ مثال غلط ہے لیکن وہ بڑی آسانی سے کچھ درمیانے درجے کی شاعری بھی کر سکتے تھے۔ مگر انہوں نے اپنی شاعری میں نکھار پیدا کیا ان کی شاعری بہت اچھی تھی۔ اور بھی بہت سے ایسے لوگ ہیں ن۔م راشد بھی کر سکتے تھے۔ شاعر اور لکھنے والے میں بہت فرق ہے۔ کیونکہ انہیں تخیل

اور اپنی ذات کی موجودگی کی ضرورت ہوتی ہے ان کے لئے دوسرے لوگ ضروری نہیں ہیں ان کا لکھا ہوا جب تک صفحے پر نہیں آجاتا اور چھپ نہیں جاتا پھر جب داد ملتی ہے تو لوگوں سے اس کا براہ راست تعلق نہیں ہوتا۔ پرفارمنگ آرٹس میں اداکار کو لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو پیش کرنا ہوتا ہے۔ کیونکہ اداکار کو میں ابھی تک تھیٹر ہی سے منسلک کرتا ہوں ٹیلی ویژن وغیرہ تو بہت بعد کی چیزیں ہیں۔ منبع جو ہے وہ اصل میں اسٹیج اور تھیٹر ہی ہے۔ ہمارے یہاں یہ ضرور ہے کہ جب اداکار سٹیج پہ آکر اداکاری کرتا ہے۔ اسے وہیں داد اور واہ واہ مل جاتی ہے اگر وہ اس واہ واہ اور داد سے بچ جائے اور سمجھ لے کہ یہ تو لوگوں کی ایک طرح سے محبت کا نتیجہ ہے۔ یہ جو میں نے کام کیا ہے وہ کوئی ایسا نہیں ہے اگر وہ اس مقام پر کسی طرح پہنچنے کی کوشش کرے تو اس کا کام یقیناً بہتر ہوگا میں کچھ لوگوں کے بارے میں کہہ رہا ہوں کہ کسی کا نام نہیں لیتا۔ میں نے یہ ضرور دیکھا ہے جب انہیں داد ملتی ہے وہ سمجھتے ہیں واہ واہ ہم تو کمال کر رہے ہیں۔ کہ جی جب ہم فقرہ بولتے ہیں تو لوگ ہمارا منہ موتیوں سے بھر دیتے ہیں اس کا مطلب ہے وہ جو کر رہے ہیں اس کے بارے میں نہ صرف انہیں اطمینان ہے بلکہ وہ سمجھتے ہیں انہیں جو اتنی داد ملتی ہے تو ان کا کام ضرور اچھا ہوگا۔ ان دو چیزوں مثلاً کام کی اچھائی اور داد کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے۔

اشارہ اور اختصار ہی کسی آرٹ کی جان ہوتی ہے اگر میں یہ کہوں آپ جب گفتگو کرتے ہیں۔ تو اس میں وقفہ اداکاری میں گفتگو کرتے ہیں تو اس میں وقفہ یا خاموشی کا لمحہ کیوں دیتے ہیں تو آپ اس کا جواب دیں گے۔ لیکن اگر میں دوبارہ پوچھوں کہ صاحب آپ کو کہیں یہ بیماری تو نہیں ہے۔ کسی ڈاکٹر یا حکیم نے آپ کو یہ روّیہ اختیار کرنے کو تو نہیں کہا میرا مطلب یہ ہے کہ یہاں ہر ایک بات کو چھتیس ہزار دفعہ

جب تک گھوٹ کر نہ کہا جائے کسی کو سمجھ نہیں آتی ۔ تو کوئی ایسی بری بات نہیں ہے ۔ بہت سی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں ۔ بلکہ کبھی آئیں گی بھی نہیں ۔

سوال :۔ اس کی بنیادی وجہ کہیں یہ تو نہیں کہ ہمارے یہاں تربیتی ادارے نہیں جس کے باعث پرفارمنگ آرٹس کے تمام ذریعے ادب و شاعری کی نسبت بہت کمزور رہ گئے ۔؟

ضیاء :۔ ادب و شاعری کے بارے میں تو میں اظہار خیال کا اہل نہیں ہوں گو کہ مجھے شوق ہے اور میں اسے پڑھتا رہتا ہوں ۔ لیکن میرا پیشہ نہیں ہے اس لئے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ پہلی بات سے میں سو فیصد اتفاق کرتا ہوں کہ یہاں پر کوئی تربیتی ادارہ نہ ہونے کے باعث یہ ہوا ۔ لیکن بغیر تربیتی اداروں کے اتنے اچھے اتنے مناسب باصلاحیت لوگ یہاں موجود ہیں اور انہوں نے غلطیاں کر کے بغیر کسی کے بتائے خود سیکھا ہے ۔ یہ تو ایک فطری جوہر ہوتا ہے اگر یہ نہ ہو تو آپ لاکھ کچھ کر لیں میں بھی تربیتی اداروں میں گیا ہوں بے شمار لوگوں کو جانتا ہوں بلکہ ہمارے ساتھ چودہ ہزار چار سو انچاس اور لوگ بھی تھے لیکن اب ان میں سے کئی بیمہ کمپنی میں کام کر رہے ہیں کیونکہ جب تک فطری جوہر نہ ہو تو بات نہیں بنتی ۔ بنیادی طور پر آپ کی آواز وہی رہتی ہے جو آپ کو ورثے میں ملی ، یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ جب بخاری صاحب کہتے تھے کہ کھرج لگاؤ تو اس سے آواز اچھی ہو جائے گی ۔ یہ غلط ہے جن کی ہو جاتی ہے وہ غیر فطری طور پہ ہوتی ہے پھر جب ان پہ کوئی جذباتی دباؤ پڑتا ہے تو ان کی آواز کی اصلیت نکل آتی ہے اسی طرح انسان اگر اپنی زبان چھوڑ کر انگریزی بڑے سٹائل میں بول بھی لے تو جہاں اس پہ کوئی جذباتی کیفیت طاری ہوتی ہے وہ اپنی اصل زبان میں شروع ہو جاتا ہے اب میں یہ

سمجھتا ہوں کہ اگر میں قاف صحیح حلق سے نکال سکوں تو میں درست زبان بول رہا ہوں لیکن چونکہ میں مصنوعی انداز میں بول رہا ہوں اس لئے یہ تصنع زیادہ دیر برقرار نہیں رہے گا۔ اسی طرح ادارے کی تربیت زیادہ اثر نہیں دکھا سکتی اگر آپ میں بنیادی جوہر نہیں ہے اداکار جب تک مکمل طور پر آرام نہیں کرے گا وہ کبھی فطری انداز میں پرفارم نہیں کر سکتا،

ہمارے ہاں اجسام سے افکار کا" مفہوم سے گفتگو کا پیوند نہیں ہوتا۔ یہ پیوند تبھی ہو گا جب فن کار بالکل سکون سے اداکاری کرے گا۔

سوال :۔ کیا آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے ہاں کسی صورت میں فن کے تربیتی ادارے قائم کرنے کے لئے فضا سازگار نہیں ہے۔ کیا ہمارے کلچر میں کوئی ایسی بندش موجود ہیں ؟

ضیاء :۔ پہلے آپ اپنے کلچر کا تعین تو کیجئے آپ کی ثقافت میں منشی پریم چند شامل ہے یا نہیں ؟ یا یہ کہ کیونکہ وہ ہندو ہے۔ اس لئے اسے چھوڑ دیا جائے آپ کوئی راگ اس لئے نہ گائیں کہ اس کا کوئی لفظ ہماری زبان کا نہیں ہے۔

ہمارے یہاں تو ابھی تک اس کا تعین نہیں ہوا۔ کہ کس جماعت تک انگریزی پڑھائی جائے ہم ان مسائل میں الجھے ہوئے ہیں کہ دو عورتوں کی گواہیاں ایک مرد کے برابر ہیں یا نہیں، چادر سر پر نہ ہو تو لڑکی بے حیا ہے یا نہیں۔ اصل میں یہ سب اس قدر الجھے ہوئے مسائل ہیں کہ اس پر بحث کے لیے وقت چاہیئے۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جنہیں ہر وقت اپنے وطن کا خیال رہتا ہے فیض کا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔

دیارِ غیر میں محرم اگر نہیں کوئی
توفیض ذکرِ وطن اپنے روبرو ہی سہی۔

ہم اپنے خمیر اور مٹی کو کیسے بھلا سکتے ہیں اگر ہم میں سے کوئی بیرون ملک اپنے ملک کی بڑائی کرتا ہے یا اس پر تنقید کرتا ہے تو محبت کی وجہ سے کرتا ہے میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ دوغلا نہ ہوں۔

دوغلا نہ اِدھر کا ہوتا ہے نہ اُدھر کا۔ لیکن اگر ملک کی کسی بات کو ناپسند کر دیا تو اس سے کیا قیامت ہو گی ہم نے ایک ہوّا سا بنا لیا ہے کہ اگر یہ کہہ دیا تو ملک خدانخواستہ ختم ہو جائے گا یہ رویہ صحت مندانہ نہیں ہے۔

سوال۔ اگر یہاں سہولتیں میسر آ جائیں تو کیا آپ پاکستان آنا پسند کریں گے؟

ضیاء:۔ میں ہمیشہ سے یہی کہتا آیا ہوں کہ دو وقت کی روٹی کا اگر مناسب انتظام ہو جائے تو ضرور واپس آؤں گا۔ لیکن اس پیشے سے میں کما نہیں سکتا۔

باہر یہ صورتحال نہیں ہے یہاں ٹیلی ویژن سے منسلک ایک بڑے بادشاہ کا فقرہ میں نے سنا ان سے کسی فنکار نے شکایت کی، صاحب ہمیں اتنا تو دیجئے کہ ہم زندہ رہ سکیں اس پر وہ فرمانے لگے ہم کب کہتے ہیں آپ ٹیلی ویژن کو ذریعہ معاش بنائیں ٹی وی کا مقصد آپ کو روٹی دینا نہیں ہے

اب اس کے بعد اور کیا کہا جائے ۔

سوال ۔ آپ کے انگلستان جانے کی اصل وجہ روٹی، کپڑا اور مکان تو نہیں تھی؟

ضیاء (مسکراتے ہوئے) ضرور ہو گی ۔

سوال ۔ آج کل جو وہاں جدید تھیٹر رائج ہے اس کے بارے میں بتائیے ۔

ضیاء ۔ ہم عصر تھیٹر میں ہمیشہ کی طرح نئے سے نئے تجربات ہوتے رہتے ہیں۔ بڑھیا سے بڑھیا لکھنے والے پیدا ہوتے رہتے ہیں ہر پانچ سال بعد ایک نئی کھیپ آ جاتی ہے ۔ انگلستان میں جہاں میں رہتا ہوں یا امریکہ میں جہاں یہ روایت بہت ہے اتنے چوٹی کے اداکار ہیں کہ ان کی گنتی نہیں ہوتی اس کے باوجود نئے لوگ آتے رہتے ہیں کیونکہ کام کی ایک طرح سے ترقی ہوتی رہتی ہے، ہوتا یہ ہے کہ موقع حاصل کرنے کے لئے یہ جو جوان اور نئے لوگ ہیں یہ طرح طرح کی ایسی چیزیں کرتے ہیں ۔ وہ محنت کر کے آگے بڑھ رہے ہیں ہمارے یہاں بہت کہا جاتا ہے نئے چہرے ۔ چہرہ اہم نہیں ہے ۔ صلاحیت اہم ہے یہ میں نے وہاں کبھی نہیں دیکھا کہ ایک باصلاحیت اداکار کو نظر انداز اس لئے کر دیا گیا کہ ان کے چچا یا بڑے افسران کے کچھ لگتے لگاتے نہیں تھے ۔

سوال ۔ آج کل آپ کیا کر رہے ہیں انگلستان میں؟

ضیاء ۔ میں سنٹرل ٹیلی ویژن اور چینل نمبر فور پر پروڈکشن کر رہا ہوں کبھی کبھی اداکاری کرنے کا بھی موقع مل جاتا ہے زیادہ تر ٹی ۔ وی پر پروڈکشن اور ہدایت کاری کا کام کر رہا ہوں ۔

سوال ۔ سٹیج پر بھی آپ کام کر رہے ہیں؟

ضیاء: ابھی موقع نہیں ملا دو برس سے تو نہیں کیا کام سٹیج پر اور ایک عرصے کے بعد جب سٹیج پر آیا تو بالکل حواس باختہ ہو گیا تھا۔ سٹی گم ہو گئی تھی۔ شیکسپیئر کو کرنے کے لئے بہت سائنس چاہیئے مجھے زنگ لگ چلا تھا، سوچا ہے دوبارہ تیل دیا جائے۔

سوال۔ کیا آپ مستقبل میں بھی ایسے آتے رہیں گے؟

ضیاء: (قہقہے کے ساتھ ہنستے ہوئے) کیا اچھی بات کی آپ نے کاش کہ ایسا ہو کہ ہمیں مستقبل میں بھی بلاوے آتے رہیں لیکن میں ہنس کر اس لئے کہہ رہا ہوں کہ جس کام کے لئے بلوایا گیا ہے جب وہ ہو اس پر اس قدر لے دے ہو کہ خوب درّے کوڑے پڑیں۔

ہم خستہ تنوں سے محتسبو! کیا مال منال کا پوچھتے ہو
جو عمر سے ہم نے بھر پایا سب سامنے لائے دیتے ہیں

دسمبر ۱۹۸۶ء میں ضیاء محی کے ساتھ لاہور کینٹ میں محمود الٰہی صاحب کے گھر خوب باتیں ہوئیں۔ اداکاری کے ساتھ ساتھ ان کی ہدایت کاری بھی موضوع بنی۔ انہوں نے اسٹیج پر کئی ڈرامے خود ڈائریکٹ کئے۔ لاہور اور کراچی میں ان کے ڈراموں کا ذکر ہو چکا ہے لیکن ان کے ایک ڈائریکٹ کئے ہوئے ایسے ڈرامے کا ذکر سنیئے۔ جو انہوں نے مالٹا میں کیا۔ یہ کھیل ناروے کے معروف اور منفرد ڈرامہ نگار ابسن کا تھا۔

"سن ۱۹۷۴ء میں جب میں پی آئی اے آرٹس اکیڈمی کے وفد کو لے کر مالٹا گیا۔ تو اس زمانے میں ( PAUL J. NAUDI )، جو نیشنل تھیٹر کا نگران بھی تھا، اور اس کے علاوہ جو ثقافتی سرگرمیاں ہوتی تھیں اس کا کرتا دھرتا بھی وہی تھا۔ تو ایسے ہی کھانا کھاتے ہوئے سمندر کے کنارے ہم بیٹھے

ہوئے تھے۔ اور مختلف تھیٹر کے سلسلے میں باتیں کر رہے تھے کہ میں نے اس سے کہا کہ میں یہاں پر کوئی ڈرامہ ڈائریکٹ کرنا چاہتا ہوں اس پر اس نے کہا "ہیں؟ اور بتایا کہ یہاں پر تھوڑے سے بہت ڈرامے یہاں کے لوگ کرتے رہتے ہیں مالٹا اگرچہ ثقافتی اعتبار سے اتنا مضبوط تو نہیں ہے۔ مگر چونکہ تھیٹر کی روایت جس ملک میں بھی ہوتی ہے وہاں کے فنکاروں کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ وہ بھی کلاسیکی کام کریں۔ تو شائد اس لئے ناروے کے مشہور ڈرامہ نگار ابسن IBSON کا کھیل کرنے پر راضی ہو گئے۔ تو میں نے اس کا کھیل اچنا۔ مالٹا چھوٹا سا ملک ہے مگر ان کی اپنی آڈئینس ہے۔ وہ اکثر دو تین ہفتے کے لیے ڈرامہ کرتے ہیں۔ تو ابسن کا یہ کھیل کوئی پانچ روز وہاں پہ چلا۔ خیر میں تو پہلی رات کے بعد واپس آگیا۔ یوں بھی میرا قیام وہاں پانچ ہفتے کا تھا یہ ساری ریہرسل میں نے پانچ ہفتوں میں کروائی۔"

گفتگو اپریل ۸۶ء

VALLETTA, Wednesday.

THE November Production of the 'Atturi Theatre Group' at the Phoenicia Playhouse, Hotel Phoenicia is **Hedda Gabler** by Henrik Ibsen, one of the great masters of the Theatre. This play is amongst his best and as such it stands out amongst the greatest plays written in the last century.

When in London, Ibsen was asked to explain his play, **Hedda Gabler**, which was at the time being presented on the stage there. He said "In this play I have not tried to deal with so called 'problems'. My main object was to portray human beings, human moods, human destinies as conditioned by certain relevant social conditions and attitudes".

The cast is made up of the best elements Malta can offer to the stage: Karmen Azzopardi, Paul Xuereb, Antoinette Soler, Charles Arrigo, Godwin Scerri, Marcelle Castillo and Mary Cockson Jones.

To secure the best possible success, Zia Mohyeddin, the internationally known actor-director has been invited to Malta to direct this formidable cast in this excellent play.

Zia Mohyeddin comes from Pakistan. He lives in Karachi where he is the director of the PIA Arts Academy and Governor of the Pakistan National Council of Arts.

**Hedda Gabler**, under the able direction of this versatile director will open at the Phoenicia Playhouse on Friday, November 1 and will run until November 5.

Booking is open for the general public at the Hotel Phoenicia and at the Rediffusion Branch Tower Road Sliema.

Pictured above is director Zia Mohyeddin with members of the cast.

# INTERNATIONAL DIRECTOR FOR IBSEN PLAY

By a Staff Reporter

The internationally known actor-director, Zia Mohyeddin, has been invited to Malta for the sole purpose of directing a formidable cast in Henrik Ibsen's masterpiece "Hedda Gabler" — the November production of the Atturi Theatre Group at the Phoenicia Playhouse, Floriana.

Zia Mohyeddin, who comes from Pakistan, made his name in the theatre in England and America when he starred in the dramatization of E.M. Forster's immortal novel "A Passage to India" in 1960. He has since played leading parts in a score of television plays on both sides of the Atlantic, apart from making movies. Some of his films include "Lawrence of Arabia", "Sammy going South", and "Sailor from Gibraltar".

Mr. Mohyeddin now lives in Karachi, where he is the director of the P.I.A. Arts Academy and governor of the Pakistan National Council of Arts. His show on television, "The Zia Mohyeddin show", which he kept up for a couple of years, made a tremendous impact in Pakistan for its style and freshness. He is now working on a new one-man show.

Malta's leading actors and actresses have been cast for this play. The lead is being played by Karmen Azzopardi, a fitting actress for such a demanding role. With her are Paul Xuereb, Antoinette Soler, Charles Arrigo, Marcelle Castillo, Godwin Scerri and Mary Cockson Jones.

Hedda Gabler is a play about an egotistical woman. This is in itself remarkable for in the late 19th century playwrights and novelists dealt with egotistical men and selfless women. Whilst a man's egotism drives him to accomplish much, Hedda's drives her to isolation and self-adoration. She has no source of richness in herself and must constantly seek it in others, so that her life becomes a pursuit of sensations and experiment; her hatred of bearing a child is the ultimate expression of her egotism.

"Hedda Gabler" opens at the Phonicia Playhouse on November 1 and will run for five consecutive nights to November 5. All shows start at 7.30 p.m., with Monday, November 4, being a Gala Performance.
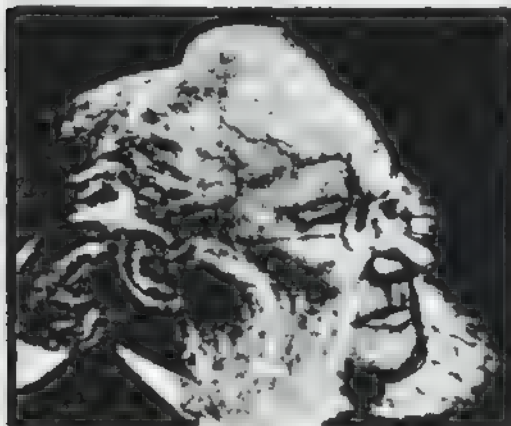
Ibsen (left) and Zia Mohyeddin (right).

HENRIK IBSEN

ZIA MOHYEDDIN

# Hedda Gabler — a challenging role

NEXT FRIDAY is the opening night of the Atturi Theatre Group's November production of Henrik Ibsen's "Hedda Gabler" considered one of the best of the great Norwegian's plays.

Ibsen's Hedda Gabler is first cousin to Flaubert's Emma Bovary. Though they seem opposites in temperament — Emma a sensualist, and Hedda apparently frigid — both typify romanticism gone rotten, lilies that fester.

In fact "Hedda Gabler" is the story of a general's daughter. A woman full of masculine protest, a manhunter who remains seemingly cool. Horses — pistols — rakes like Ejlert Loveborg, an old admirer, or Judge Brack — all these are in Hedda's line; but merely as pawns to play with.

To play this most demanding role, the *Atturi* have cast Miss Karmen Azzopardi, who admits it is one of the greatest challenges offered her during her stage career.

With her is a cast composed of the top dramatic actors in Malta Paul Xuereb, Antoinette Soler (this being Mrs. Soler's second Ibsen play, the first being "A Doll's House" in which she played the lead), Charles Arrigo, Godwin Scerri, Marcelle Castillo and Mary Cockson Jones.

To secure the best possible success, Zia Mohyeddin, the internationally known actor-director, has been invited to direct this formidable cast in this excellent play.

Mr. Mohyeddin comes from Pakistan. He lives in Karachi, where he is the director of the PIA Arts Academy and Governor of the Pakistan National Council of Arts. His vast experience ranges from his own motherland to Broadway through London's West End where he starred in leading roles both on stage and on screen. In his own country, the Zia Mohyeddin Show is the name of one of the most controversial and impact-making programmes on television.

"Hedda Gabler", under his direction, will run for five nights at the Phoenicia Playhouse from next Friday to November 5, next Monday's being a gala performance. All shows start at 7.30. Booking is available both at the Hotel Phoenicia and at the Rediffusion Branch, Tower Road, Sliema.

As in the last *Atturi* production, the foyer of the Playhouse will host an artist and his work. "Hedda Gabler's" nights will be dedicated to Esprit Barthet.

KARMEN AZZOPARDI

NEXT
FRIDAY
OPENING NIGHT
OF
**HEDDA**
**GABLER**
by Henrik Ibsen
directed by
**ZIA**
**MOHYEDDIN**
PHOENICIA
PLAYHOUSE
NOV. 1, 2, 3, 4, 5
Gala Night Monday 4
7.30

Booking:
HOTEL PHOENICIA
10.30 — 12.30
5.30 — 7.30
REDIFFUSION BRANCH
TOWER ROAD, SLIEMA
(office hours)

TIMES OF MALTA, FRIDAY, NOVEMBER 1, 1974

# THE ZIA MOHYEDDIN WAY

● Zia Mohyeddin used to have an act in which his audience was persuaded to ask him what was his greatest ambition His reply to this question was invariably, "Being able to say 'No, thank you' " — even to the most advantageous offer. Now a director of the PIA Arts Academy and one of the governors of the Pakistan National Council of Arts, and with a successful European career of acting and directing behind him, he can afford to say no whenever he likes saying so This goes to show how fortunate the Atturi Theatre Group was when Mohyeddin, during a visit to Malta last June, accepted an invitation from the Group to direct a play for them and chose Ibsen's *HEDDA GABLER* (Phoenicia Playhouse today onwards).

Nowadays he seems to prefer directing plays to acting in them, since he finds it less dissatisfying than what he calls "the sustained disappointment" of acting The ephemeral nature of the theatrical arts, together with Mohyeddin's honest determination to look at his own deficiencies rather than at his considerable artistic distinction, seem to be disenchanting him with the theatre as the sole aim of his career, a much more permanent art, writing, attracts him more and more He would like to write novels (he has in fact already published several short stories) and criticism, but is all too aware of the self-discipline and tremendous concentration required to produce writing of any worth.

Working and living in Pakistan has its great conveniences for him There he feels spoiled by the constant attention of relatives and, as befits his very senior position, can afford to hire both a cook and a chauffeur. He is obviously patriotic, but his many years of living and working in the west have made him very fond of Europe, and his cultural makeup has at least as much of the West as of the East in it. Though he has been working hard for the recognition of Pakistan's native music, he loves western composers as wide apart as Mozart and Verdi, and can think of an act in a play he is directing in terms of a sonata form

Zia Mohyeddin recognizes the importance of the role which companies like the Atturi Theatre Group play in their countries. He says that with its grit and high standards this company will eventually attract the continued patronage which will secure the financial backing necessary for its consolidation

He agrees that the Atturi can make the all-important breakthrough when they have a nucleus of full-timers, but for this to happen they would need a State subsidy and possibly help from private commercial sources.

Mohyeddin does not regret his choice of *Hedda Gabler* for the Atturi, for whom he considers it to be an excellent vehicle. What he admires above all in this great play is its economy, economy in the number of characters, plot, and even in the duration of the entire action.

He believes very strongly that the director should be an interpreter of the dramatist's intentions and should refrain from imposing on a play ideas which he thinks the dramatist ought to have had When he begins to direct a play, Mohyeddin bases himself on what he calls 'a certain melody' he has detected in it; this may change during the exploratory process of rehearsing. Above all, the director must solve the problem of how, for instance, a given actress — in this case, Karmen Azzopardi — is going to combine her own personality with the Zennui, the vulnerability, the beastliness and other characteristics of Hedda

ENTERTAINMENT:

Mr. Zia Mohyeddin (left) during his call on Mr. P. Naudi, Permanent Secretary at the Ministry of Education and Culture at the Auberge D'Aragon earlier this week.

## INTERNATIONAL ARTS FESTIVAL

Mr Zia Mohyeddin, Director of Pakistan International Airline's Arts Academy and governor of the Pakistan National Council of Arts also paid a courtesy call on Dr. J Cassar, Minister of Education and Culture, at the Auberge D Aragon

During their meeting Dr Cassar and Mr Mohyeddin discussed cooperation on general culture with an accent on the development of drama in Malta The 2nd Arts International Festival to be held during the Summer of 1975 was also discussed

بعض اوقات صرف ایک نام اپنی حیثیت کی بنا پر اپنی ذات اور ملک کی پہچان کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ ناروے کی تاریخ دیکھی جائے تو "ابسن کا نام آتے ہی پوری ڈرامے کی تاریخ نظروں میں گھوم جاتی ہے۔ ابسن نے اپنے کھیلوں میں انسانی رویوں کی جو شکلیں پیش کی ہیں۔ انہوں نے ڈرامے کو ایک نئی فکر عطا کی۔ بات چونکہ ضیا محی الدین کے ڈائریکٹ کئے ہوئے ابسن کے کھیل کی ہو رہی تھی اس لیے ناروے کا ذکر آگیا، ۱۹۸۰ء کو ناروے میں ایک فلم دکھائی گئی "شہزادی کی موت" اس فلم میں چونکہ ضیا محی الدین بھی تھے اس لیۓ اس فلم کے متعلق سعید انجم کا مضمون شامل کر رہا ہوں۔

# En prinsesses død - og kapitalismens hjelpesløshet

Av Saeed Anjum

**«En prinsesses død» ble vist på norsk TV sist mandag etter langvarig nøling p.g.a. filmens kontroversielle innhold. Den ble presentert som «feature»-film med etterfølgende debatt.**

**I enhver film vil både form og innhold formidle et budskap. Og ulike mennesker mottar budskapet på forskjellig vis.**

Jeg er ikke norsk, men jeg bor i Norge i lag med 72 000 andre utlendinger, amerikanere og vest-europeere inkludert. Siden ingen utlending var invitert til å delta i debatten som etterfulgte filmen, vil jeg forsøke å redegjøre for det budskapet jeg selv mottok.

Filmen dreide seg om et ikke kapitalistisk og ikke sosialistisk samfunn. Den var skapt av en hvit film produsent fra et kapitalistisk samfunn, han brukte sine utvalgte virkemidler til å formidle sine filtrerte inntrykk.

Budskapet er et skrik. Ropene fra en representant for kapitalismen. Hylene fra en hvit journalist. Han skriker ut sin egen manglende evne til å skaffe korrekt informasjon og eksakte svar på sine spørsmål. Men før han roper ut sin egen udugelighet, kapitalistverdenenes hjelpeløshet når det gjelder å få eksakt informasjon fra et ikke kapitalistisk, ikke sosialistisk land, formidler han de inntrykk han samlet sammen. Dette er filmens innhold.

Hvordan samlet han sin informasjon? Dette er filmens form. Filmen avsluttes med heltens, den hvite journalistens raseri. Han er rasende fordi hans autoritet, den hvite kapitalismens krav på ferske informasjon, utfordres av det samfunn han oppsøker. Hans reaksjon ville ikke vært den samme om han hadde mislykkes i å skaffe informasjon fra et kapitalistisk eller sosialistisk samfunn. Denne påstanden underbygges av den debatten som etterfulgte visningen av filmen.

De hvite debatt deltakerne betegnet filmens informasjon som «ubesvarte spørsmål». Alle var enige om å forkaste filmen. De var enige om å forkaste filmens helt, den hvite journalisten, kapitalismens representant.

Filmprodusenten forteller sannheten. Hvordan? Kanskje er han ikke sikker selv?

Hans informanter var av tre slag: 1) Hans vennskapelige kontakter, 2) kjøpte kontakter, 3) kontakter via kontakter.

Av disse aktørene framstår tre personer som de viktigste representantene for det ikke-kapitalistiske, ikke sosialistiske samfunn. De blir hovedpersoner fordi de snakker engelsk, filmens og den hvite journalistens språk, og dermed etablerer direkte kontakt med publikum.

*Marwan* (direkte kontakt): Han har kastet vrak på sitt hjemland og akseptert den kapitalistiske verden. Han har forlatt sin arbeiderklasse familie i hjemlandet til fordel for vesten. Han trenger hvite venner for å overleve. De trenger ham for å utbytte ham, som den hvite journalisten gjør i filmen. Han utnytter ham som informant for å framskaffe passende svar.

*Tidligere student ved et amerikansk universitet* (kontakt via kontakt): I motsetning til Marwan tar hun avstand fra kapitalismens verden og har returnert til sitt hjemland etter mange år. Hun er oppmerksom på lidelsene i sitt eget samfunn, hun vil delta i bekjempelse av det. Hun søker sine sosiale røtter. Hun sier det hun ønsker på sine egne premisser, ikke på premis...

*Prinsessens [illegible] venn* (kjøpt kontakt): Hun går med på å ta penger for å skaffe informasjon og bilder av prinsessen fra sitt foto-album. Men hun sier ikke alt hun vet.

Disse tre aktørene avslører tre tendenser og holdninger i den ikke kapitalistiske, ikke sosialistiske verden.

1) De underutviklede land utbyttes i vennskapelighetens navn, eller 2) en klasse betales for å utbytte og plyndre eller 3) en ny tendens: Ønske om å finne sine røtter, viljen til å forkaste kapitalismen. MOTSTAND.

Den motstanden vokser seg så sterk at selv vennen Marwan tvinges til å si: «Du forstår ikke, du kan ikke forstå». Den kjøpte informanten roper: «Ta det du har betalt for, ingen ting annet».

**Saeed Anjum (32) har vokst opp i muslimsk kultur i Pakistan. Før han kom til Norge i 1975 arbeidet han som journalist og forfatter i sitt hjemland, bl.a. har han skrevet for film og teater.**

**Nå er Anjum engasjert i «Filmgruppe 1» i Oslo. I samarbeid med Espen Thorsteinsson er han igang med et barnefilmprosjekt om likheter mellom norsk og pakistansk kultur. Tidligere har han vært ansatt som morsmålslærer og konsulent i Sosialdepartementet. Han har vært engasjert i Nasjonalkomitéen for Internasjonalt Ungdomsarbeid (NIU) og er flittig brukt foredragsholder der [illegible] innvandrerspørsmål debatteres.**

**I denne artikkelen vurderer han filmen «En prinsesses død». Dels ut fra sin erfaring som film-mann, dels på bakgrunn av sin tilknytning til muslimsk kultur.**

De hvite deltakerne i debatten som etterfulgte filmen kommenterer: «Ubesvarte spørsmål».

Filmen har avslørt hovedsvakheten til den døende kapitalistiske verden. Hovedpersonen, den hvite mannen, kapitalismens representant i et ikke kapitalistisk, ikke sosialistisk samfunn tvinges til å rope ut sin hjelpeløshet. Han klarer ikke å skaffe korrekt informasjon, eksakte svar på sine spørsmål. Han har nemlig konstruert en form for informasjon som er basert på tradisjonelle kapitalistiske forventninger. Det falt sammen. Han mistet kontrollen.

Vi skriver 1980. En av debatt-deltakerne sa at vi snakker om gammelt nytt. Det kan være nyttig å gjette på framtidas nytt.

نارویجین ٹیلی ویژن نے معروف متنازعہ فلم "شہزادی کی موت" کو بالآخر ۲۲ ستمبر ۱۹۸۰ء کی شام کو ایک طویل ہچکچاہٹ کے بعد دکھا ہی دیا۔ اس کو ایک فیچر فلم کے طور پر پیش کیا گیا جس کے بعد بحث بھی ہوئی۔ فلم کے پیغام کی ترسیل اس کی ہیئت اور مواد سے ہوتی ہے اور اس کا ابلاغ مختلف لوگوں پر مختلف طور سے ہوتا ہے۔

میں نارویجین نہیں ہوں لیکن بہتر ہزار دوسرے غیر ملکیوں کی طرح ناروے میں رہتا ہوں۔ چونکہ فلم کے بعد ہونے والی بحث میں کسی بھی غیر نارویجین کو نہیں بلایا گیا تھا اس لئے میرے خیال میں یہ مناسب ہی ہوگا اگر یہ بتانے کی کوشش کی جائے کہ اِس فلم نے مجھے کیا پیغام دیا۔

یہ غیر سرمایہ دارانہ اور غیر سوشلسٹ معاشرے کے بارے میں ایک فلم ہے جسے ایک سرمایہ دارانہ معاشرے کے ایک سفید النسل فلم میکر نے اپنی منتخب کردہ فارم اور فلٹر کیے ہوئے مواد کے ساتھ بنایا ہے۔

اس فلم کا پیغام ایک چیخ ہے۔ تمام سرمایہ دار معاشرے کے ایک نمائندے کی چیخ۔ ایک سفید النسل صحافی چلاتا ہے۔ وہ تمام سرمایہ دار دنیا کے نمائندے کی حیثیت سے ایک غیر سرمایہ دار اور غیر سوشلسٹ معاشرے میں سے۔ صحیح اطلاعات حاصل نہ ہو سکنے اور ٹھیک جوابات نہ ملنے پر اپنی نااہلیت کا رونا اور سرمایہ دار دنیا کی بیچارگی کے اعلان سے پہلے اپنی جمع شدہ پونجی پیش کر دیتا ہے۔ یہی پونجی اس فلم کا مواد ہے۔ کانٹنٹ (CONTENT) ہے۔

اس نے اپنی معلومات و اطلاعات جمع کیسے کیں؛ یہ واردات اس فلم کی ہیئت ہے۔ فلم کا خاتمہ ہیرو کے غصّے اور ناراضگی پر
ہوتا ہے جو کہ ایک سفید النسل صحافی ہے، وہ ناراض اِس لئے ہے کہ اُس کی حاکمیت۔ سفید النسل سرمایہ دار معاشرے کی طلب کہ اُسے ہر بات کے بارے میں ہر وقت باخبر رہنا چاہیئے۔ یہ خواہش ایک غیر سرمایہ دار اور غیر سوشلسٹ معاشرے سے چیلنج ہو گئی ہے۔ اِس سفید النسل صحافی کا یہ ردّ عمل ہر گز ایسا نہ ہوتا اگر وہ کسی سرمایہ دار معاشرے یا سوشلسٹ معاشرے سے اطلاعات حاصل کرنے میں ناکام رہتا۔ میرا یہ مفروضہ فلم کے بعد ہونے والی بحث میں ثابت ہو گیا۔

بحث کے تمام شرکائے نے تمام سفید النسل دانشوروں نے اس کی جمع شدہ پونجی پر کس ردِ عمل کا اظہار کیا؛ ——— "سوالات بغیر جوابات کے؛" تمام دانشور فلم کو رّد کرنے پر متفق تھے۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ تمام شرکاء اس فلم کے ہیرو کو، سفید النسل صحافی کو، تمام سرمایہ دار دنیا کے نمائندے کو رّد کرنے پر متفق تھے۔ فلم میکر سچا ہے۔ شاید اسے خود بھی اس سچائی پر یقین نہیں ہے۔

ہیرو جو ایک صحافی ہے اپنی اطلاعات کے لیے جو مخبر استعمال کرتا ہے وہ تین قسم کے ہیں۔ پہلے نمبر پر تو اُس کے اپنے دوستانہ رابطے آتے ہیں۔ دوسرا نمبر خریدے ہوئے رابطوں کا ہے۔ تیسری جگہ اُن کی ہے جو دراصل رابطہ برائے رابطہ ہیں۔ ان تمام روابط میں سے ایک غیر سوشلسٹ اور غیر سرمایہ دار معاشرے کے تین اہم کردار نمایاں ہوتے ہیں۔ میں ان کرداروں کو اہم اس لئے کہتا ہوں کہ فلم کی زبان انگریزی ہے اور یہ تینوں بہت اچھی انگریزی بولتے ہیں جو کہ سفید النسل صحافی کی زبان ہے مزید یہ کہ یہی کردار فلم بینوں پر براہِ راست اثر

انداز ہوتے ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تین کردار کون سے ہیں؛ میری فہرست یوں ہے۔

**مروان!** ایک دوستانہ رابطہ۔ اپنے وطن کو رد کر کے سرمایہ دار معاشرے میں رہنا قبول کر چکا ہے۔ ایک محنت کش گھرانے سے تعلق رکھتا ہے لیکن مغربی سرمایہ دار معاشرے یعنی لندن میں رہائش اختیار کرنا اس کا اپنا انتخاب ہے۔ اُس کو نئی جگہ رہنے کے لیے سفید النسل دوستوں کی ضرورت ہے ان کو بھی اس کی ضرورت ہے۔ اُس کے استعمال کے لیے۔ جیسا کہ فلم کا ہیرو سفید النسل صحافی فلم میں کرتا ہے۔ وہ مروان کو اپنی معلومات کے لیے اور ٹھیک جوابات منتخب کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ یہ کردار مشہور عالمی شہرت یافتہ پاکستانی اداکار ضیاء محی الدین نے بہت خوبی سے نبھایا ہے۔

**امریکی یونیورسٹی کی سابقہ طالبہ** رابطہ براستہ رابطہ۔ مروان کے برعکس یہ لڑکی سرمایہ دار دنیا میں کئی سال رہنے کے بعد اسے رد کر چکی ہے۔ اب وہ اپنے وطن میں ہے یہ لڑکی اپنے معاشرے کی خرابیوں سے بخوبی واقف ہے۔ وہ اپنی جڑیں دریافت کرنا چاہتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ مزاحمت کی تحریک کا حصّہ بننا چاہتی ہے یہ لڑکی سفید النسل صحافی کی خواہشات کی بجائے اپنی شرائط پر صرف اتنا بولتی ہے جتنا بتانا چاہتی ہے۔

**شہزادی کی بہترین دوست!** خریدا ہوا رابطہ۔ معلومات کا معاوضہ وصول کرنا قبول کرتی ہے۔ اپنی البم میں سے شہزادی کی تصاویر مہیا کرتی ہے لیکن اپنی تمام معلومات و اطلاعات منتقل کرنے پر تیار نہیں ہے۔

یہ تین کردار دراصل کسی بھی غیر سرمایہ دارانہ اور غیر سوشلسٹ معاشرے کے تین رجحانوں۔ تین رویوں کا اظہار کرتے ہیں۔

(۱) پسماندہ معاشروں کا استحصال کرنے اور لوٹنے کی قیمت ادا کی جاتی ہے

(۲) ایک طبقے کو استحصال کرنے اور لوٹنے کی قیمت ادا کی جاتی ہے۔

(۳) اب ایک نیا رجحان بھی موجود ہے۔ اپنی جڑیں دریافت کرنے کا رجحان سرمایہ دار دنیا کو رد کرنے کا رویہ۔ ایک مزاحمت۔

یہ مزاحمت اِس قدر موثر ہو رہی ہے کہ مروان جو کہ ہیرو کا دوست ہے۔ فلم میں یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ "تم سمجھتے نہیں۔ تم سمجھو گے بھی نہیں"؛ پھر خریدی مخبر دھاڑتی ہے "صرف وہ بتاؤں گی جس کی تم نے قیمت ادا کی ہے" اور فلم کے بعد ہونے والی بحث میں شامل شرکا رکہتے ہیں "سوالات بغیر جوابات کے"؛

اس فلم نے دم توڑتے ہوئے سرمایہ دار معاشرے کی ایک اہم خامی کی نشاندہی کی ہے۔ فلم کا مرکزی سفید النسل کردار، ایک غیر سرمایہ دار غیر سوشلسٹ معاشرے میں سرمایہ دار دنیا کے نمائندے کی حیثیت سے اپنے بے یار و مدد گار سپر چلا اٹھا ہے، غصہ میں آ گیا ہے۔ وہ صحیح اطلاعات اور اپنے سوالوں کے ٹھیک ٹھیک جوابات حاصل نہیں کر سکتا۔ اس نے سرمایہ دار معاشرے کی توقعات کی روایت کے مطابق ایک اطلاعاتی خاکہ ترتیب دیا تھا جو خاک میں مل گیا۔ کنٹرول اس کے ہاتھوں سے جاتا رہا۔

اب ہم ۱۹۸۰ء میں رہ رہے ہیں۔ بحث میں حصہ لینے والوں میں سے ایک دانشور نے کہا "ہم ایک پرانی خبر کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں" میری رائے میں یہ فلم مستقبل کی خبر کا اندازہ کرنے میں مدد دیتی ہے۔

(۴) ستمبر کا نیو یارک ٹائمز لکھتا ہے۔" ——— اور عقل کا مظاہرہ کرتے

ہوئے ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اب ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی قوت اور اثر کبھی بھی اتنا توانا نہیں ہوگا کہ وہ دنیا کی تنظیم اپنی مرضی سے کرنے کے لئے کافی ہو۔

یوں تو برطانیہ میں دستاویزی فلمیں بنا رہا ہوں مگر اپنے آپ کو زنگ سے بچانے کے لئے ڈرامہ کر لیتا ہوں، تھیٹر کا یا ٹیلی ویژن کا۔ تقریباً دو سال پیشتر بی بی سی نے ایک زمانے کے بعد LIVE پروڈکشن کی۔ یہ سیریل چار قسطوں پر مبنی تھی اور اس کا نام تھا "کنگ آف دی گھٹو"۔ اس میں میرا ایک بنگالی کا کردار تھا۔ یہ سیریل اور اعتبار سے کیسے بھی ہو مگر ناظرین کے لئے ایک تجسس ضرور رکھتی تھی کہ یہ (LIVE PRODUCTION) تھی اور پھر سب سے زیادہ فنکار حلقے میں زیادہ اہمیت رکھتی تھی، کیونکہ اس میں غلطیوں کے امکانات اور دیگر حوالوں سے دلچسپی ہو سکتی ہے۔ بہر حال یہ ایک بہت اعلیٰ پروجیکٹ تھا۔ یعنی آپ یہ سمجھ لیں کہ چالیس ہزار پونڈ کا سیٹ لگایا تھا جسے ظاہر ہے کہ ایک سین کے بعد ضائع ہو جانا تھا۔ مگر خیال ہے کہ کم از کم ایک ڈرامے پر تین لاکھ پونڈ کا خرچہ اٹھ جاتا ہے"

(گفتگو دسمبر ۸۶ء)

اور اب آخر میں باپ اور بیٹے کے تحریر کردہ دو مضامین دیکھیے۔

خادم محی الدین کا مضمون "موسیقی" کے بارے میں ہے جو ان کے انتقال کے بعد ادبی دنیا میں شائع ہوا۔ ضیا محی الدین کا مضمون "حسنِ رقص" سے متعلق ہے

دامن میں ہے مشتِ خاکِ جگر، ساغر میں ہے خونِ حسرتِ مے
لو ہم نے دامن جھاڑ دیا، لو جام الٹائے دیتے ہیں

# احیاءِ موسیقی

لاہور کو مغربی پاکستان کا دل کہیں تو بے جا نہیں۔ یہ "زندہ دلانِ پنجاب" کا مرکز ہے اس بہارستان کی فضا میں اُمنگوں اور ولولوں کے نت نئے شگوفے پھوٹا کرتے ہیں لیکن یہ اکثر پھول بننے سے پہلے ہی مرجھانے لگتے ہیں۔

کچھ عرصے سے کلاسیکی موسیقی کو زندہ کرنے کے ولولے بھی اٹھے اور یہ اقدام لاہور اور راولپنڈی میں رونما ہوئے گزشتہ تین سال میں آل پاکستان میوزک کانفرنس کے اجلاس لگاتار اوپن ایر تھیٹر میں منعقد ہوئے اور کامیاب رہے۔ کبھی کبھار گانے کی محفل بھی ہوا کرتی ہے۔ آرٹ کونسل لاہور میں اس موسیقی کی تعلیم بھی جاری رہی ہے۔ اُدھر بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن نے امتحان سیکنڈری سکول (میٹرک) اور ہائر سیکنڈری (ایف اے) کی جماعتوں میں تعلیمی کمشن کی تجویز کے مطابق، اس مضمون کو تسلیم کر کے اپنے نصاب میں داخل کر دیا۔ پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات ایف اے اور بی اے میں، قیام پاکستان سے پیشتر موسیقی کی تعلیم طالبات کے لیے رائج ہو چکی تھی اور یہ تعلیم نہایت کامیابی کے ساتھ یونیورسٹی ہی میں جاری رہی، دو سو کے قریب طالبات کی جماعتیں تین معلّمات کے سپرد رہیں۔ لیکن ملکی تقسیم کے بعد وہ بساط الٹ ہو گئی۔ تا حال اس کوشش نے وہ علمی جامہ نہیں پہنا جو اس مقصد کے لئے ضروری تھا۔ علمی صورت اختیار کرنے کے لئے ضرورت یہ ہے کہ (۱) مضمون کے طریقۂ تعلیم پر غور کیا جائے (۲) سیکنڈری مدارس کے ہیڈ ماسٹر اور کالجوں کے پرنسپل صاحب اس مسئلے سے دلچسپی لیں

(۳) تعلیم یافتہ اور مناسب اساتذہ فراہم کئے جائیں (۴) طلبہ کے والدین کی بے توجہی کو دور کیا جائے، جو زیادہ تر مذہبی بنا پر ہے۔ ظاہر ہے کہ امور نمبر (۳) اور (۴) زیادہ کٹھن کام ہیں۔

مذکورہ کانفرنس کے اجلاس اس لحاظ سے بارآور ثابت ہوئے کہ ان کے ذریعے مقامی اور بھارتی فن کاروں کا کمال دیکھ کر، عوام کلاسیکی رنگ کی موسیقی سے زیادہ دلچسپی لینے لگے اور اس انداز کے گانے سے آگاہ ہوئے۔ چنانچہ بعض ارباب حل وعقد نے آئندہ کے لئے ارادے باندھ کر کچھ ریزولیوشن پاس کئے۔ کانفرنس مذکور کی دو قراردادوں کے علاوہ ایک قرارداد یہ تھی کہ لاہور میں ایک میوزک کالج قائم کیا جائے اور ملکہ موسیقی روشن آرا بیگم اس کالج کی پرنسپل مقرر ہوں۔ یہ قرارداد بہ اتفاق رائے منظور ہوئی۔ دو سال سے زیادہ عرصہ گذر گیا لیکن اس کام کے لئے کوئی عملی قدم نہیں اٹھا اور یہ کاغذی کارروائی داخلِ دفتر ہو کر طاقِ نسیاں پر دھری رہی۔

**میرس کالج لکھنؤ!** اگر مذکورہ بالا چار مسائل کو حل کرنے کے لئے بھارت کے میرس کالج کی مثال پیشِ نظر رکھی جائے تو مناسب ہوگا۔ عام اصحاب اور شائقین موسیقی بھی اس ادارے کے مکمل حالات سے بہت کم آگاہ ہیں۔ اس کالج کے قیام سے پیشتر موسیقی کی جو خستہ حالت بھارت میں رہی تھی، اس کے پیشِ نظر یہ ادارہ معرضِ وجود میں آیا۔ قریباً ایک صدی پیشتر کلاسیکی موسیقی کا وجود درباری حیثیت کا تھا۔ اس کی سرپرستی راجواڑوں ہی میں ہوتی رہی۔ اور وہاں بھی شاہی درباروں میں "یہ زیبِ داستان" کے طور پر پیش کر دی جاتی تھی۔ راہ چلتے عوام اس سے بیگانہ رہے۔ راجاؤں اور نوابوں کے طفیل اس فن کا وجود اگر تو رہا لیکن چونکہ عوام کی زندگی سے دور رہا اس لئے فنی ترقی محدود

رہی۔ اس کے علاوہ پیشہ ور اور اَن پڑھ موسیقاروں نے موسیقی کو اپنے پیشے کی میراث قرار دیکر اسے اپنے سینے سے لگائے رکھا اور دوسروں کو سکھانے میں بخل کیا لہٰذا ترقی کا میدان اور بھی تنگ ہو گیا ان پیشہ وروں کی بے علمی اور کم مائگی کے باعث موسیقی کا نظری پہلو لوگوں سے اوجھل رہا اور اس کا عملی رُخ کچھ رواجی اور غیر تخلیقی تھا۔ اس فن کو سکھانے کا طریق نہایت سست رفتار اور کوفت انگیز تھا۔ مزید براں، نوٹیشن (آہنگ بندی) کا کوئی دستور رائج نہ تھا کہ اس کے ذریعے سے گانے ضبطِ علامات میں لا کر محفوظ کر لیئے جاتے۔ نہ کوئی درسی کتب ہی باضابطہ صورت میں موجود تھیں۔ اِکاّ دُکاّ اشتہاری "ماسٹر" چند گانے جمع کر کے ہارمونیم گائیڈ چھاپ دیتے طلبہ کو جماعت بندی کی صورت میں، اس فن کے نظری اور عملی پہلوؤں سے کما حقہ، روشناس کرنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اس کو سکھانے کا طریق فقط یہ رہا کہ شاگرد اپنے استاد کے گانے بار بار سنیں اور انہیں حافظے میں محفوظ کر کے ایک ہی انداز سے دہرایا کریں۔ ہر چند کہ بعض ذہین طلبہ، جنہیں موسیقی سے قدرتی لگاؤ ہوتا، توجہ اور مشق کرنے سے خوب ترقی کر جاتے لیکن یہ ترقی کچھ یک طرفہ سی ہوتی اور وہ اپنی مضمون کے علمی پہلو پر حاوی نہیں ہوتے تھے۔ فقط عملی طور پر کچھ چابکدست ہو جاتے تھے۔ ان سب امور کے علاوہ چوٹی کے فنکار بھی خال خال ہی نظر آتے۔ یہ صرف چند مقامات میں پائے جاتے تھے مثلاً جے پور، گوالیار، لکھنؤ، دہلی، پونہ، بڑودہ، رام پور اور حیدر آباد دوکن میں،

گزشتہ صدی کے آخر میں ان حالات نے پلٹا کھایا۔ بعض سیاسی حالات کی بنا پر فنکاروں کی درباری سرپرستی میں کمی آنے لگی۔ تب یہ لوگ جو صلا قدرائی اور سہارا حاصل کرنے کی غرض سے پبلک کی طرف مائل ہوئے۔ نامی گویئے

بمبئی اور کلکتہ جیسے بڑے شہروں میں آئے ——— اور اپنے فن کا مظاہرہ کرنے لگے جس سے عوام کو کلاسیکی موسیقی سے آشنا ہونے کا موقع ملا۔ انہوں نے اس غنا کا خیر مقدم کیا اور ان کے دلوں میں اسے سیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ فن نے درباروں کی خوشامدانہ رسوم سے مخلصی پائی۔

## میرس کالج کا قیام!

چوتھی میوزک کانفرنس منعقدہ جنوری ۱۹۲۵ء میں کالج قائم کرنے کا منصوبہ عملی صورت میں لایا گیا۔ یہ کانفرنس بہت کامیاب رہی اور اس میں سبھی طبقوں کے نمائندے شامل ہوئے تھے۔ ان سب نے مرکزی درسگاہ قائم کرنے پر خاص زور دیا۔ اور اس کے لئے جو قرارداد پیش ہوئی اسے سب نے باتفاق رائے منظور کیا چنانچہ کانفرنس کے منتظمین نے اس غرض کی تکمیل کے لئے کہ موسیقی کے احیا کا بندوبست کیا جائے اور اس کی تعلیم عام ہو جائے، اسی درسگاہ کو پیش نظر رکھا اس کے متعلق سات ممبروں کی ایک جدا مجلس منتظمہ وجود میں لائی گئی اور اس مجلس کے اراکین میں راجہ نواب علی خاں مرحوم تعلقہ دار اکبرپورہ (مصنف معارف النغمات) بھی شامل تھے۔ یہ موسیقی کے نظری اور عملی پہلوؤں میں کامل دسترس رکھتے تھے۔

جنوری ۱۹۲۶ء میں کانفرنس مذکور نے مجلس کے اغراض ومقاصد کا اعلان کرنے کے لئے خاص اجلاس منعقد کیا۔ ساتھ ہی حکومت اور صاحبِ ثروت طبقے سے مالی امداد کی اپیل کی، مجوزہ درسگاہ کی تفصیلات پر بحث ہوئی۔ چنانچہ لکھنؤ میں کالج قائم کرنے کے لیے جدا کمیٹی تجویز کی گئی۔ کالج کا نام یو۔ پی کے گورنر سر ولیم میریس کے نام سے میریس کالج آف میوزک رکھا گیا۔ یہ گورنر اس فن کے سرپرست رہے۔ اس نئی کمیٹی کے ممبروں میں راجہ نواب علی خاں کے علاوہ پنڈت

وی۔ این۔ بھاتکھنڈے ایل ایل بی تھے۔ انہوں نے موسیقی کے ہر دو پہلوؤں پر دور رس ریسرچ کی تھی اور وہ راجہ نواب علی خاں کے رفیق کار رہے موسیقی میں ان کا تخلص چتر تھا اور چتر پنڈت کہلاتے تھے۔ ان کے کمپوز کیے ہوئے کثیر تعداد کے نغمے اور لچھن گیتوں سے معارف النغمات مزین ہے۔ انہوں نے پندرھویں سے اٹھارھویں صدی تک کے قدیم اور مستند نظام ہائے غنا پر سیر حاصل ریسرچ کی ہے اور اب انہی کے نام سے میرس کالج کا نام بدل کر بھاتکھنڈے یونیورسٹی آف میوزک رکھا گیا ہے۔

**طریقۂ تعلیم:** تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ابتدا میں کان کی تربیت کے لیے سرگم کے بارہ سروں کی شناخت اور درست ادائگی سکھاتے ہیں۔ ساتھ ہی نوٹیشن کی علامات دیکھ کر ان سُروں کو ٹھیک پڑھنا اور گانا تاآنکہ درسی کتب کے پہلے چار حصوں میں جو ۵۴ راگ دیے ہیں، ان سب کی تفصیل کا علم اور گا کر یا ساز پر ان راگوں کو ادا کرنا ہوتا ہے۔ عملی امتحان میں کم از کم چھ اندازوں یا اقسام کی نغمہ سرائی شامل ہے۔ مثلاً دھرپد، خیال، ہوری دھمار، ترانہ، لچھن گیت، سادرہ، ستار پر مختلف اندازوں کی گتیں، فن کارانہ مہارت کے ساتھ بجا کر سنانا۔ طلبہ کی ترقی جانچنے کے لیے سالانہ اور وقتاً فوقتاً امتحانات منعقد کرنا، باقاعدہ جماعتی تعلیم کے علاوہ، کالج کے طلبہ ہفتہ وار اپنی تعلیم کا مظاہرہ کھلی فضا میں (جیسے ہمارا اوپن ایر تھیٹر) کرتے ہیں۔ اس اجتماع میں شائقین اور عوام کو بلاٹکٹ آنے کی اجازت ہے۔ ان مواقع پر طلبہ کے استاد بھی شریک ہوتے ہیں۔ اجتماع کا مقصد یہ بھی ہے کہ طلبہ پبلک کے روبرو گا یا بجا کر اپنی جھجک دور کر لیں اور ان میں خود اعتمادی پیدا ہو۔ اور موسیقی کا پیغام عوام تک پہنچایا جائے۔

کالج کو ابتدا میں مناسب مکان نہیں ملا۔ لکھنؤ کے ایک بنگلے کو کرایہ پر لے کر کام شروع ہوا لیکن ۱۹۲۸ء میں حکومت نے قیصر باغ کی قدیم کونسل چیمبر کے چھ بڑے اور سولہ چھوٹے کمرے کالج کے لئے وقف کر دیے۔ چھوٹے کمروں میں سے چند بیرون جات کے طلبہ کے لیے دارالاقامت کے طور پر کام میں لائے گئے۔ اسی سال جماعتوں کے پانچ کی بجائے پندرہ ——— فریق بن گئے یعنی پہلی جماعت کے چھ، دوسری کے تین، چوتھی کا ایک، باقی پانچ فریق ستار، سرود پکھاوج اور طلبہ سیکھنے کے گروہوں میں منقسم ہوئے۔

کالج میں ایک کتب خانہ اور دار المطالعہ ہے۔ لائبریری میں تین سو سے زائد کتب ہندوستانی موسیقی پر موجود ہیں۔ ان کے علاوہ قدیم کتب سنسکرت میں ہیں اور ایک ریڈیو بھی رکھا ہے۔ اس تعلیم کی کامیابی اس حقیقت سے جانچی جاسکتی ہے کہ تعلیم شروع ہو جانے کے پہلے چھ ماہ کے اندر، طلبہ کے کان ایک سر سے دوسرے سر میں تمیز کر سکتے اور انہیں درست گا لیتے ہیں، ساتھ ہی کوئی سے دو راگ الگ الگ شناخت کر کے انہیں لے تال کے ساتھ گا لیتے ہیں۔ چنانچہ اِس قابلیت کو قریباً تین سو حاضرین کے روبرو دس سات اور بارہ برس کی عمر کے لڑکوں نے گا کر ثابت کر دکھایا۔

**طلبہ!** کالج کی ترقی اور استحکام میں طلبہ برابر شریک رہتے ہیں کیونکہ یہ سبھی تعلیم یافتہ نوجوان ہیں اور اپنی درسگاہ کو بہ نظر شفقت و استحسان دیکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی جدا میوزک سوسائٹی بنا رکھی ہے اور اس کے اغراض و مقاصد میں موسیقی کے موضوعات پر بحث مباحثہ کرنا، صبح شام محفل غنا میں شریک ہونا، راگوں کی تاثیر کے متعلق نفسیاتی پہلو پر غور اور تجربے کرنا شامل ہیں مثال کے طور پر راگ بجے جے ونتی میں افسردگی اور بہجت، دونوں ہی اقسام کی تاثیر

موجود ہے۔ مگر کیونکر؛ تجربے کے طور پر دو جدا جدا نغمے پیش کر دیئے جن میں یہی دو کیفیات پائی جائیں۔ ان اغراض کے علاوہ، طبلہ سازی اور حسنی موسیقی کے باہمی مقابلے کرتے ہیں۔ ان کا ایک رسالہ بھی موسیقی کے موضوع پر شائع ہوتا ہے۔ اور وہ گاہے گاہے بعض ڈرامے بھی پیش کرتے ہیں۔ (سنگیت میں گانا، ڈراما اور رقص تینوں شامل ہیں) ڈراما کرنے کا مقصد یہ بھی ہے کہ تمثیل موسیقی کو پست سطح سے اٹھا کر کلاسیکی سطح پر لایا جائے چنانچہ اس مقصد کو بال گندھروں نے اپنے مرہٹی ڈراموں کو پہلے ہی ۱۹۲۳ء میں پورا کر دیا تھا۔

ہمارے پنجاب میں جو تھیٹر فلموں کی آمد سے پیشتر قائم رہے انکے ڈراموں میں گانوں کا بیشتر جزو کلاسیکی ہوتا تھا مثلاً گلرو زریبہ، گلنار فیروز، چترا بکاولی مہابھارت، دل فروش، اسیر حرص وغیرہ۔ ان ڈراموں کے نغمہ گروں میں ماسٹر جھنڈے خاں اور رالہ دیا مہربان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

موجودہ تہذیب کی ترقی میں فنون لطیفہ کا بھی خاص حصہ ہے کسی قوم کی ترقی کے اسباب میں ایک عنصر ثقافتی بھی ہے، ہر قوم کی روح اپنا اظہار ایسے ہی فنون کے ذریعے کرتی ہے۔ بالخصوص شاعری اور موسیقی کے ذریعے سے۔

اگر ہمارے فہیم شائقین اور نوجوان ملک میں میوزک کالج کی بنا رکھنا چاہتے ہوں تو بھاتکھنڈے یونیورسٹی کا دستور عمل مشعل راہ بنایا جا سکتا ہے۔ سرگرم ہو کر کام کیا جائے تو سبھی مشکلات آسان ہو سکتی ہیں۔ موسیقی کے جدا جدا اکھاڑے بنانے کی بجائے مرکزی درسگاہ زیادہ کارآمد ثابت ہو گی۔ محض شاندار کانفرنس منعقد کرنا اور ریزولیوشن پاس کر کے الگ ہو جانے سے بات نہیں بنتی۔ اور نہ کوئی ٹھوس کام ہو سکتا ہے۔ حالی نے خوب کہا ہے

جو کرتے ہیں کچھ، زباں سے کہتے ہیں وہ کم
ہوتے نہیں ساتھ جمع دَم اور قدم
بڑھتا گیا جس قدر کہ حُسنِ گفتار!
بس اتنے ہی گھٹتے گئے کردار میں ہم

## (پروفیسر) خادم محیُ الدّین

(مرحوم)

افسوس کہ اس مضمون کے موصول ہونے کے چار دن بعد پروفیسر صاحب اپنے خالق سے جا ملے۔ (ایڈیٹر)

# THE ART AND BEAUTY OF KATHAK

The 'Kathak' dance dates back thousands of years. The word 'Kathak' means storyteller. Time was when it was used by bands of strolling players to illustrate various epics and legends of ancient gods. It is fair to assume that the dance was modified and enlarged according to the new characteristics which kept developing over the centuries. The 'Kathak' tradition which we are trying to preserve today goes back to the Moghul times.

Every school of classical dancing has its own expressionistic or mimetic style. The mode of expression, however, differs. In some schools the methods employed to depict events and emotions are bold in execution and quasi-naturalistic. 'Kathak' on the other hand uses understatement and delicacy of line to evoke an emotional response. This is not to suggest evoke an emotional response. This is not to suggest that Kathak dancers do not delineate stories. They do, but the main attempt is at evoking the atmosphere inherent in the story. A song is interpreted word for word only in some special cases. As a general rule each situation is sketched in brief outline so that it could be danced quickly to create the overall effect. Some, connoisseurs have likened 'Kathak' to a Japanese painting which is executed swiftly and with economy of line.

Most 'Kathak' rehearsals are based on classical 'Ragas'—melodic structures to be played at certain times of day. The dance itself evolved from a simple means of telling a story to a complicated series of rhythmic patterns, brilliant variations heightened by flawless timing. With the development of its technique the silence of pauses began to be used to enhance the exciting movements of lighting pirouettes. The 'Boles' meaning the rhythmic syllables—which are spoken during the dance have become a highly technical series of word patterns. The intricate hand movements (and footwork), the use of the eyes, the language of the gestures takes many years of study with learned masters and thus the system remains today.
of

The music for the 'Kathak' recital is usually provided by a singer and three or four musicians. One musician provides the rhythm, the other the melody. A musical phrase within a given time scale is repeated continuously. This refrain not only provides the dancer and the percussionist with an ever present and constant time measure, it also weaves a hypnotic atmosphere over the audience.

The dance would begin with the drummer setting the rhythm by playing on the countless 'Taals'—selected time measures. After the initial stance—the 'Kathak' posture—has been assumed, the dancer and the percussionist begin to show their skill by bringing forth the accuracy with which they arrive at the 'Sum'—the first beat of the time measure. The hand movements are, offcourse, used but their function is not isolated. They are seen as an integral part of the movement. In 'Kathak' the whole body rather than a part of it is used to convey a certain image. This is natural because 'Kathak' is a dance of liquid movements. If the dancer wishes to convey the concept of a dark night, not only will her hands brush past her tresses, to suggest the darkness, she will also arch her body to symbolize loneliness.

In some schools of classical dancing hand movement is a language unto itself; in 'Kathak' it must be integrated to amplify and elaborate the rhythmic patterns which are being improvised. There are times when the 'Bhava'—roughly described as expression of mood and sentiment—would be all important. The performer would interpret a feeling with economy. The movement of one finger running across the lower eyelid, for example, would not only suggest that she is pining for her lover; it would also imply the long and narrow lane which separates her.

The climax of the recital is almost invariably 'Tatkar' or footwork. 'Kathak' is a highly developed and complicated technique of footwork which is unique to this style. The dancer usually rounds off the performance with a tour de force. It is this display of technique which establishes the supremacy of a performer. Apart from the intricate rhythmic patterns which the feet weave, there are 'Chakars' or pirouettes. These are executed with great speed

## ضیاء محی الدین

ضیاء محی الدین ، فیصل آباد ، میں پیدا ہوئے ۔ والدین کا تعلق قصور سے تھا ۔ بچپن میں پہلا سٹیج ڈرامہ اپنے والد خادم محی الدین کی زیر ہدایت "دیوتا" کیا ۔ ۱۹۴۹ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے گریجوایشن کی ۔ اسی دوران ریڈیو پاکستان میں اداکاری کے ساتھ ساتھ خبریں پڑھتے رہے ، اور طلباء کے پروگرام کی میزبانی سر انجام دی ۔ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" میں مضامین لکھے ۱۹۵۱-۵۳ء میں کولمبو پلان فیلوشپ کے تحت آسٹریلیا گئے ، وہاں ریڈیو میں پروگرام پیش کرنے کے علاوہ سڈنی میں تھیٹر میں کام کیا ۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں جو ڈرامہ کا ذوق پیدا ہوا تھا ، اس کی تکمیل کے لئے ۱۹۵۳-۵۴ء میں رائل اکیڈمی آف ڈرامیٹک آرٹس لندن سے اداکاری کی تربیت حاصل کی ، اسی زمانے میں بی بی سی میں پچاس سے زائد کھیلوں میں اداکاری کی ، اور اسی ادارے کے ٹیلیویژن ڈراموں میں اداکاری کی ۔

۱۹۵۶ء میں برطانیہ سے واپسی پر لاہور میں حفیظ جاوید کا ترجمہ کردہ کھیل (JULIUS CEASAR) پیش کیا ، کراچی میں خواجہ معین الدین کا کھیل "لال قلعہ سے لالو کھیت" کی ہدایت کاری کی ۔ اس کے علاوہ مختلف کھیل پیش کئے ، جن میں مندرجہ ذیل شامل ہیں :

- ROMEO AND JULIET
- THE MATCH MAKER
- LOOK BACK IN ANGER
- LONG DAY'S JOURNEY INTO NIGHT

پاکستان میں پیشہ ور گروپ "تھیٹر" کی بنیاد رکھی ۔ ۵۹ء میں واپس انگلستان گئے ، جہاں مشہور مزاحیہ کھیل HAY FEVER کی ہدایت کاری کے زمانے میں انہیں ڈاکٹر عزیز کے کردار کی پیشکش ہوئی ، اور یہ شہرہ آفاق ڈرامہ "A PASSAGE TO INDIA" ۱۹۶۰ء میں ہوا ۔ اس کے بعد انہوں نے THE MERCHANT OF VENICE ) میں (SHYLOCK) کا کردار کیا اور (VOL PONE) میں ( MOSKA . ) بنے ، براڈوے میں دیگر ڈراموں کے علاوہ گائیڈ ( GUIDE ) اہمیت کا حامل ہے ۔ اسی زمانے میں فلم "لارنس آف عریبیا" اور "بمبئی ٹاکیز" کے علاوہ :

- WORK IS A FOUR LETTER WORD
- BEHOLD A PALE HORSE
- SAMMY GOING SOUTH

میں کام کیا ۔ دوبارہ پاکستان واپسی پر ٹیلیویژن میں "ضیاء محی الدین شو" کے علاوہ "پائل" "مارخم" اور "ضیاء محی الدین کے ساتھ" پروگرام کئے ۔ ۱۹۷۲ء میں پی آئی اے آرٹس اکیڈمی کے ڈائریکٹر بنے ۔ پاکستان میں فلم "مجرم کون" اور "سہاگ" کے علاوہ ضیاء سرحدی کی ایک نامکمل فلم "آخر شب" میں کام کیا ۔ ۱۹۷۷ء میں پھر برطانیہ چلے گئے ۔ وہاں کھیل ( MEASURE FOR MEASURE ) کے علاوہ ان فلموں میں کام کیا :

- DEATH OF A PRINCESS
- ASHANTI
- "STAYING ON"
- EMPRESS AND THE MUNSHI
- THE ASSAM GARDEN

ٹیلی ویژن کے دو معروف سیریل ( JEWEL IN THE CROWN ) اور ( KING OF THE GHETTO ) حالیہ کارنامے ہیں ۔ سال ۱۹۸۰ء میں فیض احمد فیض کی شاعری پر مبنی پروگرام "فیض صاحب کی محبت میں" پیش کیا ، اور ۳۱ دسمبر ۱۹۸۶ء کی "محفل شعر و نثر" کی شام ایک نہ بھولنے والی شام ہے ۔ برطانیہ میں ان دنوں دستاویزی و غیر دستاویزی فلموں کے علاوہ ہفتہ وار پروگرام "HERE AND NOW" پیش کرتے ہیں ۔